
جنوری 2025
خواتین ڈائجسٹ
www.Pklibrary.com
www.Pklibrary.com

خواتین ڈائجسٹ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی MEMBER APNS
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز CPNE

واٹس اپ 03172266944

بانی — محمود ریاض
مدیرہ — نادرہ خاتون
نائب مدیرہ — رضیہ جمیل
مدیر خصوصی — امت الصبور
بلقیس بھٹی
تزئین — ادارہ
قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

کہی ان کہی — مدیر 6
کرن کرن روشنی — ادارہ 7
ہمارے نام — نادرہ خاتون 32

آپ سے کیا پردہ

خط انشاجی کے — انشاجی 12

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور 198

سروے

نئے سال کی دہلیز پر — شاہین رشید 15

مجھ سے ملیے

باتیں عمر اقبال سے 27

انٹرویو

نعیمہ ناز سے ملاقات — شاہین رشید 22

مکمل ناول

جنوری کی سردی میں — نعیمہ ناز 52
مسالا — نمرہ احمد 152
پردیس — سمیرا حمید 124
احد — صوفیہ بٹ 94

ناولٹ

سفید گلابوں کا سال — حمیرا شفیع 36

افسانے

دروازے کھلے رکھو — لبنیٰ آصف 49



حکمرانی، حنا بشریٰ 141

برکت، فاطمہ ہارون 143

اللہ کافی ہے، ہاجرہ ریحان 146

آہ کی راہ، شلزیہ الطاف ہاشمی 185

نظمیں غزلیں

غزل، سید کامی شاہ 193

نظم، ناہید قمر 193

غزل، زبیر علی تابش 194

نظم، باقی صدیقی 194

پکوان

موسم کے پکوان، واصفہ سہیل 200

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 195

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، روحیلہ خان 197

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2025

جلد 52 شمارہ 08

قیمت 150 روپے

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، ادارہ 208

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 210

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

ایڈیٹر و پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ جنوری 2025 کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یادوں کی ایک ڈھیر چھوڑ کر وقت ہاتھ سے نکلتا چلا گیا، ایک اور سال کا سفر اختتام کو پہنچا۔
روشن امکانات اور نئے خوابوں کے ساتھ ایک نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔
قارئین کو نیا سال مبارک

ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو دو جہاں کی خوشیاں عطا کرے۔ نیا سال آپ کے لیے ہمارے لیے، ہمارے ملک کے خوشیوں اور کامیابیوں کا پیام لے کر آئے۔ آمین

نئے سال میں کوئی نیا پن ہو یا نہ ہو، لیکن یہ آتے جاتے سال ہمیں وقت گزرنے کا احساس ضرور دے جاتے ہیں۔ وقت کا ہر گزرتا لمحہ یہی پیغام دے رہا ہے۔ وقت کو تھام لو، وقت کا ساتھ دو کہ وقت کے ساتھ نہ چلنے والے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

سال رفتہ پر نظر ڈالیں تو بہت کچھ بدلتا نظر آیا لیکن کمزوروں پر مظالم ڈھانے کی طاقت کی ازلی سرشت نہیں بدلی۔ غزہ میں سفاکانہ نسل کشی کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ ان مظلوموں پر ان کی اپنی زمین تنگ کر دی گئی ہے۔ بچوں بوڑھوں پر بم برسائے جا رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے لیکن اس سے بڑا المیہ انسانی حقوق کے علم برداروں کی بے حسی اور خاموشی ہے۔

وطن عزیز کے حالات دیکھیں تو امید کی کچھ کرنیں روشن ہوتی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ عوام کے حالات نہیں بدلے لیکن ملک دیوالیہ ہونے سے بچ گیا۔ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت کا خاتمہ ہوا۔ ان شاءاللہ آئندہ سال مزید بہتری کا امکان ہے۔

انشاجی

چاند نگر کے انشاجی جوگ بجوگ کی کہانیاں کہتے، بہت دور جا نکلے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آج بھی ہمارے درمیان ہیں۔ ان کی تحریروں کی لطافت اور شگفتگی۔ پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ ان کی شاعری آج بھی دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ ایک جوگ بجوگ کی دنیا، دھوپ چھاؤں کا عالم، ویرانی دل کی حکایتیں۔

انشاجی نے بہت کم عمر پائی۔ وہ بہت جلد دنیا چھوڑ کر چلے گئے لیکن ان کی تحریریں انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

اک ستارہ جو بجھ گیا

ہماری بہت اچھی مصنفہ شازیہ جمال طارق خالق حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شازیہ جمال نے ایک طویل تعطل کے بعد دوبارہ لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ توقع تھی کہ وہ آگے چل کر بہت اچھا لکھیں گی لیکن افسوس کہ وقت نے انہیں مہلت نہ دی اور وہ اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اللہ تعالیٰ شازیہ جمال کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

سانحہ ارتحال

بہن راحت جبیں کے شریک حیات چوہدری اسلم سندھو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بہن راحت جبیں کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور مرحومہ اسلم سندھو صاحب کی مغفرت فرمائے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اگر نیت قرض واپس کرنے کی نہ ہو

حضرت صہیب الخیر (صہیب رومی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جو شخص قرض لیتا ہے اور اس کا پختہ ارادہ ہوتا ہے کہ اسے واپس نہیں کرے گا، وہ اللہ کو چور بن کر ملے گا۔“

فوائد و مسائل:

(1) جو شخص قرض لیتا ہے اور ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے اور اس کا مقصد ہوتا ہے کہ واپس نہ کرے، ایسا شخص قانونی طور پر چور قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لیے اسے قیامت میں سزا ملے گی۔

(2) اللہ تعالیٰ دلوں کے حالات جانتا ہے، اس لیے مسلمان کو چاہیے کہ کسی کو دھوکا نہ دے۔ انسان کو دھوکا دینا ممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔

دوسروں کا مال ضائع کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جو شخص لوگوں کا مال اسے ضائع کرنے کے ارادے سے لیتا ہے، اللہ اسے تباہ کردے گا۔“ (بخاری)

فوائد مسائل:

(1) ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے واپس نہیں کرنا چاہتا۔ مالک کے لحاظ سے یہ مال تباہ ہوگیا کیونکہ اسے واپس نہیں ملے گا۔

(2) حرام طریقے سے حاصل کیے ہوئے مال میں برکت نہیں ہوتی۔

(3) ایسے جرم کی سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے کہ اس شخص پر ایسے حالات آجائیں کہ وہ مفلس ہوجائے اور آخرت میں بھی سزا مل سکتی ہے کہ اس کے اعمال ضائع ہوجائیں یا قرض خواہ کو دے دیے جائیں اور وہ خود جہنم میں چلا جائے۔ یہ بہت بڑی تباہی ہے۔

قرض ادا نہ کرنے پر وعید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص کی جان

اس حال میں اس کے جسم سے نکلی کہ وہ تین چیزوں سے پاک تھا، وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔
"وہ تکبر سے، مال غنیمت کی خیانت سے اور قرض سے۔" (ترمذی)

فوائدومسائل:

(1) حدیث میں مذکور تینوں گناہ بہت بڑے گناہ ہیں۔

(2) کبیرہ گناہوں کا مرتکب، اگر اللہ نے پہلے پہل معاف نہ کیے۔ جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا حتیٰ کہ جہنم میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت لے۔ یہ سزا سینکڑوں سال طویل ہوسکتی ہے جب کہ جہنم کی ایک سیکنڈ کی سزا بھی ناقابل برداشت ہے۔

(3) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے "تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔" (صحیح مسلم)

(4) مال غنیمت مسلمانوں کا مشترکہ حق ہوتا ہے۔ جب تقسیم کرکے ہر مجاہد کو اس کا حصہ دے دیا جائے تو وہ ان کی جائز ملکیت بن جاتا ہے۔ تقسیم سے پہلے معمولی سی چیز لینا بھی حرام ہے۔ اسی طرح قوم کی اجتماعی ملکیت میں ناجائز تصرف کرنا یا اسے نقصان پہنچانا بھی کبیرہ گناہ ہے جیسے قومی خزانے کے مال کو اپنی ضروریات پر خرچ کرلینا۔ مسجد، مدرسہ یا کسی دینی یا دنیاوی تنظیم کا فنڈ ان ہی مصارف پر خرچ ہونا چاہیے جن کے لیے وہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عہدے دار ان کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ کرتا ہے تو یہ خیانت ہے۔

(5) قرض جان بوجھ کر ادا نہ کرنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے لہٰذا اس سے بھی اجتناب کرنا فرض ہے۔

مومن کی روح

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مومن کی روح اس کے قرض کی وجہ سے لٹکی رہتی ہے حتیٰ کہ اس کی طرف سے (قرض) ادا کردیا جائے۔" (ترمذی)

فوائدومسائل:

(1) لٹکنے کا مطلب ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس پر ادائیگی کی ذمے داری باقی رہتی ہے اور وہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس لیے اسے پریشانی رہتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی۔

(2) مالی حقوق میں نیابت درست ہے، یعنی اگر کسی کی طرف سے ادائیگی کردی جائے تو قرض وغیرہ ادا ہوجاتا ہے۔ اور وہ اللہ کے ہاں بھی اس ذمے داری سے سبک دوش ہوجاتا ہے۔

(3) فوت ہونے والے کا ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے اس کا قرض ادا کرنا چاہیے۔ اگر ترکہ کم ہو تو وارث اپنے پاس سے قرض ادا کریں۔

آخرت میں ادائی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کے ذمے ایک دینار یا ایک درہم تھا وہ اس کی نیکیوں سے ادا کیا جائے گا، وہاں (آخرت میں) دینار ہوں گے نہ درہم۔" (ترمذی)

فوائدومسائل:

(1) اگر وارث قرض ادا نہ کریں تو میت پر اس کی ذمے داری باقی رہتی ہے جس کی وجہ سے اسے قیامت کے دن مشکل پیش آئے گی۔

(2) حقوق العباد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

(3) نیکیوں سے ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ جس قدر قرض ہوگا، اس کے مطابق مقروض کی نیکیاں قرض خواہ کے اس قدر گناہ مقروض کے سر ڈال دیے جائیں گے۔

(4) نیکیاں کرلینے کے بعد ان کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور ایسے اعمال سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے نیکیاں ضائع ہوجاتی ہیں۔ مثلاً: ظلم، حسد، کسی کے ساتھ نیکی کرکے اسے احسان جتلانا وغیرہ۔

جو شخص قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جب کوئی مومن مقروض ہو کر فوت ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں پوچھتے اور فرماتے:

"کیا اس نے اپنے قرض کی ادائیگی کا سامان چھوڑا ہے؟"

اگر لوگ کہتے: "ہاں" تو آپ اس کا جنازہ پڑھاتے اور اگر لوگ کہتے: "نہیں تو آپ فرماتے:

"اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو۔"

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فتوحات (اور غنیمتیں) عطا فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں مومنوں سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ تعلق رکھتا ہوں، اس لیے جو کوئی مقروض فوت ہوگا تو اس کے قرض کی ادائی میرے ذمے ہے اور جو کوئی مال چھوڑ کر فوت ہو جائے گا۔ تو وہ مال اس کے وارثوں کا ہے۔"

فوائد و مسائل:

(1) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقروض شخص کا جنازہ نہ پڑھنا تنبیہ کے لیے تھا۔

(2) اسلامی حکومت کو ایسے مقروض افراد کی مالی امداد کرنی چاہیے جو قرض ادا کرنے کے قابل نہیں۔

(3) اگر کوئی شخص مقروض فوت ہو جائے۔ جب کہ اس کے وارث نادار ہوں اور ادائیگی کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ قرض خواہوں کو بیت المال سے ادائیگی کرے۔

(4) ناداروں، یتیموں اور کام نہ کر سکنے والے افراد کی کفالت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو کوئی مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو کوئی قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی اور ان کی نگہداشت میرے ذمے ہے۔ اور میں مومنوں سے سب سے زیادہ تعلق رکھنے والا ہوں (یا ان کا زیادہ ذمے دار ہوں۔)"

فوائد و مسائل:

(1) ضیاعاً سے مراد وہ افراد ہیں جنہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً چھوٹے بچے، بوڑھے اور معذور افراد جو اپنی روزی کا بندوبست نہیں کر سکتے۔

(2) اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے جس میں غریب اور نادار افراد کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

(3) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امت سے جو تعلق ہے وہ دوسرے تمام تعلقات سے زیادہ قوی، اہم اور عظیم ہے۔ جس طرح امت کے ہر فرد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، آپ کا احترام اور آپ کی اطاعت فرض ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی امت کے ہر فرد کا خیال رکھتے تھے۔ اب یہ فرض مسلمان حکمرانوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات اور منافع پر عوام خصوصاً مستحق افراد کے فائدے اور ضروریات کو ترجیح دیں۔

تنگ دست مقروض کو مہلت دینا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اسے آسانی عطا فرمائے گا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

(1) اسلام میں معاشرے کے افراد میں باہمی تعلقات مضبوط کرنے کی بہت اہمیت ہے۔

(2) تنگ دست مقروض پر آسانی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ مطالبہ نہ کیا جائے۔ اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے۔

(3) نیکیوں کا بدلہ آخرت میں تو ملتا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اچھا بدلہ عطا فرماتا ہے، اسی طرح گناہوں کی وجہ سے جس طرح آخرت میں سزا ملتی ہے۔ دنیا میں بھی اس کے برے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

(4) اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے

سے دنیا میں امن قائم ہوتا ہے جس کے فوائد نیکی کرنے والے کو بھی پہنچتے ہیں۔

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دیتا ہے، اسے ہر روز صدقے کا ثواب ملتا ہے۔ اور جس نے واجب الادا ہونے کے بعد مزید مہلت دی، اسے بھی یہی ثواب ملتا ہے، (یعنی) ہر روز صدقے کا ثواب ہوتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

(1) مہلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دیتے وقت مناسب مدت کا تعین کیا جس میں مقروض آسانی سے قرض ادا کر سکے۔

(2) مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد سختی سے مطالبہ کرنے کے بجائے مزید مہلت دے دینا مزید ثواب کا باعث ہے۔

عرش کا سایہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو یسر (کعب بن عمرو سلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے سائے میں جگہ دے تو اسے چاہیے کہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔"

فوائد و مسائل:

(1) قیامت کے دن بعض لوگوں کو عرش کے سائے میں جگہ ملے گی۔ اللہ کے سائے سے اس کے عرش کا سایہ مراد ہے۔

(2) عرش کے سائے میں جگہ ملنا بہت بڑے شرف کی بات ہے کیونکہ اس وقت اور کسی چیز کا سایہ نہیں ہوگا، جب کہ سورج کی دھوپ انتہائی تیز ہوگی جس کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق پسینے میں غرق ہوں گے۔

(3) ایک حدیث میں بعض دوسرے اعمال بھی بیان ہوئے ہیں جن کا ثواب عرش کا سایہ ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

"سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا: انصاف کرنے والا حکمران۔ وہ جوان جو رب کی عبادت میں بڑا ہو۔ وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا ہے۔ وہ دو مرد جو صرف اللہ کے لیے محبت رکھتے ہیں۔ اسی حالت میں باہم ملتے اور اسی حالت میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ مرد جس نے چھپا کر صدقہ دیا حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہوا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔" (صحیح بخاری)

(4) قرض معاف کر دینا بہت ثواب کا کام ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو مہلت دینا تو آسان ہے۔

عرش کا سایہ

حضرت حذیفہ (بن یمان رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک آدمی فوت ہو گیا۔ اسے کہا گیا: تو نے کون سا (نیک) عمل کیا ہے؟ اسے یاد آ گیا، یا یاد دلایا گیا تو اس نے کہا:

"میں سکے اور نقدی میں چشم پوشی کرتا تھا اور تنگ دست کو (قرض کی ادائیگی میں) مہلت دے دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔"

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔

فوائد و مسائل:

(1) لین دین میں نرمی کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

(2) وفات کے بعد تین مشہور سوالوں (تیرا رب کون ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟) کے علاوہ بھی بعض معاملات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔

(3) سکے میں چشم پوشی کا مطلب یہ ہے کہ سکے کی معمولی خرابی کو نظر انداز کر دیتا تھا جب کہ عام لوگ اس کی وجہ سے سکہ قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے

جس طرح آج کل گھسا ہوا سکہ یا پھٹا ہوا نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔

(4) اللہ کے ہاں حسن اخلاق کی بہت قدر و قیمت ہے۔

(5) مقروض کو قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت دے دینا بہت بڑی نیکی ہے۔

(6) بعض اوقات ایک نیکی انسان کی نظر میں معمولی ہوتی ہے لیکن وہ بخشش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس لیے چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی طرف بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔

اچھے طریقے سے مطالبہ کرنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو کوئی اپنا حق طلب کرے، اسے چاہیے کہ شرافت سے طلب کرے، پورا ادا ہو یا ادھورا۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق والے (قرض خواہ) سے فرمایا:

''اپنا حق شرافت سے وصول کرو، پورا ادا ہو یا ادھورا۔''

فوائد و مسائل:

(1) قرض واپس مانگتے وقت جب مقروض ادا کرنے سے انکار کرے یا بہانہ بازی کر کے مزید مہلت کا طالب ہو تو غصہ آجانا فطری بات ہے لیکن غصے پر قابو پانا بہت بڑی نیکی ہے۔

(2) عفاف (گناہ سے اجتناب یا شرافت) کا مطلب یہ ہے کہ نرمی اور شفقت سے مطالبہ کرے۔ گالی گلوچ تک نوبت نہ پہنچنے دے۔ وہی مال وصول کرے جو اس کے لیے لینا حلال ہے۔

(3) مقروض کو بھی چاہیے کہ قرض خواہ کے احسان کا خیال کرتے ہوئے اچھے طریقے سے بات کرے۔ وقت پر قرض ادا کرے۔ نہ کر سکے تو مزید مہلت طلب کرے اور معذرت کرے۔

(4) اگر عفاف کی صفت بنایا جائے تو عفاف کے مکمل یا غیر مکمل ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر غصہ آجائے تو بھی حد سے نہ بڑھے، اگر پوری طرح عفاف پر عمل نہیں ہو سکا تو جہاں تک ہو سکے اس کا خیال کرے۔ مسلمان بھائی کے احترام کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھے۔

قرض اچھے طریقے سے ادا کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے زیادہ بہتر لوگ وہ ہیں جو اچھے طریقے سے ادا کرتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن ابو ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوہ حنین کے موقع پر تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (غزوہ سے واپس) تشریف لائے تو انہیں قرض ادا کر دیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تیرے گھر بار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ ادھار کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔''

فوائد و مسائل:

(1) ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے۔

(2) اچھے طریقے سے ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادائیگی کی جائے۔

(3) جیسی چیز لی ہو، اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے، لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔

(4) قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعائیں دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائیگی میں شامل ہے۔

☆☆

خط انشاجی کے

انشاجی

انشاجی اپنی نوعیت کے بالکل منفرد اور مختلف مزاح نگار تھے ان کے مزاح کی سادگی اور شگفتگی نے ان کو جو مقام عطا کیا ہے۔ اس تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ ان کے مزاح کا یہ رنگ صرف کالموں اور سفرناموں میں ہی نہیں ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ حتیٰ کہ ان خطوط میں بھی جو انہوں نے اپنی علالت کے دوران لکھے۔

ذیل میں ہم ان کے چند خطوط شائع کر رہے ہیں، انہیں پڑھیے، آپ کو ان کے کالموں جیسا لطف آئے گا۔



قرۃ العین حیدر کے نام

کراچی 9 مئی 1975ء

عینی بیگم......آداب، چند دن ہوئے پدما کا خط آیا جس میں آپ کا تراشہ ملفوف تھا۔ پدما سے ہماری خط و کتابت ہے۔ معصوم سی خط و کتابت جیسی انڈر گریجویٹ لڑکے لڑکیوں میں ہوتی ہے اور جیسی کہ ہماری عمر کا تقاضا ہے۔ ہوش کی منزل کو پہنچیں گے تو ان جھمیلوں اور موہ مایا سے گریز کریں گے۔

لو ایک قصہ سنو، پچھلے مہینے ماری پور جانا ہوا اپنے مدئی، ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں ان کے مرشد رہتے ہیں۔ بابا ذہین شاہ تاجی تصوف اور قوالیوں کے

بحر نا پیدا کنار کے شناور، میرا قلب ابھی جاری نہیں ہوا! اس لیے جیسا گیا تھا ویسا لوٹ آیا۔ راستے سے گزرتے ہوئے جس کی شکل اب بالکل بدل گئی ہے۔ پہلی بار آپ کے ہاں باری پور جانا یاد آیا۔ پچیس برس پہلے ایوب احمد کرمانی کے ساتھ۔ پھر ادھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ اب ہماری عمر میں پچیس برس باقی نہیں ہیں کہ تیسری بار جائیں اور جائیں تو کیوں جائیں۔

آپ نے بڑا کرم کیا کہ میرا مضمون ترجمہ کیا زیورِ طبع سے آراستہ بھی کیا۔ زندہ باشی بعض جگہ

ہندوستان کے چند ناموں کا ذکر آیا تو آپ ڈنڈی ضرور مار گئی ہیں۔ سو یہ صحبت کا اثر ہے۔ اب اس کتاب کو ہند پاکٹ بکس والے چھاپ رہے ہیں اس کے جیکٹ کے لیے آپ کچھ لکھ دیں بشرطیکہ **Undiluted** تعریف میں ہو۔ تو آداب بجالاؤں، یہ جملہ شرطیہ ناحق لکھ دیا۔ میں جانتا ہوں جتنے نقاد صائب نظر رکھتے ہیں، وہ میری تعریف پر مجبور ہیں۔ بعض کج فہم اور کج نظر ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کو میری تحریر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

ایک پورا سیٹ اپنی کتابوں کا ایک بی بی کے ہاتھ آپ کے لیے بھیجا تھا کہ بریلی جا کر سپرد ڈاک کر دیں۔ وہ بی بی وہاں جا کر صاحب فراش ہو گئیں۔ گھٹنے پر ضرب آئی جانے کس کی آنکھیں پھوڑنے کو مارا ہو گا۔ اس کتاب کے علاوہ میرے سفرنامے ہیں۔ "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے۔" "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" "چلتے ہو تو چین کو چلیے۔" اتنے سفرنامے ہو گئے ہیں کہ اب کہیں باہر جاتا ہوں تو امیگریشن والے حلف نامہ لیتے ہیں کہ آئندہ سفرنامہ نہیں لکھوں گا۔ سال گزشتہ تین بار جاپان گیا۔ ہر بار مسافر کے طور پر دلی کے ٹرانزٹ میں تھوڑی دیر کو اترتا ہوں اور حیرت و حسرت کا مارا پھر جہاز میں آجاتا ہوں۔ دیکھیے کب راستے کھلتے ہیں، کب سبیل بنتی ہے۔

"کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا، وہی ٹھہرا ہے اب فن ہمارا۔" سنڈے کے سنڈے ایک کالم جنگ اخبار میں لکھتا ہوں۔ اتنا اچھا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے بار بار پڑھتا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ساتھ کے کالم میں مرزا جمیل الدین عالی کا عالمانہ اور فاضلانہ کالم ہوتا ہے۔ سنجیدہ اور مقطع لوگ ان کا کالم پڑھتے ہیں۔ قوم کے درد میں ڈوبا ہوا اور اسلام کے نشے میں سرشار ہوتا ہے۔ ویسے یہ ہمارے یار عزیز آج کل نیشنل بینک آف پاکستان کے ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ بڑے دھانسو بینکر سمجھے جاتے ہیں۔

کیا "اردو کی آخری کتاب" میں سے ایک آدھ قسط ویکلی میں اور ہو سکتی ہے؟ آپ جانتی ہیں مجھے شہرت کی تمنا نہیں۔ لیکن قارئین کے پرزور اصرار کا کیا کیا جائے۔ ان چند برسوں میں بہت کچھ ادب عالیہ اس فقیر کے علم سے سرزد ہوا۔ وہ بزبان انگریزی آپ کے پرچے کی شوبھا بڑھانے اور سرکولیشن گھٹانے کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجا جا سکتا ہے۔ جی کڑا کر کے جواب دیجیے۔ یوں تو سفرناموں میں بھی آپ کو بہت سے لولوئے لالہ ملیں گے، نظم آپ کو ملی؟ "یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟" میں چاہتا ہوں آپ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کریں اور بھی بہت کلام بلاغت نظام ہے سننے والے میں تحمل کا مادہ ہو۔ کارلا لقہ و نالا لقہ سے یاد کیجیے۔

کشور ناہید کے نام

لندن 9 مئی 1977ء

اے بابا...... کہاں ہو، کیسی ہو؟ ایک چھوٹا سا ملک تمہارے سپرد کر کے آئے تھے۔ تم سے وہ بھی سنبھالا نہ گیا کوئی بڑا کام کہتے تو جانے کیا کرتیں۔ اچھا اب معاف کرو، جھگڑا فساد بند کرواور کراؤ۔

اپنا احوال کیا لکھیں۔ یاروں سے جدائی کی وحشت ہے، وہاں بھی کوئی نہ کوئی وحشت تھی۔ خیر تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔

علاج کا سلسلہ شروع ہے، گھر بھی مل گیا ہے، اگرچہ پہلی اپریل کو ملا ہے کام بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوا ورنہ Busy Doing Nothing سمجھ لو، تم جیسا مددگار مل گیا ہوتا تو تنکا نہ دہرا کرنا پڑتا۔ ویسے مطمئن رہو، اب بھی نہیں کرتے۔

اب اپنا احوال کہو، یوسف کا کہو، یاران سرپل کا کہو۔ ہمارے دوست کو تم لوگوں نے ہی مل کر ہرادیا۔ سیاست عزازیل راخوار کرد، آج ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے گھر پر تو پہرا ہی رہتا ہے۔ خیر وزیر بنتے تب بھی پہرے ہی میں رہتے اس لیے اپنے آپ کو جو بھی سمجھیں۔ بہت افسوس ہوا، خط لکھتے ہیں تو جواب نہیں آتا۔ تم فون پر احوال معلوم کر کے لکھو۔

باقی کیا پوچھیں۔ کس کا پوچھیں ہم نے تو پہلے ہی دل کے کواڑ بند کر لیے تھے۔، بس ذرا سی جھری تھی، اس میں سے کوئی آنا چاہے تو آجائے۔

پاکستان کے اخبار یہاں نہیں آتے۔ اس لیے ذرا بے مزہ گزرتی ہے، لکھنے کا بھی لطف نہیں آتا۔

ممتاز مفتی کے نام

5 فروری 1968

مفتی جی! خبردار...... خاکہ لکھنے کے ارادے سے باز آیے، مجھے اپنی زندگی ابھی شروع کرنی ہے۔ اس میں کھنڈت نہ ڈالیے۔ دوستوں کا کام پردہ پوشی ہوتا

ہے، پردہ دری نہیں۔ اور پھر آپ کے اشارے سے بڑے بڑے نازک آبگینوں کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے، جن سے تعلقات اور جن کی یادوں کے سہارے یہ زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ہر کوئی تو علی پور کا ایلی نہیں ہوتا۔ زیادہ تر لوگ اپنے آپ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو ذرا سا بھی میرا پاس ہے تو اپنے آپ پر جبر کیجیے۔

دیکھ کر غم دیجیے ،ایسا نہ ہو
آپ کو کرنی پڑیں غم خواریاں!

اس تھوڑا لکھے کو بہت جانیے۔ میں ۱۲ کے بعد کسی روز راولپنڈی پہنچوں گا۔ جب تک اپنے نامے کو لگام دے رکھیے۔ کیا آپ کو رسالے والوں کی دل دہی زیادہ عزیز ہے بہ نسبت میری آزردگی کے؟

۳۴-D کے ذکر پر قیصر بھی مسکرا دیا، خلیق بھئی...... یہ کیا قصہ ہے؟ خلیق نے اسی روز خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ لکھا کیا......؟ کتاب لے کر آ رہا ہوں۔

ابن انشاء

کراچی

فروری ۱۹۶۸ء

تم نے جو پیکیج مانگا ہے، اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی۔ اگر تھرڈ پرسن میں چاہیے تو میں کیوں لکھوں...... تم خود کیوں نہ لکھو...... لیکن نہیں میاں۔ تمہارا کچھ اعتبار نہیں جانے کیا لکھ دو، لہٰذا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے، چند سطریں لکھتا ہوں۔ انہی کو گھٹا بڑھا لو......

(مشرقی پنجاب کے) دوآبے کا دہقانی کہیں بھی پہنچ جائے، لاہور کے دہلی، لندن کہ کیلیفورنیا، اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استاد کے بقول مونج کی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشا کو موتی چنداں نہیں بھاتے۔ اپنی مونج کی رسی میں وہ کاٹھ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ اور لہجہ دلی لکھنو ہر جگہ کی سکہ بندی سے دور ہے اور سچ پوچھو تو یہی ایک سلیقے کی بات اس نے کی ہے۔ ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو...... اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔ ابن انشا کو بارہا اللہ کا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا ورنہ یا تو اسے اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا۔ سید انشا اللہ خاں انشا سے بھی اس کو کوئی نسبی نسبت نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہے اور خطوں میں اسے سید ابن انشا تک لکھتے ہیں اور یہ چاہتا تو اس نسبت سے سید بن سکتا تھا لیکن یہ عزت سادات بھی اسے کبھی مرغوب نہیں ہوئی۔ اپنی دہقانیت میں خوش ہے اور اللہ اسے اسی میں خوش رکھے۔

پڑھائی کو دیکھیے تو اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے، تجربے کو دیکھیے تو بہت پاپڑ بیلے ہیں اور ایران توران بلکہ فرنگستان تک گھوما ہے۔ مطالعے میں اردو پنجابی اور انگریزی سے باہر فارسی اور ہندی سے بھی شغف ہے۔ نظم نثر سبھی میں قلم آزمائی کی ہے لیکن اپنے لیے باعثِ عزت فقط شاعری کو سمجھتا ہے۔ شاعری جس میں جوگی کا فقر، طنطنہ، وارفتگی اور آزادگی ہے۔ بات چیت کیجیے تو بعض اوقات بقراطیت بھی چھانٹے گا لیکن اصل میں بقراطوں سے نفور ہے۔ فقط انشا جی ہے۔ بقول خود:

شاعر ہے تو ادنیٰ ہے! عاشق ہے تو رسوا ہے!
کس بات میں اچھا ہے؟ کس وصف میں عالی ہے؟

بچوں کے لیے بھی شاعری کی ہے لیکن ایسی نظمیں تو بچے بھی لکھ سکتے ہیں یا شاید بچے ہی لکھ سکتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز شگفتہ ہے جسے مزاحِ لطیف بھی کہتے ہیں لیکن اس ذیل میں کم لکھتا ہے حالانکہ اس کا میدان یہی ہوتا تو خوب ہوتا۔

خاموش ہے۔ عزلت گزیں ہے۔ ہنس مکھ ہے۔ ذمے داریاں قبول نہیں کرتا تاکہ نبھانی نہ پڑیں۔ فخر صرف اپنے دوستوں پر کرتا ہے جو اس پر یا اس کی سادگی، بھولپن یا حمق پر جان چھڑکتے ہیں اور ناز اٹھاتے ہیں۔ عشق بھی کرتا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ میاں قیس کے انتقال کے ساتھ یہ قوم ناپید ہو گئی تھی وہ اس سے ملیں، یہ ہماری نہیں ان کی اپنی فرمائش ہے۔

انشا سے ملو، اس سے نہ روکیں گے لیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی؟
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

قلم برداشتہ لکھا ہے کہاں چھپے گا؟ موزوں ہو تو اس کی ایک نقل مجھے عنایت کر دینا۔

ابن انشاء

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

تسلسل خوب صورت ہے، روانی خوب صورت ہے
بدلتے وقت کی ساری کہانی خوب صورت ہے

وقت بدلتا رہتا ہے۔ زندگی کی ساری خوب صورتیاں وقت کے تغیر ہی سے وابستہ ہیں۔ موسموں کی تبدیلی ہو یا انسان کی زندگی کا اتار چڑھاؤ تغیر ہی اس میں رنگ بھرتا ہے۔ خزاں کے بعد بہار، رات کے بعد سویرا اور نا امیدی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں جھلملاتی امید کی کرنیں یہ سب زندگی کے مختلف روپ اور رنگ ہیں۔

ہماری قارئین ہمارے ساتھ دکھ سکھ کے رشتوں میں بندھی ہیں۔ ہم خاص موقعوں پر اپنی قارئین سے ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے سروے کرتے ہیں تاکہ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں میں شریک ہو سکیں۔ ان کے خواب جان سکیں۔

حسب روایت نئے سال کے موقع پر ہم نے اپنی قارئین سے سروے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ بھاگتے دوڑتے یہ سال بھی بیت گیا، خواب کون نہیں دیکھتا مگر زندگی کی برق رفتاری میں بہت سے خواب پورے نہیں ہو پاتے۔ آپ کا کوئی ایسا خواب جو اب بھی ادھورا ہے۔ کیا نئے سال میں اس کی تکمیل کا ارادہ ہے؟

2۔ زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں کچھ ہماری زندگی میں ٹھہر جاتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھ جاتے ہیں کچھ ایسے خوب صورت دن جو ایک خوش گوار یاد بن کر ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں کہتے ہیں اداس شاموں اور سرد راتوں میں بیتے دن اور بچھڑے لوگ یاد آتے ہیں۔ آپ کو کیا یاد آتا ہے؟

3۔ گزرے سال کا کوئی تلخ تجربہ کوئی زخم، کوئی ایسی تکلیف دہ بات جسے آپ بھول جانا چاہتی ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

مسز آصف خان......اٹک

خواب کون نہیں دیکھتا۔ ہر آنکھ اپنے تخیل کی وسعت کے حساب سے خواب سجاتی ہے۔ خواب ہی تو آنے والے کل کی امید بنتے ہیں۔ خوابوں کے سہارے ہی زندگی کا کٹھن سفر کٹتا ہے۔ سو ہم نے بھی زندگی کے ہر دور میں مختلف خواب آنکھوں میں سجائے۔ زمانہ طالب علمی میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے اور پھر کسی مناسب شعبہ زندگی میں کامیابی کا خواب۔ جس کی تعبیر پہلی کوشش میں ہی پنجاب پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کی صورت میں حاصل ہوئی۔ الحمدللہ۔ اس کے بعد زندگی کا اگلا مرحلہ شروع ہوا

تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

خوابوں کا چمن تعبیر سے آباد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے

تین پھول سے بچے عطا کیے۔ اور پھر یوں ہوا کہ موت کی آندھی نے باغ اجاڑ دیا۔ میرا گلشن مالی کے سائے سے محروم ہوگیا۔ تتلی کے پر بے رنگ ہوگئے۔ ایک مکمل زندگی جینے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ میری اور میرے بچوں کی زندگی میں کبھی نہ بھرنے والا خلا بن گیا۔

خواب کی ٹوٹی کرچیوں کا ملبہ بمشکل سمیٹا تو زندگی کے تقاضوں نے ایک نیا خواب آنکھوں میں لاسجایا۔ خواب مرتے نہیں۔

خواب دل میں نہ آنکھیں نہ سانسیں
کہ ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مرجائیں گے
خواب تو روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ننھے نونہالوں کو تناور اور شجر سایہ دار بنتا دیکھنے کا خواب ان کو معاشرے کا مفید اور کارآمد فرد بنانے کا خواب۔ اپنے بابا کے لیے صدقہ جاریہ بنانے کا خواب...... یہ خواب کہ کبھی یہ ننھے منے وجود اتنے مضبوط ہوجائیں کہ ان کی ماں ان کی پناہوں میں ستا سکے۔

روز و شب کے میلے میں اسی خواب کی انگلی پکڑ کر چل رہی ہوں۔ یہی میری کشتی کا پتوار ہے اور یہی میرے مشقت بھرے دنوں میں امید کی کرن۔ یہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا ان شاء اللہ۔

سرد شامیں بذاتِ خود اداسی کا استعارہ ہیں۔ شام اور اداسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بیتے برسوں کی بہت سی یادیں ہیں جو اکثر شاموں میں دل کو اپنی مٹھی میں بھینچے چلی جاتی ہیں۔ ایسے دنوں کی اولین یاد ان ایام گم گشتہ کی ہے۔ جو نانی کے گھر میں گزرے۔

گاؤں میں مغرب کے بعد سردی کی شدت میں اضافے کے باعث وسیع و عریض صحن میں نکلنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ ایسے میں ہم بچوں کو گرم کمروں میں قید کرنا کافی مشکل ہوتا تھا۔ جیسے ہی دسمبر کے آخر میں سرما کی سالانہ چھٹیوں کا اعلان ہوتا، ہم امی کے ہمراہ بوریا بستر باندھے نانی کے گھر جلوہ افروز ہوتے۔ جہاں نانی اماں کے ساتھ ان کے ہاتھ کی سوغاتیں گندم، تل اور باجرے کے مرونڈے، پنیاں ہمارے منتظر ہوتے۔ مغرب کے وقت خالہ چولہے میں لکڑیاں ڈالنے کے ساتھ پہلا کام مٹی کی انگیٹھی (جو نانی اماں اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں) جلانے کا کرتیں۔ اس میں کوئلے دہکائے جاتے۔ جب کوئلے اچھی طرح دہک جاتے اور دھواں ختم ہوجاتا تو انگیٹھی بڑے کمرے میں رکھ دی جاتی۔ جہاں نانی اماں اور نانا ابا اپنے گرم لحافوں میں بیٹھے ہوتے ساتھ پی ٹی وی کی نشریات جاری رہتیں۔

سرما کے دنوں میں شام کو روٹیاں تنور کے بجائے توے پر ہی بنائی جاتیں۔ کھانا سب مل کر کھاتے۔ اس دوران چھوٹے ماموں کے چٹکلے اور ہماری شرارتیں جاری رہتیں۔ کھانے کے بعد اگلا دور چائے، قہوے، مونگ پھلی اور ریوڑیوں کا چلتا۔ اس محفل میں بھی کبھار نانا ابا کے کوئی بھائی یا پھر امی کی پھپھو جو جگت "آپا خدیجہ" تھیں، بھی شامل ہو جاتیں۔ عشاء کے بعد نانا ابا اپنے کمرے میں جب کہ ہم بہن بھائی اپنی فیورٹ خالہ کے ساتھ روئی کی بھاری رضائیوں میں دبک جاتے۔ ہم بچے تو جلد ہی انندیا پور کی سیر کو چل پڑتے جبکہ نانی اور خالہ دیر تک خاندانی معاملات ڈسکس کرتی رہتیں۔

اب بھی سردیوں کی طویل راتوں میں، میں شدید قسم کے نوسٹلجیا کا شکار ہوجاتی ہوں بیتے دنوں کی یادیں دل کو شدید بے چینی میں مبتلا کردیتی ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ وہ سہانے دن تو بیت گئے اور بہت سے دل دار چہرے مٹی کا رزق ہوئے۔ زندگی کٹ رہی ہے ہجر مسلسل کی طرح۔ وصل کی امید فقط روز حشر کو ہے۔

3۔ تلخ یادیں اگر ریکارڈ کرنا شروع کردی جائیں تو شاید ایک کتاب رقم ہوجائے۔ لہٰذا ان کا ذکر جانے دیں۔ رواں سال میری دادی اماں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ ہمارے سروں سے دعاؤں کی چادر

اٹھ گئی۔ ہمارا آبائی گھر ان کے شفیق وجود سے خالی ہو گیا۔ دادی اماں نے طویل عمر پائی۔ اور اپنے پڑپوتے اور پڑپوتیاں بھی گود میں کھلائیں۔ اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

وائے گل چین اجل کیا خوب تھی تیری پسند
پھول وہ توڑا کہ ویراں کر دیا سارا چمن

فرزانہ انصاری......کراچی

1۔ آپی یہ سچ ہے ہم نئے سال کی آمد پر بہت سے خواب دیکھتے ہیں، یہ کریں گے وہ کریں گے مگر بہت کم خواب پورے ہو پاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خواب میرا ہے کہ کچھ پروفیشنل کام کروں جس سے مجھے گھر والوں کو فائدہ ہو۔ اور اپنے گھر کو مکمل کر سکوں اور میرا ایک ذاتی خواب مجھے کچھ لکھنا ہے، کیا؟ یہ ابھی واضح نہیں مگر پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان ضرور ہے۔ گھر، بچوں کی مصروفیات میں وقت ہی نہیں ملتا۔ بہر حال اس سال یہی کوشش ہوگی کہ کوئی ایک خواب تو پورا ہو جائے۔ (ان شاء اللہ)

2۔ آپی آپ کے سوال تو زخموں کو ادھیڑ ڈالتے ہیں۔ واقعی زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں۔۔ مگر جو ہمارے دوست ہوتے ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں چاہے وہ سردیوں کی لمبی راتیں ہوں یا پھر گرمیوں کی دھوپ بھری دوپہریں۔

مجھے بھی میرے والدین اور دوست بہت زیادہ یاد آتے ہیں۔ خاص طور پر وہ جواب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایک درد بھری کسک سی دل میں اٹھتی ہے۔

میرے والد کا انتقال 22 دسمبر 2004ء میں ہوا تو یکم دسمبر سے ہی ان کی باتیں ان کا محبت بھرا لہجہ، ان کا خیال رکھنا بہت رلاتا ہے۔ بیس سال گزرنے کے بعد بھی آج تک دسمبر میں، میں بہت خوش نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرے چھوٹے بیٹے ''محمد حذیفہ'' کا برتھ ڈے بھی 17 دسمبر کو ہے، میں اس دن تھوڑا اہتمام کر لیتی ہوں۔

3......گزشتہ سال میری خالہ کے بیٹے کی طویل بیماری کے دوران جس طرح ہم پریشان رہے، جس طرح انہیں اس بیماری سے گزرتا تڑپتا دیکھا وہ بہت رلاتا ہے۔ لوگوں کی بہت سی حقیقتیں سامنے آئیں۔ رشتوں پر سے اعتبار اٹھا اور اللہ سے رابطہ مضبوط ہوا۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنے کا ہنر سیکھ لیا۔ (الحمدللہ) اس سال کی میرے لیے سب سے اچھی بات ہے۔

شاہین ظفر صدیقی......نارتھ کراچی

1۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت خواب دیکھے کچھ تو پورے ہوئے کچھ وقت کے تھپیڑوں کے ہاتھوں پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ ایک خواب جو اب تک ادھورا ہے اپنے گھر کا خواب جو پھول پودوں اور درختوں کے درمیان ہو، حسین خوب صورت سا گھر ہو، مجھے اپنے اللہ سے امید ہے کہ یہ خواب نئے برس میں ان شاء اللہ ضرور پورا ہو جائے گا۔ آمین۔

2۔ میری دوست شاہدہ جو میری قلمی دوست تھی ہماری دوستی عالمی سروس کے توسط سے ہوئی تھی۔ ہم لوگ سید پور (بنگلہ دیش) سے چٹا گانگ گئے تھے تو اس وقت اس سے بہ نفس نفیس ملاقات ہوئی تھی۔ خوب صورت ڈرائنگ روم میں ہم سب بیٹھے تھے باتیں کر رہے تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف تھے میرے والدین، میری چھوٹی بہن عنبر بھی تھی۔ شاہدہ کی والدہ، اس کی بہنیں اور کزن بھی تھی۔ ہم سب نے خوب باتیں کیں اور خوب انجوائے کیا ہم لوگ کچھ دن بعد کراچی آ گئے۔

کافی دنوں تک خط وکتابت چلتی رہی۔ پھر اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ اور اب تک پتا نہ چلا کہ کہاں ہے وہ۔

میری دوست شاہدہ مجھے بہت یاد آتی ہے جو میری ہم مزاج تھی اب پتا نہیں وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

3۔ گزرتے سال ہماری فیملی کا قیمتی سرمایہ میرے بہنوئی ''افتخار احمد'' کا انتقال ہوا ہیٹ اسٹروک کا بہانا بنا، یہ زخم اتنا شدید لگا ہے کہ میں بھولنا

بھی چاہوں تو نہیں بھول سکتی۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

1۔واقعی سچ کہا ہے سال تو ایسے بھاگے جا رہے ہیں پتا ہی نہیں چلتا۔وقت میں برکت ہی نہیں خواب تو انسان کے کبھی پورے نہیں ہوتے۔ انسان اللہ کی رضا پر راضی ہو جائے تو اونچے خواب نہ دیکھے اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔

میرا بھی ایک خواب ہے ہمارا ماشاء اللہ ایک کنال کا گھر ہے میرے بھیا نے بنوایا تھا۔ان کی کتنی خواہشات تھیں انٹر کام لگاؤں گا میجک آئی گیٹ پر فٹ کرواؤں گا، اپنے گھر ایسا اسپیکر لگاؤں گا کہ محلے کی مسجد کی اذان گھر پر گونجے گی۔

لیکن جیسے ہی مکان مکمل ہوا۔بھیا بیمار ہو گئے کینسر تشخیص ہوا جب پتا چلا تو چوتھی اسٹیج تک پہنچ گیا تھا تو تمام کام رک گئے۔ان کی زندگی کے لالے پڑ گئے پھر سوچا ان کا اکلوتا بیٹا ہے، اس کی شادی کر کے انہیں خوشی دکھائی جائے۔

شادی ہونے کے ڈیڑھ ماہ بعد اجل ہمارے ویر کو لے گئی۔خواب ادھورے رہ گئے لیکن میرا ایک خواب تھا کہ کھلا بڑا گھر ہے، اس میں پھول پودے لگائے جائیں، دس فٹ زمین کچی چھوڑی گئی تھی۔ اس میں مٹی کی ریڑھیاں ڈلوائیں، کیاری میں امرود، انار، مہندی، موتیا، بوگن بیل، ایلوویرا چند ایک اور پودے خرید کر لگوائے اس وقت اس سب پہ دس ہزار کا خرچا آیا۔

گھر اتنا بڑا ہے کہ ابھی بھی خالی خالی لگتا ہے میرا خواب ہے کہ مزید پودے لگواؤں، پچھلے سال اسی سوچ میں رہی۔مہنگائی اتنی ہو گئی ہے۔ مالی صاحبان کے بھی نخرے ہو گئے ہیں۔ پنشن سے نہ گنجائش بنی نہ خواب پایہ تکمیل تک پہنچا لیکن میں اپنے خواب سے دست بردار نہیں ہوئی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے جب نکلے گی تو ان شاء اللہ اپنا خواب پورا کروں گی چھوٹا سا گھاس کا قطعہ بھی بناؤں گی ان شاء اللہ۔

2۔زندگی میں بے شمار لوگ ملتے ہیں اسکول میں کئی سہیلیاں بنتی ہیں۔سروس کے دوران محلے برادری کئی لوگ ملتے ہیں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بھولے نہیں بھولتے ہماری ہیڈ مسٹریس تھیں مرحومہ مسز روبینہ شاہین بہت ڈیسنٹ اور نائس خاتون تھیں۔سارا اسٹاف ان کی عزت کرتا تھا۔

دوسری ٹیچر تھیں مسز بلقیس نہایت مخلص ہمدرد۔ مگر وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔تیسری دوست تھیں ان کا نام تھا بہار، واقعی وہ اسم با مسمی تھیں، نام بھی بہار خود بھی باغ و بہار شخصیت کی مالک تھیں۔وہ دوران ملازمت ہی انتقال کر گئیں۔

ان سب لوگوں کے ساتھ سروس کا زمانہ نہایت خوش گوار گزرا۔

اسٹاف سے باہر بھی بہت اچھے لوگ ملے۔

میری چھوٹی بہن کی ساس صاحبہ تھیں۔انتہائی خوش اخلاق جب ہم اپنی بہن کے گھر جاتے ان کی ساس ایسے آؤ بھگت کرتیں جیسے ان کی سگی بیٹیاں آ گئی ہوں۔اچار بنا بنا کر ہمیں گفٹ دینا۔فالودہ بنا کر ہمارے گھر بھیجنا اور ساتھ پانچ پانچ کلو دودھ بھی ساتھ دینا اور کہنا شہر میں کہاں خالص دودھ ملے گا۔ ایسے مخلص لوگ کہاں ملیں گے۔

ایک اور ہستی ہے، وہ ریٹائرڈ افسر کی بیگم ہیں جو بہت بڑے زمین دار ہیں۔ان کی ڈیرے داری ہے کتنے کامے اور نوکر ہیں، آموں اور مالٹوں کے باغ ہیں۔گائیں بھینس ہیں، خوشحالی اور فارغ البالی ہے لیکن بیگم میں نخرا بالکل نہیں ہے۔غریب امیر سے دوستانہ طریقے سے ملتی ہیں۔کسی بجن کو قرض امداد چاہیے ہو تو خوش دلی سے دیتی ہیں غرور بالکل نہیں۔ ہر ایک سے گھل مل کر رہنا ان کا وتیرہ ہے بہت نائس خاتون ہیں، اللہ انہیں خوش رکھے۔ایسے لوگ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور یاد آتے ہیں۔

3۔گزشتہ سال ایک صدمہ بھی دے گیا ہمارے کزن کا جواں سال بیٹا جو چار بچوں کا باپ تھا اچانک بیمار ہوا۔نو دن وینٹی لیٹر پر رہنے کے بعد دنیا

دی۔

فرخندہ سلیم......ملتان

1۔زندگی کا یہ سفر واقعی ایک دوڑ کی مانند لگتا ہے، جہاں ہر لمحہ تیزی سے گزرتا ہے اور ہم وقت کی گردش میں اپنے خواب، خواہشیں اور امیدیں اکثر پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے بھی ایسے بیش شمار خواب تھے جو زندگی کے مختلف موڑ پر میرے ساتھ چلے، کچھ حقیقت بن گئے اور کچھ ہمیشہ کے لیے ادھورے رہ گئے۔

میرا ایک خواب تھا کہ میں اپنے والدین کے ساتھ حج پر جاؤں۔ لیکن تقدیر کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ والدین کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہ خواب صرف ایک حسرت بن کر رہ گیا۔

نئے سال کا ارادہ یہی ہے کہ میں اپنے بچوں کے خوابوں کو اپنی ترجیح بناؤں، سچ ہے کہ خواب بھی ختم نہیں ہوتے۔ ان کی جگہ نئے خواب لے لیتے ہیں۔ زندگی کے اس موڑ پر، میں نے سیکھا ہے کہ خوابوں کی تعبیر کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

بچپن کی یادیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ مجھے آج بھی وہ سردیوں کی شامیں یاد آتی ہیں جب والد سب بہن بھائیوں کو اپنے گرد بٹھا کر کہانیاں سناتے تھے۔ ان کہانیوں میں نہ صرف نصیحتیں ہوتیں بلکہ زندگی کے انمول سبق بھی چھپے ہوتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب بہن بھائی تعلیم حاصل کریں، اپنے شعبوں میں کامیاب ہوں ہمارے بہتر مستقبل کے لیے وہ محنت کرتے رہے، لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ ہمارے خوابوں کو حقیقت میں بدلتے دیکھ سکیں۔

مجھے یاد ہے کہ ہم بہن بھائی اپنی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر والدین کے چہروں پر خوشی دیکھتے تھے۔ میری بڑی بہن نے جب اپنی پہلی نوکری کے بارے میں بتایا، یا میرا بھائی جب اسکول کے کسی انعام کے ساتھ گھر آتا، تو والدین کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔

بچپن میں صبح ابو کے ساتھ سائیکل پر جا کر حلوہ پوری لانا، ابو کا میرے لیے گولا گنڈا لانا، بھائیوں سے فرمائشیں کر کے دہی بڑے، گول گپے کی ٹرے منگوا کر کھانا، اسکول سے واپسی پر آلو اور چنے والی کھٹے پانی کے ساتھ چاٹ کھانا، پرانی کتابیں بیچ کر ردی والے سے کچھ اور بتیسا کھانا، رات کو بھائیوں کے ساتھ سردیوں میں ڈرائی فروٹ کھاتے وقت پی ٹی وی ڈرامے دیکھنا، امی سے بھی تر تراتا ڈبل گول پراٹھا بنوا کر کھٹائی والے آلو اور چنوں کے ساتھ کھانا، بھائیوں کے ساتھ پکڑن پکڑائی، چھپن چھپائی کھیلنا، سیما کے ساتھ لاہور میں انارکلی بازار سے ڈائجسٹ لینا، تبصرے کرنا اور برے وظالم کہانیوں کے کرداروں کی مٹی پلید کرتے ہوئے ان کو دنیا سے جانے کی بددعا دینا۔ سال میں ایک بار دریائے راوی کی سیر اور ضد کر کے ہم بہن بھائیوں کا کشتی میں بیٹھ کر تلی ہوئی مچھلی اور ابلے ہوئے چاول کھانا، شاہی قلعے میں گھومتے ہوئے خود کو مہارانی تصور کرنا۔

3۔زندگی کا سفر ہمیشہ سیدھا اور آسان نہیں ہوتا۔ گزشتہ سال میرے لیے بھی ایک آزمائشوں بھرا سال ثابت ہوا۔ گزشتہ سال کی سردیوں میں، جب دسمبر کی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، مجھے اپنے بڑے بھائی کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ بھائی، جو میرا محافظ تھا، میرا سہارا تھا، میرے والدین کے بعد میری زندگی کی سب سے بڑی قوت تھا۔ اس کا یوں اچانک چلے جانا میرے لیے ایک ایسا زخم ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں بچپن میں کتنے قریب تھے۔ جب میں چھوٹی تھی اور بارش میں کھیلنا چاہتی تھی، تو وہ میرے لیے گرم چائے بناتا اور کہتا۔ ”بارش کے ساتھ چائے کا مزہ لے لو، باہر مت جاؤ۔“

اب وہ وقت خواب کی طرح لگتا ہے، اور اس کے بغیر زندگی ویران سی محسوس ہوتی ہے۔

اسی سال، میری ایک قریبی دوست کے ساتھ ایک ایسا تجربہ ہوا جس نے میرے دل کو اور زخمی

کردیا۔ ہم دونوں کی دوستی کئی سال پرانی تھی، لیکن ایک معمولی سی بات پر اس نے ایسی باتیں کیں جن کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ اس نے میرے جذبات کو ٹھکرادیا اور ہمارے تعلق کو ختم کردیا۔ ایک طرف میں اپنے بھائی کے بچھڑنے کا غم سہہ رہی تھی، اور دوسری طرف ایک ایسا رشتہ ختم ہوگیا جس پر میں نے ہمیشہ بھروسا کیا تھا۔

مشیے علی خان...... خانیوال

1۔ اس سال ارادہ تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی کا جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ وجوہات بہت ساری ہیں خیر مرضی میرے رب کی ان شاء اللہ 2025 میں ضرور ہوجائے گی۔ (یہ تو تھا فیملی کے حوالے سے)

دوسرا میرا ارادہ ہے کسی دوسری اچھی جگہ مطلب اچھے اسکول میں، نوکری کا جو پورا نہیں ہوسکا اس سال دیکھیے کیا بنتا ہے یہاں اچھے اسکول سے مراد اچھا سیلری پیکیج ہے۔ جب پرائیویٹ ہی کرنی ہے تو کم از کم سیلری تو اچھی ہو۔

2۔ سرد شاموں، خنک راتوں میں بچھڑے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ ماں چلی گئیں ہمیشہ کے لیے نہیں بھولتیں کسی بھی وقت موقع اور لمحہ پر۔

باقی 6 جولائی کا دن بہت خوش گوار اور یادگار ہے میرے لیے سات جولائی کو ابا جانی کی سالگرہ منائی۔ وہ بہت یادگار ہے بلکہ میں آپ لوگوں کے توسط سے بابا سے کہنا چاہوں گی کہ بابا ہم سب آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ماں کے بعد آپ ہمارے لیے ماں اور باپ دونوں ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین

3۔ 14 اکتوبر کی رات۔ دراصل 15 اکتوبر کو ہمارا خاندان جس حادثے کا شکار ہوا، بہت بہت تکلیف دہ ہے لیکن بھولنا ممکن نہیں بلکہ اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ میرا رب ظالموں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائے۔

فرحانہ مہناز...... گوجرانوالہ

1 کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

جی بالکل یہ سال بھی بھاگ دوڑ کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ سال گزر گیا...... جوائنٹ فیملی سے بیزار، الگ گھر کی خواہش اسلام آباد سے دوبارہ یہاں شفٹ ہوگئے۔ اب تو کوئی خواب، کوئی خواہش کچھ بھی ایسا نہیں جسے پورا کرنے کی لگن ہو۔ ایسے بہت سے خواب تھے جن کی تکمیل کے لیے اب سوچنا چھوڑ دیا اس سال ایک دعا، خواب، خواہش تھی کہ بڑی بیٹی جس کے بہتر مارکس کے لیے گوجرہ شفٹ ہوئے، دعا تھی کہ 550 سے 500 مارکس آجائیں۔ لیکن بیس مارکس کم تھے بہت افسردہ ہوئی اب۔

2۔ جی ماشاء اللہ خوب صورت خوش گوار یادیں جو تا عمر ساتھ رہیں گی۔ سولہ سترہ سال پہلے کی دعائیں رنگ لائیں۔ پچھلے سال اکتوبر 2023ء میں اپنے میاں اور بڑی بیٹی کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کی، بہت خوب صورت شان دار دن تھے جو ابھی بھی سوچتی ہوں تو مسکراتی رہتی ہوں۔ آنکھیں بند کرکے ان پاک راستوں کو محسوس کرتی ہوں۔

سوال کا دوسرا حصہ جتنا تلخ ہے اسی میں تیسرے سوال کا جواب بھی آپ کو مل جائے گا۔

اے گردش ایام ہمیں رنج بہت ہے
کچھ خواب تھے ایسے جو بکھرنے کے نہیں تھے
دکھ یہ ہے کہ میرے یوسف و یعقوب کے خالق
وہ لوگ بھی بچھڑے ہیں جو بچھڑنے کے نہیں تھے

2000ء کا وہ دن مجھے ابھی بھی یاد ہے جب 10th کلاس کا لاسٹ پیپر دے کر میں اور میری بہت پیاری دوست عائشہ راستے سے کباڑیے کی دکان سے بہت سے رسالے لے کر خوشی خوشی گھر آئیں وہ دن اور آج کا دن ڈائجسٹ سے تعلق ہے۔ ہم پانچ دوستیں جن میں تین ایک ہی کالونی میں رہتی ہیں اور دو کچھ فاصلے پر تو ہم دونوں بلکہ چاروں دوستیں

شعاع اور خواتین لیتیں اور باری باری پڑھتیں اور پھر ہم چاروں دوستوں کی شادی گوجرہ میں ہوگئی اور راحیلہ کی لاہور۔ وقت گزرتا گیا لیکن ہم دوستوں کا فون پر رابطہ رہا۔ میں، عذرا، عائشہ اور عصمت اس شہر میں تھیں تو دوستی کا رشتہ گہرا ہوتا گیا۔

عائشہ اب کم رسالہ پڑھتی، کاموں میں مصروف کچھ سسرال کے ماحول کا فرق لیکن جب اپنے میکے آتی تو اپنی بھابھی سے ڈائجسٹ لے کر پڑھتی، خاص کر جس رسالے میں میرا خط یا کچھ اور آتا تو وہ شعاع اور خواتین کی مستقل قاری تھی۔ بہت سگھڑ، ہنس مکھ، سلیقہ شعار جس نے یہ سارے گر ڈائجسٹ سے سیکھے۔ سسرال معاشی لحاظ سے کمزور تھا۔ میاں بھی ٹک کر کام نہ کرتے جس کی وجہ سے وہ پریشان رہنے لگی۔ 27 ستمبر کو میں عمرہ کرنے گئی تو عصمت اور عائشہ مجھ سے ملنے آئیں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ عمرہ کی ادائیگی سے واپس آئی تو عذرا نے عائشہ کو فون کیا۔ فرحی آ گئی ہے، ملنے چلیں عائشہ نے کہا میری طبیعت ٹھیک نہیں، بخار رہتا ہے تو عذرا اکیلے ہی ملنے آ گئی، ٹھیک پندرہ دن بعد اس کی بیٹی نے بتایا۔ مما ٹھیک نہیں ماموں انہیں فیصل آباد الائیڈ ہاسپٹل لے گئے ہیں۔ عائشہ کے بھائی سابق ہاکی پلیئر عرفان محمود ہیں جو عائشہ کا علاج کرواتے رہے۔ دس دن ہاسپٹل رہ کر وہ واپس آ گئی۔ میں اور عذرا اسے بھائی عرفان کے گھر دیکھنے آ گئے۔

عائشہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ میں اس کے لیے سعودیہ سے گفٹ بھی لائی تھی جو اسے دیے۔ گولڈن چوڑیاں اس نے میرے سامنے کلائی میں پہنی تو جگہ جگہ سوئیوں کے نشان اور نیل پڑے تھے بہت دکھ ہوا عاشی کو ایسے دیکھ کر۔ بعد میں مہمانوں میں مصروف ہوگئی۔ ہمارے گھر کافی آنا جانا لگا رہا۔ کچھ دن بعد عذرا نے بتایا فری عاشی آئی سی یو میں ہے اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اگلے دن ہم دونوں ہاسپٹل گئیں تو وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی منہ پر اتنی سوجن بہت سی نالیوں میں جکڑی ہمیں رو پڑی اپنی پیاری دوست کو دیکھ کر۔ اس کی بیٹی صبح سے اسے آوازیں دے رہی تھی لیکن وہ بے خبر۔ اس نے کہا۔ "مما دیکھیں فری خالہ آئی ہیں۔" تو ہاتھ کمبل سے نکال کر میری طرف کیا میں نے فوراً پکڑ لیا سب بہت حیران ہوئے کہ بے ہوشی میں بھی دوست یاد ہے۔ دوستی تو ایسی ہی ہوتی ہے بے غرض۔

18 فروری کی صبح راحیلہ کا لاہور سے فون آیا تو میں سوئی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ "عذرا کا میسج پڑھا کہ ہماری پیاری دوست اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔"

اُفف! عائشہ جبار اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو چھوڑ کر چلی گئی۔

قارئین میری دوست کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔

پیاری قارئین میرے کچھ خطوط میں ذکر ہوتا ہے کہ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے شادی سے پہلے تو چاچو کے بچے، تایا کے بچے، سب بہن بھائیوں کی طرح رہے۔ اس سال 14 جون کو پھر فقط مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے کزن صرف دس دن بیمار رہ کر وفات پا گئے۔ اپنے ایک سال کے بیٹے اور دو بیٹیوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اپنا اتنا اچھا گھر بنوا رہا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب مئی کی گرمی میں گھر کو پانی لگانے آتا اور جا کر نہا کرائے ہی میں سوجاتا اس سے بخار ہو گیا اور جان سے گیا۔

اور پھر میرے بڑے بھائی 17 نومبر کو فیصل آباد میں ایڈمٹ رہے۔ سموگ شروع ہوئی تو دوسرے دن بیمار ہو گئے کیونکہ ان کو دس سالوں سے پھیپھڑوں کا مسئلہ تھا۔ سموگ میں زیادہ ہو دس دن بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے اپنی چار بیٹیاں اور ایک بیٹے کو چھوڑ کر۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نعیمہ ناز سے ملاقات

شاہین رشید

گذشتہ سے پیوستہ

"لوگ کیا پڑھنا پسند کرتے ہیں سنجیدہ ادب، کامیڈی یا پھر رومانس؟"

"میرا خیال ہے کہ لوگ ہر طرح کی تحریریں پڑھ لیتے ہیں بس اس میں دلچسپی کا عنصر ہونا چاہیے اور سب کچھ ایک حد میں ہو۔ رومانس ہو مگر چھچھورا اور عامیانہ نہ ہو۔ کامیڈی ہو مگر پھکڑ پن نہ ہو، سنجیدہ ہو مگر بہت ثقیل نہ ہو۔ لوگ افسانے پہلے پڑھتے ہیں جبکہ ناول اور ناولٹ فرصت کے اوقات میں پڑھتے ہیں۔

اور میں ناول فرصت کے اوقات میں لکھتی ہوں اور یہی میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ مختصر تحریریں لکھنا یعنی دریا کو کوزے میں بند کرنا میرے لیے زیادہ مشکل ہے۔"

"کہانیوں کے نام کیا سوچ کر رکھتی ہیں اکثر نام مماثلت نہیں رکھتے آپ کیا کہیں گی؟"

"میرے کرداروں اور کہانیوں کے نام آسان اور عام فہم ہوتے ہیں۔ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ عنوان کہانی کے مطابق ہو، ویسے میری کئی تحریروں کے نام "مس اقتل" نے رکھے ہیں۔ میں تو اکثر بغیر عنوان کے ہی بھیج دیتی ہوں۔"

"گوگل پہ اپنا نام دیکھ کر کیسا لگتا ہے۔ اور لوگ تعریف کرتے ہیں؟"

"بہت خوشی ہوتی ہے، بہت اچھا لگتا ہے اور آن لائن تحریریں لوگ پڑھتے ہیں۔ ویسے مجھے پسندیدگی کے لیے کبھی کسی نے پرسنل میسج نہیں بھیجا۔ ہاں البتہ جو لوگ پڑھتے ہیں ان سے جب ملاقات ہوتی ہے تو میری تحریروں کی تعریف ضرور کرتے ہیں۔"

"کبھی کسی تقریب میں لوگوں کو بتایا کہ آپ رائٹر ہیں؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ مجھے خود اس طرح اپنے بارے میں بتاتے ہوئے یا تعارف کرواتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔

اور ہاں آپ نے کہا کہ نئی نسل پڑھنے سے دور بھاگتی ہے تو آپ کس کے لیے لکھتی ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ میں جن ڈائجسٹ، خواتین، شعاع میں لکھتی ہوں وہ تو بہر حال پڑھتے ہیں اس لیے ہماری ہمت بھی بندھی رہتی ہے۔ اور آج کی نسل اگر پڑھنے سے دور بھاگتی ہے تو اس میں کچھ قصور ہم بڑوں کا بھی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں کتاب ہوگی تو یقیناً ہم اسے اپنے بچوں کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں۔

سوشل میڈیا ایک ٹول ہے چاہیں تو اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں اور چاہیں تو خود کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کرلیں۔ ویسے ہماری نوجوان نسل نے زیادہ تر اسے منفی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

آپ یقین کریں میرے بچوں کا اسکرین ٹائم آدھے سے ایک گھنٹہ ہے۔ سوشل میڈیا پر کوئی بھی ایکٹیو نہیں ہے۔ ابھی تک تو بچوں کو میں نے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔"

"آپ کی کوئی کہانی جو آپ کو خود بھی بہت پسند ہو؟"

"جی بالکل ہے، 14 اگست اور 16 دسمبر کے حوالے سے لکھی گئی اپنی تمام تحریریں مجھے پسند ہیں۔ فلسطین کے موجودہ حالات پر ایک ناول لکھا تھا اور

دیگر پسندیدہ کہانیوں کے نام پہلے بتا چکی ہوں۔"

"رزق و زوال تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے، آپ کو تاریخ سے کتنی دلچسپی ہے؟"

"وہ لکھاری ہی کیا جسے تاریخ اور سیاست سے دلچسپی نہ ہو۔ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوتا آیا ہے اس کے تانے بانے ماضی سے جڑے ہوتے ہیں انہیں جانے بغیر مستقبل کی پیش گوئی بھی نہیں کی جاسکتی۔ تاریخ چند سال پرانی ہو۔ سیکڑوں یا ہزاروں سال ہر ایک لیے اس میں سامان ہے دلچسپی کا عبرت کا اور حیرت کا۔ تاریخ کا مطالعہ مجھے ہمیشہ مسحور کر دیتا ہے۔

آپ نے سیاست کے بارے میں پوچھا تو سیاست تو مجھے گھٹی میں ملی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تو مجھے سوالات کرنے کی بہت عادت تھی اور میرے ابا کا ایک خاص انداز تھا جواب دینے کا۔

جیسے میں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ "اباجی آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟"

تو جواب آتا کہ ہماری شادی اس وقت ہوئی تھی جب ایوب خان نے پاکستان میں پہلا مارشل لاء لگایا تھا 1958 میں تب ہوئی تھی شادی۔ سوال پوچھا کہ پہلی نوکری کب ملی تو جواب آیا کہ جب اسرائیل نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرلیا تھا یعنی 1967 میں۔

اسی طرح بنگلہ دیش پہلی بار جانے کا ذکر آیا تو بتایا کہ ہم تو اس وقت گئے تھے جب بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا ہم 70 کے کے الیکشن کے بعد گئے تھے اور ویزا نہیں تھا اس وقت، تب مجھے پتا چلا کہ بنگلہ دیش کب بنا تھا۔

یعنی ہر سوال کے جواب میں سیاست کا ضرور ذکر ہوتا تھا۔ تو جب میں نے پرائمری پاس کی تو مجھے مارشل لا کے بارے میں جنرل ضیا کے بارے میں، جنرل یحییٰ اور ایوب خان کے بارے میں بہت اچھی معلومات ہو گئی تھی انہوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیے تھے۔ "آمریت" کسے کہتے ہیں اور بھٹو کو پھانسی کیوں ہوئی تھی اس کے بارے میں ساری معلومات ہو گئی تھی۔

اور ہمارے چچا بھی اس طرح کے سوالات کرتے تھے جیسے والد صاحب۔

ابا کو ریڈیو پاکستان سننے کا بہت شوق تھا اور ہم نے تو آنکھ کھولتے ہی بی بی سی سنا۔ اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو "وسعت اللہ خان" اور شفیع نقی جامعی کو بہت سنا اور ہر وقت سننے سے مجھے بھی سیاست سے خبروں سے اور دیگر چیزوں سے دلچسپی ہوتی تھی۔ اور کسی زمانے میں تو میں ٹاک شو اور خبریں بہت دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب مصروفیات کی وجہ اور کچھ دل کھٹا ہونے کی وجہ سے سیاست سے پہلے والی دلچسپی نہیں رہی اور اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ ہر پروگرام دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا اور ہر صحافی سننے کے قابل نہیں ہوتا۔ اب میں زیادہ تر "ڈان نیوز" کے پروگرام دیکھتی ہوں۔ "ذرا ہٹ کے" جس میں وسعت اللہ خان اور دیگر صحافی شرکت کرتے ہیں۔

وسعت اللہ خان تو مجھے بہت ہی پسند ہیں اور جب ان کو دیکھتی ہو تو بچپن کی خوب صورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے بچوں کو بھی تاکید کرتی ہوں کہ کم سے کم ایک وقت کی نیوز تو ضرور سنا کریں مگر بچے کب کسی کی سنتے ہیں۔ وہی سوشل میڈیا کی خرافات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

آپ کے شروع کے سوالوں میں ایک سوال جواب تھوڑا سا رہ گیا تھا کہ فیشن کتنا پسند ہے اور ہنر کچھ سیکھا اپنے بڑوں سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کپڑوں پہ کڑھائی اور پینٹنگ کا ہنر بھی سیکھا اور اماں کی اون اور سلائیوں سے بھی الجھنے کی کوشش کی، مگر پھندوں کا حساب ہمیشہ گڑبڑ ہو جاتا تھا۔ گرمیوں کے دن خاصے لمبے ہوتے تھے تو بہت سارے کام نمٹ جاتے تھے۔

کھانا پکانے کا مجھے بہت شوق ہے۔ سب کچھ اپنی ماں سے ہی سیکھا اور شادی سے پہلے ہی بہت اچھے ذائقہ دار کھانے پکانے لگ گئی تھی اور عام دنوں میں تو عام روٹین کی ہی چیزیں بنتی ہیں۔ مگر بقرعید پر خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اور ہر وہ ڈش بنانے کی کوشش کرتی ہوں جو بقرعید کے حوالے سے مشہور ہے اور

شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ تو میرے گھر والے میرے ہاتھ کا پکا ہوا دم کا قیمہ، چپلی کباب اور گولا کباب بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

"اپنی گھریلو لائف کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟"

"میری شادی 27 ستمبر 2009 میں ہوئی عید کا پہلا ہفتہ تھا۔ دو مہینے کے اندر اندر رشتہ آیا اور شادی ہوگئی۔ ارینج میرج تھی اور رشتہ طے ہونے کے بعد میں نے ان کی (محسن) تصویر دیکھی تھی گھر والے دیکھ کر آگئے اور تصویر لانا بھول گئے۔ بہن نے نقشہ کھینچا کہ اچھا ہے۔ لمبا ہے، خوش شکل ہے۔ یہ سن کر میری تشویش اور بڑھ گئی کہ خوش شکل ہونے کے ساتھ کہیں بدمزاج نہ ہو۔ روڈ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو کیسے گزارا ہوگا۔ بداخلاق نہ ہو اور شادی کے لیے میری خواہش تھی کہ کوئی بدمزاج اور بداخلاق نہ ہو۔ کیونکہ ایسے لوگوں سے میری بہت جان جاتی ہے۔ شکل وصورت، آمدنی جو کچھ بھی ہو بس بدمزاج نہ ہو۔

تو جناب میں نے تو چند پھولوں کی تمنا کی تھی اللہ نے پورا گلدستہ ہی عنایت کردیا، یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے۔ میرے شوہر دھیمے اور نرم مزاج کے ہیں۔ احساس ذمہ داری ہے۔ اپنی فیملی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور یہی میں چاہتی تھی۔

سسرال کا ماحول عموماً میکے کے ماحول سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں رہن سہن مختلف ہوتا ہے۔

میرے میاں صاحب اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور ہیں تو انہیں یہ ڈر خوف تھا کہ آنے والی ان کے بیٹے کو والدین سے دور نہ کردے۔ جدا نہ کردے۔ اس خوف نے پابندیوں کی سختیوں کو جنم دیا اور جن دنوں کو خوب صورت کہا جاتا ہے وہ بدصورت ہو کر گزرے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے انہیں (سسرال والوں کو) جب یہ یقین آگیا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے اور نہ ہی نیت کہ ڈیڑھ اینچ کی مسجد بنا کر بیٹھ جاؤں۔ تو پھر حالات، مزاج سب کچھ صحیح ہوتا چلا گیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تمام اختیارات اور تاج وتخت میرے حوالے ہوگیا۔ لیکن اس وقت تک وقت کافی گزر چکا تھا۔ میرے والدین بھی گزر چکے تھے۔ بس یہی کہوں گی کہ "جب حسن تھا تو آئینے نہیں تھے، اب آئینے ہیں پھر حسن کہاں......

خیر میری تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی زینب ہے چودہ سال کی ہے 9th کلاس کی طالبہ ہے اور اسے ہر کام کو سیکھنے اور کورسز کرنا پسند ہے۔ اسے مطالعہ کا بھی بہت شوق ہے "نونہال" کے مختلف سلسلوں میں شرکت کرتی رہتی ہے اور تصویر دیکھ کر کہانی لکھیں کے سلسلے میں زینب کی کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔ دوسری بیٹی کا نام "صبا" ہے "صبا" بارہ سال کی ہے اور 7th کلاس میں پڑھتی ہے۔ بہت ہی شرارتی ہے اور اپنی باتوں سے دوسروں کو ہنسانے میں ماہر ہے۔ چھوٹی کا نام "مریم" ہے اور مریم اور صبا کو کہانیاں اور لطیفے پڑھنے کا شوق ہے یہ دونوں زینب کی طرح کتابیں نہیں پڑھتیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب ہم بڑے ہوں گے تو کتابیں پڑھیں گے۔ ابھی تو بچوں کے میگزین پڑھنے کی عمر ہے ہماری۔ ہاں "مریم" کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ مریم دس سال کی ہے۔ پانچویں کلاس کی طالبہ ہے اور اسے سوالات کرنے کا بہت شوق ہے دن میں کم سے کم ایک درجن سوالات تو کرہی لیتی ہے اور ابھی کچھ دن پہلے "مریم" نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ جو کہانیاں لکھتی ہیں انہیں "ڈاؤن لوڈ" کہاں سے کرتی ہیں۔"

"کس کہانی کو لکھتے وقت کشمکش کا شکار ہوئیں اور جو شہرت اور عزت ملی ہے، اس کے بارے میں سوچا تھا؟"

میں نے کچھ ہی عرصہ قبل ایک ناولٹ لکھا تھا "برزخ سے دوزخ تک" اگرچہ وہ مسترد ہوگیا مگر اسے لکھتے وقت میں خود بھی کافی کشمکش کا شکار تھی کیونکہ اس کا موضوع ایسا تھا لیکن وہ میرے دل کے قریب ہے۔

اور میں نے تو کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں مشہور

مصنفہ بن جاؤں گی بلکہ میں نے تو مصنفہ بننے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا تو مشہور ہونا تو دور کی بات ہے۔ بس پتا ہی نہیں چلا پہلی کہانی لکھی اور وہ چھپ بھی گئی۔ اور پھر لکھتی ہی چلی گئی اور آج تک لکھ رہی ہوں اور اللہ نے شہرت دے دی۔ کبھی سوچا نہیں تھا اس بارے میں۔ دراصل میں نے کبھی بڑے بڑے خواب دیکھے نہیں اور نہ ہی اپنے بارے میں ایسا سوچا تھا۔ بس اللہ کی مہربانی ہے۔"

"نئے لکھنے والوں کے لیے کیا کہیں گی؟"

"نئے لکھنے والوں کے لیے یہی کہوں گی مطالعہ زیادہ کریں اور لکھتے رہے اور لکھتے ہی رہیں چاہے آپ کی کتنی ہی تحریریں مسترد ہو جائیں ہمت نہیں ہاریں۔ کبھی نہ کبھی تو آپ ایسا لکھ لیں گے کہ چیزیں چھپنا شروع ہو جائیں گی۔ اور ہاں والدین سے میری گزارش ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ہنر بھی سکھائیں تاکہ وقت پر وہ پریشان نہ ہو۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ والدین اپنا سب کچھ اپنے بچوں پر قربان کر دیتے ہیں اور بڑھاپے میں خود خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں تو ایسا نہ کریں آپ نے تعلیم دلوادی۔ اب انہیں کہیں کہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائیں۔ اپنی شادیاں اپنے پیسے سے کریں اور میں یہ بات اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھ کر ہی کہہ رہی ہوں جو بڑھاپے میں خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔

مزاج کے حوالے سے کچھ باتیں میں نے پہلے بھی کہی تھیں اور مزید اس میں اضافہ کرنا چاہوں گی کہ میں ذرا پرانے زمانے کی ہوں۔ زمانے کے ساتھ چلنا۔ قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنا میں ان خواتین میں سے نہیں ہوں۔ جدید چیزیں استعمال کرنا نئی سہولیات سے فائدہ اٹھانا اچھی بات ہے کہ سب سہولیات ہمارے فائدے کے لیے ہی ہیں۔ لیکن مجھے ان چیزوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لیے میں اکثر پرانی چیزیں بھی استعمال کر لیتی ہوں جیسے گرائنڈر اگر خراب ہو جائے تو میں سل بٹہ استعمال کر لیتی ہوں ہاون دستہ بھی استعمال کر لیتی ہوں۔ اس میں مجھے کوفت یا بیزاریت نہیں ہوتی اور نہ ہی میں اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتی ہوں کہ ہائے گرائنڈر خراب ہو گیا ہے تو کیا کروں۔

اسی طرح پراٹھے پر یا روٹی پر سبزی رکھ کر کھانا یا اچار کے ساتھ کھانے میں بہت مزہ آتا ہے اور یہ عادت مجھ میں کیوں ہے پتا نہیں۔ ہمارے گھر میں بھی کوئی اتنا سادہ مزاج نہیں ہے۔ جتنی میں ہوں۔ پھر جب میں اپنی نانی اور دادی کا زمانہ سوچتی ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میری نانی دادی میں ایک بنگلہ دیش کے گاؤں کی تھیں اور ایک انڈیا کے گاؤں کی تھیں۔ تو مجھے لگتا ہے کہ ان سے کچھ باتیں مجھے ورثے میں ملی ہیں۔

اپنا گھر ہر عورت کا خواب ہوتا ہے تو جب میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے خوابوں کا گھر کوئی بڑا بنگلہ نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا گھر ہو مگر اس میں "صحن" بڑا سا ہو۔ صحن میں کیاریاں ہوں پھلواری لگتی ہوئی ہو۔ ایک درخت ہو اور درخت کے نیچے ایک تخت یا چارپائی ہو اور اس میں میں "براجمان" ہوں مجھے صحن والے گھر بہت زیادہ پسند ہیں۔ اگر میرے پاس وسائل ہوں تو میں ایسا ہی بڑے صحن والا گھر بنواؤں۔ ویسے میری اماں کو بھی شوق تھا پھلواری کا اور بنگال میں انہوں نے تو یہ سب چیزیں دیکھی تھیں۔ انہوں نے گھر میں بھی کیاری بنائی ہوئی تھی جس میں کریلے اور دیگر سبزیاں لگائی ہوئی تھیں۔

"میں آپ کو فری ہینڈ دیتی ہوں کہ آپ اس انٹرویو کے ذریعے جو کچھ کہنا چاہیں ضرور کہیں؟"

"بہت شکریہ......اور شکر ہے کہ میں کوئی سیاسی کارکن نہیں ہوں ورنہ پتا نہیں کس کو کیا کیا کہہ دیتی۔ اور اپنے قارئین کہ جن حالات و مسائل و مشکلات کا شکار ہیں سب لوگ عمومی طور پر، تو اس معاملے میں میں اور آپ ایک پیج پر ہیں۔

میں جس گھر میں رہتی ہوں وہ چھوٹا سا گھر ہے 60 سے 70 سال پرانی تعمیرات ہے۔ بہت ہی

خستہ حالات ہیں۔ بارش کے دنوں میں برا حال ہوتا ہے۔

ہمارے بچے اور میاں کہتے ہیں کہ چلو اب کڑاہی چڑھادو اور پکوڑے ہی بنادو۔ تو میٹھے اور نمکین پکوڑے بن جاتے ہیں جو آرام سے ہم کھا بھی لیتے ہیں اور کچھ گھنٹہ کے بعد فرسٹریشن کافی حد تک کم ہوجاتی ہے۔

میرے شوہر ہر حال میں پرامید رہتے ہیں اور خوش رہتے ہیں جبکہ میں ایسی نہیں ہوں۔ میں بہت سے معاملات کو بہت گہرائی میں جاکر سوچتی ہوں۔ مستقبل کے اندیشے مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ اپنے شوہر سے یہی سیکھا ہے کہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی بہت ہیں وہ بہت پرامید رہتے ہیں جبکہ میں نہیں رہ پاتی۔ میں بہت گہرائی میں جاکر سوچتی ہوں اور بہت زیادہ سوچتی ہوں۔ میرے شوہر بڑی بڑی خوشیوں کا انتظار نہیں کرتے۔ میں بھی اب یہی کوشش کرتی ہوں کہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں انجوائے کروں۔ مگر کر نہیں پاتی۔

ہم اپنی کہانیوں میں مشکلات دکھاتے ہیں۔ اندھیرے دکھاتے ہیں اور آخر میں حل کردیتے ہیں، تو پھر میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ کہانیوں میں زندگی ہو نہ ہو زندگی ایک کہانی ضرور ہے۔ آخر میں سب اچھا اچھا ہو ہی جاتا ہے اور امید ہے کہ ہمارے ساتھ بھی سب اچھا اچھا ہو ہی جائے گا۔

اور اپنے شوہر کے بارے میں پھر ایک بات ضرور کہوں گی کہ میں نے ان سے یہ بات سیکھی کہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لطف اندوز ہوں اور حالات کتنے ہی مشکل اور مایوس کن ہو، پریشان نہ ہوں۔ وہ ان حالات میں خود بھی ہنس پڑتے ہیں اور مجھے بھی ہنسانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور پھر جب میں ہنس پڑتی ہوں تو بچوں سے کہتے ہیں دیکھو تمہاری اماں کو ہنسادیا۔

اور ہمارے معاشرے میں شادی شدہ وہ عورت بڑی خوش نصیب ہوتی ہے جس کا شوہر اس کو عزت دیتا ہے، تو اللہ کا شکر ہے کہ میں خوش نصیب ہوں اس معاملے میں اور اب میں بھی چیزوں کو پوزیٹو دیکھنے لگی ہوں۔"

"وہ بامحاورہ زبان جس کے بولنے والے بھی بہت کم ہیں آپ اپنی کہانیوں میں کیوں لکھتی ہیں؟"

"مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں بھولے بسرے، متروک اور گمشدہ لفظوں اور اصلاحات کا خزانہ موجود ہے، جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہوجائے تو سمجھوں گا میری محنت ٹھکانے لگی۔ میں بھی یہی سوچ کر ہر زبان لکھتی ہوں۔

اور میرے لکھنے کی روٹین یہ ہے کہ صبح و رات کے وقت لکھتی ہوں۔ صبح سے دوپہر تک ہمارے یہاں خاموشی ہوتی ہے۔ پھر بچے دو بجے اسکول سے آجاتے ہیں اور پھر جو چڑیاں چہچہاتی ہیں تو رات گئے تک یہ ہنگامہ رہتا ہے۔"

"لکھنے پڑھنے کے علاوہ کیا مشاغل ہیں آپ کے؟"

"بے شمار...... مختلف ادوار میں مختلف مشاغل رہے، اسکول اکیڈمی میں پڑھانا۔ قرآن کا انتظام اہتمام اور شرکت، نشرواشاعت کا کام، مختلف ریلیوں اور جلسے جلسوں میں شرکت، کوکنگ بہت کرتی تھی اور بہت شوق سے کرتی تھی۔ رشتے داروں سے ملنا جلنا۔ سلائی بھی سیکھی اور کروشیا بھی سیکھا، دوپٹوں پر پرنٹنگ بھی بہت کی اور گلے اور آستین بھی بہت بنائی۔

اور چلتے چلتے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ میرے انٹرویو کی پہلی قسط میں دو تین باتیں غلط شائع ہوگئی ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے کہ میرے والد کی شادی لاہور والی لڑکی سے ہوئی تھی جبکہ ان کی شادی بنگال والی لڑکی سے ہوئی تھی۔

پھر ایک محاورہ لکھا ہے "دل گلابی ہونا" جبکہ "گلابی نہیں بلکہ "الاپی" ہے اس کا مطلب ہے کسی کام کو کرنے کا بہت دل چاہنا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

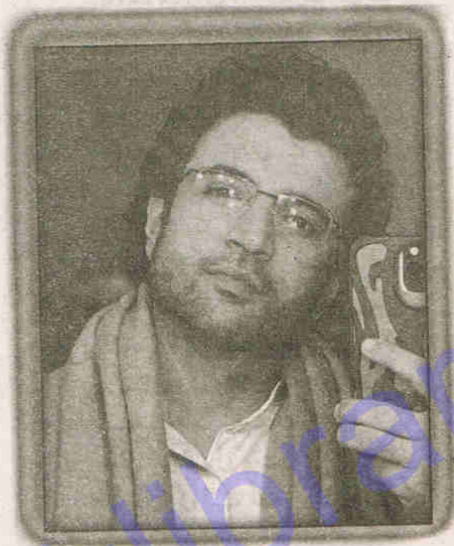
بہت شکریہ نعیمہ ناز آپ نے وقت دیا۔

☆☆

ماڈل اور اداکار

عمر اقبال سے باتیں

شاہین رشید



1۔اصلی نام؟

ج۔عمر اقبال

2۔پیار کا نام؟

ج۔امی کبھی کبھی پیار سے ”عمری“ بول دیتی ہیں۔

3۔تاریخ پیدائش/سال؟

ج۔ 24اپریل 1993ء

4۔قد/ستارہ؟

ج۔ 5فٹ 10انچ/ثور

5۔مادری زبان؟

ج۔پنجابی......لیکن گھر میں اردو بولتے ہیں۔

6۔تعلیم؟

ج۔بیچلر ان بزنس ایڈمنسٹریشن۔

7۔شادی/بچے

ج۔ابھی سنگل ہوں۔

8۔شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟

ج۔شوق تھا شوبز میں آنے کا اور گھر والے بہت سپورٹیو تھے اور ہیں اس لحاظ سے میں بہت لکی ہوں۔

9۔بہن بھائی/آپ کا نمبر؟

ج۔میں اپنی دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں اور درمیان کا ہوں۔

10۔بچپن کی بری عادت جو مشکل سے گئی؟

ج۔زبان باہر نکال لیتا ہوں جب کوئی کام بہت توجہ کے ساتھ کر رہا ہوتا ہوں......یہ عادت ابھی بھی ہے۔

11۔بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟

ج۔بچپن میں ہارر مووِیز سے اور ایک ڈرامہ سیریل ہوا تھا ”حقیقت“ اس سے ڈر لگتا تھا اور ہارر مووِیز سے تو آج تک ڈر لگتا ہے۔

12۔زندگی کی پہلی کمائی کس عمر میں کی اور کس کے ہاتھ میں رکھی؟

ج۔اپنی صحیح عمر تو مجھے یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ماموں کی ایک دکان تھی، وہ کی چین وغیرہ بناتے تھے۔میں نے بھی بنائی اور اس کو دس روپے میں بیچ دیا اور وہ دس روپے امی کو لا کر دے دیے یہ 2001ء کی بات ہے۔

13۔آپ کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی؟

ج۔پروگرام ”تماشا“ میں جو کامیابی ملی۔وہ میرے

والدین نے بھی دیکھی اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

14۔ اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟

ج۔ کام کے حوالے سے میں ''یاسر حسین'' سے ہی مشورہ لیتا ہوں۔

15۔ گھر میں کس کا رعب ہے؟

اب تو میرا ہی ہے......(ہنستے ہوئے)

16۔ آپ کی صبح اور رات کب ہوتی ہے؟

ج۔ رات بھی دیر سے ہوتی ہے اور صبح بھی دیر سے ہوتی ہے۔ اگر کام نہ ہو تو۔

17۔ صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟

ج۔ کوئی ایسا آئٹم نہیں ہے......اتنا عادی بنایا ہی نہیں اپنے آپ کو۔

18۔ بھوک میں آپ کی کیفیت؟

ج۔ پہلے بھوک لگنے پر غصہ آتا تھا۔ اب نہیں آتا۔ اب بھوک برداشت کر لیتا ہوں۔

19۔ پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟

ج۔ جیسا بھی ہے اپنا ہے......اللہ آسانیاں پیدا کرے اپنے ملک کے لیے دعا گو ہوں۔

20۔ کس ملک کی شہرت کی خواہش ہے؟

ج۔ کسی بھی ایسے ملک کی کہ جہاں ''ویزا'' لگوانے کے مسئلے نہ ہوں۔

21۔ اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟

ج۔ مجھے اسپورٹس دیکھنے کی حد تک پسند ہے۔ کرکٹ زیادہ کھیلی ہے اور آج کل ''والی بال'' بھی چل رہا ہے۔

22۔ گھر میں ضدی اور آرام طلب کون ہے؟

ج۔ گھر میں ''ضدی'' میری چھوٹی بہن ہے اور ''آرام طلب'' میں ہوں۔

23۔ پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟

ج۔ بہت نروس تھا۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیمرے کے لیے اداکاری کیسے کرتے ہیں......کیونکہ میں تھیٹر کا بندہ تھا۔

24۔ گھر میں سب سے زیادہ پیار کس کو ملا؟

ج۔ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو۔

25۔ پسندیدہ سیاسی شخصیت؟

ج۔ خان صاحب

26۔ کس سیاست دان کا کردار کرنے کی خواہش ہے؟

ج۔ کسی کا بھی نہیں ویسے میں ایک تھیٹر پلے میں ''شہباز شریف'' کی اداکاری کر بھی چکا ہوں۔

27۔ کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟

ج۔ اسٹوپڈ باتوں پر......لیکن یہ بتاؤں کہ میری آواز قدرتی طور پر کافی تیز ہے اور ایسا بچپن سے ہے۔

28۔ کیا چیزیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟

ج۔ گھر، گاڑی اور بائیک۔

29۔ کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتے ہیں؟

ج۔ اس بارے میں سوچا نہیں۔ اللہ نہ کرے کہ فیلڈ چھوڑنی پڑے۔

30۔ خاندان میں کون جلدی ناراض ہو جاتا ہے؟

ج۔ اس کا جواب امی بتا سکتی ہیں؟

31۔ کسی کی ایک اچھی عادت جو آپ اختیار کرنا چاہتے ہیں؟

ج۔ ہمارے ایک ڈائریکٹر ہیں جو بہت سوفٹ اسپوکن (نرم گو) ہیں ان کی یہ عادت مجھے پسند ہے۔

32۔ زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟

ج: بچپن میں میری سائیکل چوری ہو گئی تھی، وہ واپس لینا چاہوں گا۔ (مسکراتے ہوئے)

33۔ دل کا ٹوٹنا/ناقابل برداشت ہے یا موبائل کا؟

ج۔ دل کا......موبائل تو بہت بار ٹوٹ چکے ہیں ابھی کچھ دن پہلے بھی ایک موبائل ٹوٹ چکا ہے۔

34۔ اپنے گھر کے کس کونے میں سکون ملتا

ہے؟

ج۔اپنے روم میں۔

35۔بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟

ج۔بہت زیادہ...... میری امی کہتی ہیں "تو تے نہ ہی بیمار ہوتا عمر" (تم تو نہ ہی بیمار ہوا کرو عمر)

36۔اس فیلڈ میں کیا کیا کر چکے ہیں؟

ج۔تقریباً سب کچھ ہی...... سب میڈیم میں کام کر چکا ہوں...... اور اب اور بہتر سے بہتر کرنا ہے۔

37۔کردار کون سے پسند ہیں نیگیٹو یا پوزیٹو؟

ج۔نیگیٹو کرنے میں انجوائے زیادہ کرتا ہوں۔

38۔پہلا ڈرامہ/وجہ شہرت؟

ج۔پہلا ڈرامہ "خلش" اور اے آر وائی کا "تماشا"۔

39۔اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتے ہیں؟

ج۔کبھی حساب نہیں بنایا۔

40۔کچن سے لگاؤ؟

ج۔بہت زیادہ لگاؤ ہے اور کھانا پکاتا رہتا ہوں۔

41۔کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟

ج۔بہت سارے چھوٹے چھوٹے فیصلے...... خاص طور پر غلط چیزیں خرید لیتا ہوں۔

42۔کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟

ج۔موبائل کو۔(مسکراتے ہوئے)

43۔کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتے؟

ج۔والدین، ڈائریکٹرز اور یاسر بھائی۔

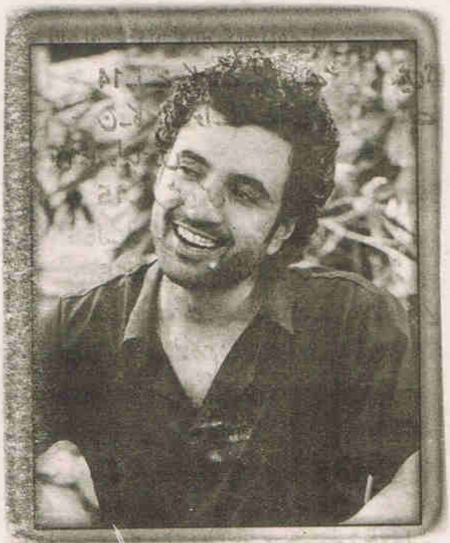
44۔کون سے تہوار کا انتظار رہتا ہے؟

ج۔بچپن میں بسنت کا ہوتا تھا۔اب پروجیکٹ میں ہی اتنا بزی ہوتا ہوں۔

45۔ملک کی ترقی میں کون رکاوٹ ہے عوام یا حکمران؟

ج۔دونوں برابر کے شریک ہیں۔

46۔کھانے کی میز پر کیا ہونا ضروری ہے؟



ج۔دہی

47۔طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟

ج۔تقریباً سارے ہی۔

48۔ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر اعتبار ہے؟

ج۔کسی پر بھی نہیں۔صرف اوپر والے پر۔

49۔دنیا کا سب سے بورنگ کام؟

ج۔انتظار کرنا۔انتظار کرنا کسی کا بہت ہی بورنگ کام ہے۔

50۔کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟

ج۔مشکل سے۔

51۔کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟

ج۔شوٹس پر۔انٹرنیشنل ٹرپ پر۔

52۔وقت کی پابندی کے کتنے قائل ہیں؟

ج۔قائل تو بہت ہوں...... پر کر نہیں پاتا۔

53۔گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں ہے؟

ج۔استری کرنا کپڑوں پر۔

54۔ آج کے دور کا پسندیدہ اینکر؟
ج۔ تابش ہاشمی۔
55۔ کس کیڑے اور جانور کو دیکھ کر چیخیں نکل جاتی ہیں؟
ج۔ سانپ۔
56۔ کس طرح کے کردار ریجیکٹ کر دیں گے؟
ج۔ جو مشکل نہ ہوں۔
57۔ غصے میں آپ کی کیفیت؟
ج۔ لاوڈ ہو جاتا ہوں۔
58۔ کون سی تاریخیں یاد رہتی ہیں؟
ج۔ کوئی بھی نہیں۔
59۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں کیا آن ایر ہے کیا انڈر پروڈکشن ہے؟
ج۔ ایک آن ایر ہے محبت ریزہ ریزہ ایک آنے والا ہے، گرین چینل پر۔
60۔ کیا اپنا ڈرامہ بار بار دیکھتے ہیں؟
ج۔ جی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ "تماشا" تو بار بار دیکھتا ہوں۔
61۔ گھر میں کون بڑھاکو تھا؟
ج۔ ہمارے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہاہاہا
62۔ مشکل میں کس کو کال کرتے ہیں؟
ج۔ اللہ کو ہی کال کرتا ہوں۔
63۔ بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتے تھے؟
ج۔ شام کو مغرب کے بعد گھر آنے پر مار اور ویڈیو گیم کھیلنے جانے پر۔
64۔ گھر میں کون بی بی سی ہے؟
ج۔ کوئی بھی نہیں۔
65۔ کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں؟
ج۔ کپڑوں پر زیادہ ہو جاتا ہے خرچ۔
66۔ کون سا کردار کرنے کی خواہش ہے؟
ج۔ ایکشن ہیرو کا۔
67۔ گھر میں بچت کی عادت کس کو ہے؟
ج۔ امی اور مجھے۔
68۔ کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟
ج۔ اسکول میں ایک ٹیچر کو دکھایا تھا انہوں نے ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ پڑھو گے کم تم زیادہ..... یعنی محدود پڑھائی ہے۔
69۔ کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟
ج۔ تقریباً ہر کام کے لیے۔
70۔ ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتے ہیں؟
ج۔ یاسر بھائی سے۔
71۔ کس کے روٹھ جانے سے پریشان ہو جاتے ہیں؟
ج۔ بہت سارے لوگ ہیں۔
72۔ پسندیدہ موسم؟
ج۔ گرمیاں۔
73۔ گھر میں کس کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہے؟
ج۔ سب کی بریکیں صحیح ہیں۔ الحمد للہ۔
74۔ کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنی ہیں؟
ج۔ بچپن میں یہ کام کیا تھا۔
75۔ یوٹیوب میں آپ کا پسندیدہ چینل؟
ج۔ جس پر میرا کام آ رہا ہو۔
76۔ دنیا کی خطرناک ترین مخلوق؟
ج۔ انسان۔
77۔ شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟
ج۔ جہیز دینے والی رسم کے۔
78۔ کون سا کھانا مشکل سے کھاتے ہیں؟
ج۔ کھانے میں سب کھا لیتا ہوں آرام سے۔
79۔ فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟
ج۔ میں ہی ہوں ہلکا پھلکا۔
81۔ مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے

ہیں؟

ج۔ کوئی فکس نہیں ہے جب دل چاہا۔

82۔ کھانا کھانے کا مزہ آتا ہے، اپنے بیڈ پر ڈائننگ ٹیبل پر یا چٹائی پر؟

ج۔ اچھا مزے دار کھانا کہیں بھی کھالیتا ہوں۔

83۔ اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟

ج: منحصر ہے کہ خبر کیا ہے۔

84۔ کن باتوں سے موڈ خراب ہوجاتا ہے؟

ج۔ چھوٹی چھوٹی بے وقوفانہ باتوں پر۔

85۔ کیا چیزیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

ج۔ موبائل اور والٹ۔

86۔ جانوروں میں پسندیدہ جانور؟

ج: ہسکی ڈاگ

87۔ کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟

ج۔ جی بالکل ہے ہر کسی کے اندر ہوتا ہے۔

88۔ پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟

ج: انداز بیاں

89۔ آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں آنا چاہتا ہے؟

ج۔ امی کہتی ہیں کہ کبھی میں بھی اس فیلڈ میں آؤں گی۔

90۔ غصے میں پہلا لفظ؟

ج۔ کیا بکواس ہے یار۔

91۔ شوبز میں آنے کی وجہ؟

ج۔ ہمیشہ سے شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔

92۔ مطالعہ کرتے ہیں؟ کس کو پڑھتے ہیں؟

ج۔ جی، کسی کو بھی پڑھ لیتا ہوں۔

93۔ سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟

ج۔ تو کچھ اور ہوتا۔

94۔ پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟

ج۔ برنس روڈ...... کراچی

95۔ آپ کے موبائل پر صبح سویرے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟

ج۔ ہیں کچھ اچھے لوگ جو کرتے ہیں میسج۔

96۔ اگر آپ اپنا ریسٹورنٹ کھولیں تو کون سی ڈش کبھی نہیں پکوائیں گے؟

ج۔ یہ نہیں سوچا میں نے۔

97۔ اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟

ج۔ جو اللہ کو منظور ہوگا پھر وہی مجھے بھی ہوگا۔

☆☆



نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

شاہ اقصیٰ سید......اسلام آباد

کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں، پہلی بار ڈائجسٹ میں، بلکہ پہلی بار ہی خط لکھنے کے لیے قلم تھاما ہے۔ اس سے پہلے میں نے خط لکھنا تو کیا، خط لکھنے کا بھی سوچا نہ تھا۔ چونکہ یہ میرا پہلا خط ہے لہٰذا ڈائجسٹ پر تبصرہ کرنے سے پہلے مجھے اپنا تعارف کرانا زیادہ بہتر لگے گا۔

میں ”سیدہ کومل شیرازی“ (جس کا پہلا خط شعاع، اگست 2024 میں شائع ہوا تھا) کی وہی بہن ہوں جو میٹرک کے پیپرز کے دوران اس کے لیے ڈائجسٹ لایا کرتی تھی۔ ہم بھی خاموش قارئین میں سے ہیں۔

ہمارا تعلق پٹھان خاندان سے ہے اور ہم نظام یکجا خاندان (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں بھی رہتے ہیں جو کہ کراچی میں پانچ خاندان (فیملیز) اور دادا، دادی جبکہ یہاں صرف تین خاندانوں اور دادا، دادی پر مشتمل ہے۔ اسلام آباد سے ہمارا گاؤں نزدیک ہونے کی وجہ سے مہمانوں کا بہت زیادہ آنا جانا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ سردیوں میں ایک سال ایک پھوپھو، تو دوسرے سال دوسری پھوپھو بچوں کے ساتھ چھٹیاں منانے ضرور آتی ہیں۔ ایک چاچو ہفتے میں ایک بار بیوی بچوں کو، جبکہ دوسرے چاچو صرف چھٹیوں میں بیوی بچوں سمیت ضرور آتے ہیں۔

بہت زیادہ مزہ آتا ہے خاص کر کھانے کے دوران جب ایک لمبا دسترخوان لگتا ہے تو رونق مزید بڑھ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ میرے تمام گھر والوں کو سلامت رکھے اور خاص کر دادا اور دادی کو لمبی عمر عطا فرمائے کیونکہ جس گھر میں دادا، دادی نہیں ہوتے وہ گھر، گھر نہیں ہوتا۔ (یہ بات کوئی دل پر نہ لگا لے کیونکہ یہ میں نے اپنی رائے دی ہے) ہمارا گھرانہ بہت سخت ہے بلکہ بہت زیادہ سخت ہے۔ یہ تو بس اللہ کا کرم ہے کہ گھر میں ایک عدد ایسا بندہ موجود ہے جس کی وجہ سے میرا یہ کام بھی ہونے جا رہا ہے۔ وہ کون ہے اس کے بارے میں تفصیل سے ان شاء اللہ اگلے خط میں بتاؤں گی۔

پیاری اقصیٰ! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر آپ نے اپنے گھر کے بارے میں جو لکھا اسے جان کر بہت اچھا لگا۔ اب تو چند ہی گھرانے رہ گئے ہیں جہاں اقدار اور روایات باقی ہیں، بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کی قدر کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے گھر کو نظر بد سے بچائے اور اس پیار اور محبت کو ایسے ہی قائم رکھے آمین۔

فرخندہ سلیم......ملتان

خواتین کا سرورق شعاع سے بھی زیادہ پسند آیا۔ کرن کرن روشنی منفرد سا رہا جو پڑھنے کی ترغیب دے گیا۔

خطوط میں ناہید اختیار میں باجی کو پڑھ کر تبصرہ کرنا سیکھا ہے جو عمدہ تبصرہ کرتی ہیں، ساتھ زرینہ باجی، ام ہادیہ، صدف ناصر، فرزانہ مہناز، ریحانہ چوہدری کی آمد عمدہ رہی، وہیں حنا جاوید، آسیہ ساجد، حوریہ خان گوشی نے بھی چار چاند لگائے مگر صائمہ گل، مسرت سلمٰی، رضوانہ وقاص، ثمینہ اکرم و جویریہ حیدر کی کمی محسوس ہوئی۔

نعیمہ ناز سے ملاقات بے حد پسندیدہ رہی اور دوسری کا انتظار ہے۔ مجھے یہ اپنی منفرد تحریروں کی وجہ سے بہت پسند ہیں۔ انٹرویو میں ان کی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں خاص کر ماضی اور بزرگوں سے وابستہ رہنا کہ یہ میری سیم عادتیں ہیں۔ مجھے تو بوڑھی دادیاں نانیاں یہ سب بہت پسند ہیں اور راحت والی ثانیہ کی دادی بھی ایسے روایتی لوگ اچھے لگتے ہیں۔ علی عباس سے ملاقات بھی خوب رہی۔

غزل انجم رہبر کی خوب تر تھی۔ اس بار پکوان کچھ منفرد سے تھے تو بہتر تھے۔

رنگارنگ پھول خواتین ڈائجسٹ کو رنگینی سے رنگ دیتے ہیں۔ بھائی عدنان کا سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے جو طویل عرصے سے بہنوں کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔

نعیمہ ناز کا عرق ریزی سے لکھا افسانہ معاشرے کی تلخ حقیقت تھا۔

لبنیٰ آصف کی پھوپھو کی بہو کی داستان دو صفحات کی بہت دلچسپ تھی۔ جو ملتا ہے اس کا شکر نہیں کرتے اور جب وہ بند ہو جاتا ہے پھر عقل آجاتی ہے پھر یہ بات بالکل درست بات ہے۔

اترن تو بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا گیا تھا جو حقیقت سے قریب تر تھا ویسے شائلہ ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں۔

آسیہ ساجد علی کا افسانہ اگرچہ مختصر مگر بہت ہی پر اثر اور بہترین تھا۔ آسیہ رئیس کا مکمل ناول دلچسپ تھا اور واعد نے بقول اس کے نک چڑھی سی ہیروئن کو اپنا بنا ہی لیا ہاں حویلی چاہے پرانی تھی مگر مجھے پھر بھی نہ

جائے کیوں ایک اپنا پن سا نظر آیا شاید بوڑھے بزرگ کی رونق تھی۔

فرح بخاری کا ناولٹ بہت دلچسپ تھا جو جس میں اشعل اور ماہ رخ کی ہنستی مسکراتی سی کہانی نے اچھا تاثر دے دیا۔ احد بہت اچھے سے اپنی منازل طے کر رہا ہے اور کہانی اینڈ کی طرف جا رہی ہے۔

آپ کہتی ہیں یادداشت اچھی ہے یہ مجھے پتا ہے کہ کیسی ہے۔ قسط وار کی جگہ مکمل تحریریں اسی وجہ سے پسند ہیں۔

تصویروں میں تو انسان اچھا لگ ہی جاتا ہے تیار ہو کر مگر اکثر آئینہ اور تصویریں بھی سچی نہیں ہوتیں۔ میں جیسی تصویروں میں لگتی ہوں حقیقت میں ویسی ہوں نہیں کم عمری دکھنے والی یا حسین نہیں۔

پردیس کو پڑھ کر دلی افسوس ہوتا ہے زندگی اس قدر مشکل بھی ہے اور دیار غیر میں کتنا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ راحت اپنے بہترین سہل انداز کی وجہ سے پسند ہیں۔

پیاری فرخندہ! تفصیلی تبصرہ جامع اور بالکل درست ہے۔ آپ نے تمام کہانیوں کے پیغام کو سمجھا اور بہت اچھا تبصرہ کیا، بہت شکریہ۔ پیاری بہن حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور اچھی سیرت اور اخلاق انسان کو حسین بناتا ہے۔

صائمہ گل......مردان

نومبر کی نرم گلابی دھوپ میں اپنا خط اور سروے دیکھ کر آدھی بیماری رخصت ہوگئی۔ ڈھیر سارا شکریہ۔ کہی سنی ہمیشہ کی طرح دل پر اثر کرتی ہوئی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ایک بہترین سلسلہ، گزارش ہے کہ صدقہ، بیماری اور نظر بد پر بھی روشنی ڈالیں۔ حسب معمول ابن انشا کے کالم نے مسکرانے پر مجبور کیا۔ ”علی عباس“ سے باتیں پسند آئیں۔ اب ہماری نعیمہ پیاری نعیمہ جم جم آؤ جی۔ نعیمہ کے اماں ابا کی سوانح عمری کا بے چینی سے انتظار ہے میں بچپن میں ایسی ہی تھی۔ شرارتی، کھلنڈری اور باتونی۔ آرام سے درختوں اور چھتوں پر چڑھنا۔ نعیمہ جی اپنی ایک تصویر

بھی لگا دیتیں آپ کو دیکھنے کی ایک جستجو سی ہے۔

"ہمارے نام" فرخندہ جی کبھی ہمیں شرف میزبانی بخشیے۔

ہمارا گاؤں واقعی میں بہت پیارا ہے۔ ہر طرف سرسبز لہلہاتے کھیت، چھوٹی بڑی ندیاں، سفیدے کے لمبے گھنے درخت، آٹے کی چکی، ریت والے کنویں سردیوں میں گنے کی فصل آجائے تو گڑ نکالنے والی کڑاہی اسی کڑاہی میں گنے ڈپ کیے جاتے ہیں جس سے پتلا گڑ گنے کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ یہ گاؤں میں سردیوں کی خاص سوغات ہے۔ بڑے بچے شوق سے کھاتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر گاؤں کے سادہ لوح، پرخلوص اور مہمان نواز لوگ۔

سامنے والی کھڑکی سے نظر آتے مناظر ہلکے پھلکے تھے مزہ آیا پڑھ کر۔

اجارہ نشین۔ آسیہ رئیس کی ہیروئن خوب صورت ہو نہ ہو بہادر اور کھٹ کھنی ضرور ہوتی ہے۔ کمال کی منظر نگاری اور کردار نگاری تھی۔ کیپ اٹ اپ آسیہ جی! نعیمہ ناز کی آسیہ نے بروقت فیصلہ کر کے صحیح راستہ چنا۔ جب تک ہاتھ پیر سلامت ہوں محتاجی کیسی۔

پھپھو کی کچھ ایسی بہوؤں سے ہمارا بھی واسطہ پڑا ہے جو کھانے کے ٹائم پر چائے اور چائے کے ٹائم پر کولڈ ڈرنک سے ٹرخا دیتی ہیں۔ مہمان ہوتے تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں مگر کچھ لوگ انہیں زحمت سمجھتے ہیں۔

اترن بھئی ہمارے ہاں تو یہ عام بات ہے۔ منزہ کے بہت سے نئے کپڑے جو اس کو چھوٹے پڑ گئے تھے دیور کی بیٹی طوبیٰ کو پورے آگئے۔ یہ بھی تو محبت اور یگانگی کا ایک رنگ ہے۔

پردیس روشن اماں کے پاس واپس چلی گئی۔ چلو شکر ہے کچھ تو اچھا ہوا۔ اجالا کے ساتھ بھی کچھ اچھا دکھا دیں۔

"احد" مومنہ اور عامر کی منگنی ٹوٹنے پر بہت مبارک باد، ہاہاہا بھئی اکڑ دکھاتی مومنہ تو ہی جچتی ہے۔

انتل کے ساتھ ہادی اور اسود کے ساتھ مہر سوٹ کرتی ہے۔ باقی رائٹر کی مرضی۔

"انگنا پھول" میں دادی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ فرخ کی جلد شادی کرا دیں۔

باقی سارا زبردست رہا۔ طلال کہہ رہا ہے میرا بھی ذکر کر دیں کہ میرا نام بھی رسالے میں آئے۔

پیاری صائمہ! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ طلال صاحب کون ہیں۔ خیر ان کا ذکر خیر ہم نے کر دیا ہے۔ اللہ انہیں سلامتی کے ساتھ خوش رکھے۔

مہمانوں کی تواضع کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز خلوص ہے خلوص ومحبت کے ساتھ جو کچھ آسانی سے مہیا ہو سکتا ہے پیش کر دیا جائے اور مہمان کو بھی اس کی قدر کرنا چاہیے۔ غیر ضروری تکلف اور مہمان کے ساتھ سرد مہری دونوں ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

پرچے پر سیر حاصل تبصرہ کے لیے ممنون ہیں۔ بہت شکریہ۔

گوشی جمال......منڈی یزمان

365 دن 12 ماہ سال 2024 کے اختتام پذیر ہوئے نہ حالات بدلے نہ وقت، وعدے، دلاسے، امیدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اس سنہری زندگی سے ایک سال کم ہو گیا۔ اللہ سب کی خیر کرے اور یہ سال سب کی آس امیدوں پر پورا اترے، آمین!

دسمبر کے ٹائٹل نے اداس اجاڑ آنکھوں کو دلکشی کی طرف راغب کیا۔ روح کو ایک بار پھر سے تازگی بخشی، فہرست میں اتنے ڈھیر سارے ناولز دیکھ کر دل خوش ہوا۔ دسمبر اچھا گزرے گا۔

"کرن کرن روشنی" نے روحانی روشنیوں سے ہمکنار کیا۔ مصنفین سے تعارف کا سلسلہ بہت دل کو بھا رہا ہے۔ جس کی اہم کڑی نعیمہ ناز کی صورت سامنے موجود پائی۔ سویرا سے علی عباس کو بھی اہمیت بخش دی۔ اچھی باتیں کرتا ہے۔ "آسیہ رئیس خان" آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں۔ پڑھنے والے کی سوچوں کا

بقیہ صفحہ نمبر 201

حمیرا شفیع

سفید گلابوں کا سال

''دیکھو، ذرا! ہر نیا سال اپنے ساتھ ایک نیا رنگ لاتا ہے اچھوتا اور انوکھا کلر جو سارا سال ان رہتا ہے۔ تمام برینڈز بھی اپنی پروڈکٹ ڈریسز، جیولری اور میک اپ وغیرہ میں اسی کلر کو ہائی لائٹ کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہی ''کلر آف دی ایئر'' ہوتا ہے اور اس سال کا کلر ریڈش میرون ہے۔''

(اس نے موبائل دوسرے کان پر منتقل کیا)

''سن رہی ہو نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ ریڈش میرون، اور میں نے سوچا ہے کہ ماہی کی مہندی پر میں اسی کلر کا شرارہ بنواؤں گی۔ اب تم بتاؤ کہ سلور پٹی لگواؤں یا پھر گولڈن۔''

''کیا...... گولڈن...... ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ گولڈن ہی خوب اٹھے گی۔ گلے کا ڈیزائن میں نے نیٹ پر دیکھا ہے۔ لمبی پٹی پر گولڈن فینسی بٹنوں کی قطار...... اب تم میرے ساتھ بانو بازار چلنا...... بٹنوں کی وہاں بڑی ورائٹی ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... ڈم ٹرم ہو جائے پھر چلیں گے۔'' (اتنے میں سارا اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے تھام رکھی تھی جس پر دو چائے سے بھرے مگ دھرے تھے۔ وہ ٹرے اس کے سامنے رکھی چھوٹی ٹیبل پر رکھ دیتی ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ایک مگ اٹھاتی ہے اور پھر جلدی سے ایک گھونٹ لیتی ہے۔)

''اف سارا...... اتنی چینی...... کیا بھول گئیں۔ ہم دونوں تو آج کل ڈائٹ پر ہیں۔''

''کیا...... زارا...... ہیلو...... اچھا تو تمہاری کوئی کال آرہی ہے او کے...... پھر بات کریں گے۔''

''تم کیا کہہ رہی تھیں زارا سے کر ماہی کی مہندی پر ریڈش میرون شرارہ بنواؤں گی۔'' سارا کارپٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کچھ خفگی سے کہنے لگی۔

''ہم سب لڑکیاں تو مونگیا رنگ کے بنوا رہی ہیں۔ تم نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ضرور بنانی ہے۔ اماں نے تو روبی آنٹی کو آرڈر بھی دے دیا ہے کہ مونگیا سلک کا ایک تھان بھجوا دے۔''

''اف مونگیا...... یہ تو آوٹ آف فیشن ہو چکا ہے۔''

''شاید دو ہزار بائیس (2022ء) کا تھا یہ کلر، اس سال تو ریڈش میرون......''

''بس کر دو دیا حد ہوتی ہے کوئی۔ مہندی پر ہرے اور پیلے ہی پہنے جاتے ہیں۔ اب تم اماں کا علیحدہ سے خرچا نہ کرواؤ۔''

''خرچے کی تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس اپنی پاکٹ منی رکھی ہے۔ اسی سے کپڑا خرید لوں گی۔ جیولری اور گولڈن سینڈل میرے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ گولڈن پراندہ میں زارا کا مانگ لوں گی۔''

سارا سمجھ گئی کہ وہ پکا پروگرام بنا کر بیٹھی ہے۔ پھر جو وہ سوچ لے وہی کر کے دم لیتی ہے۔ اس لیے اس نے مزید بحث کا ارادہ ترک کر کے چپ چاپ اپنا مگ اٹھایا اور چائے پینے لگی۔

☆☆☆

ٹی وی لاؤنج میں سامان بکھرا پڑا تھا۔ دو سوٹ کیس بھی کھلے ہوئے تھے۔ سلائی مشین کے سامنے بیزار سی ماہی بیٹھی تھی۔ عالیہ بیگم نے اپنے چشمے کا زاویہ درست کیا اور کپڑے کو غور سے دیکھا۔

''بیٹا......؟؟ یہ تم نے سلائی لگائی ہے۔ اتنی ٹیڑھی میڑھی چلوادھیڑ کر دوبارہ لگاؤ۔'' وہ کچھ ڈپٹ کر بولیں۔

''کیا ہے اماں.... ! مجھے سمجھ نہیں آرہا جب آپ مجھے ڈھیر ساری ریڈی میڈ بیڈ شیٹ دے رہی ہیں جن



کے ساتھ سلے سلائے تکیے بھی موجود ہیں تو پھر یہ اضافی کور کیوں بنوا رہی ہیں؟"

"دیکھو ماہی! گھر میں کتنے تکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری نانی اماں نے مجھے جو جہیز میں دیے تھے وہ ابھی تک چل رہے ہیں۔ پھر تمہارے سسرال میں تو مہمان داری بھی بہت رہتی ہے، ویسے بھی ہاتھ سے سلائی کیے ہوئے کور زیادہ نفیس اور پائیدار ہوتے ہیں۔ یہ بازار والے تو کچی سلائیاں لگاتے ہیں پھر جلدی ادھڑ جاتے ہیں۔ چلو شاباش مشین چلاؤ۔"

ماہی نے ذرا زیادہ ہی جارحانہ انداز میں مشین چلائی تو مشین ایک دم سے چلتے ہوئے رک گئی۔ ساتھ ہی کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

"شاید سوئی ٹوٹ گئی ہے۔"

"تم سے نہیں ہوگا یہ ...... چھوڑو اسے، میں کرلیتی ہوں۔ تم کچن میں جاؤ، پالک صاف کی ہوئی رکھی ہے۔ اسے باریک کاٹو۔" انہوں نے مشین اپنی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ تائی جی! اس بیچاری سے پالک کٹوا رہی ہیں۔ اس کا تو سبز پانی اس کے ناخنوں میں گھس جائے گا۔ ابھی پرسوں ہی تو اس نے مینی کیور کروایا تھا۔" دیا نے اندر آتے ہوئے سنا تو تڑپ اٹھی۔

"لو جی! ایک تو یہ پہلے ہی اتنی کام چور ہے۔ اوپر سے اس کے حمایتی بہت ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ کچھ پکانا ریندھنا سیکھ لے۔" وہ کچھ خفگی سے بولیں۔

"آتا تو ہے اس کو پکانا ریندھنا...... آخر کو کُکنگ کورس کر تو رکھا ہے اس نے......" دیا کو بروقت یاد آیا۔

"وہ رنگ برنگی ڈشز اور مہنگے کھانے...... ہر روز گھروں میں کہاں پکتے ہیں۔ دال سبزی بنانا تو سیکھے پہلے۔ اب کیا سسرال والے کیک کے ساتھ روٹی کھائیں گے۔"

اس بات پر دونوں کھی کھی کرنے لگیں۔ انہوں نے گھور کر دیکھا تو ماہی دیا کو لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ میری شادی نہیں ہو رہی بلکہ مجھے سولی چڑھایا جا رہا ہے۔ اماں مجھے ہر کا کام سکھانے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب میرا ننھا سا دماغ ہے۔ بھلا اس میں اتنا کچھ کیسے ٹھونسوں۔" ماہی سخت بےزار تھی۔

"لڑکے کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ ان کی ایسی کوئی مشکلات نہیں ہوتیں انہیں تو کچھ بھی سیکھنا نہیں پڑتا۔" ماہی نے پرات اور چھری اٹھائی۔

"بس وہ اچھا شوہر بنا سیکھ لیں۔ یہی بہت ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ حسان بھائی ان شاء اللہ بہت اچھے شوہر ثابت ہوں گے۔" دیا نے چھری اور پرات اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شرارت سے کہا تو ماہی بری طرح سے جھینپ گئی۔

☆☆☆

سارے ضروری کام نمٹا کر وہ رات گئے گھر آیا تو ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ بھوک زوروں کی لگی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن کی جانب چلا آیا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ بتی جل رہی تھی۔ اس نے ذرا سا دھکا دے کر دروازہ پورا کھولا تو ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ بوکھلا کر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ سامنے زینی گھٹنوں کے بل گری پڑی تھی۔

وہ شاید دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ جھٹکا لگنے پر لڑھک گئی۔ "اف...... سوری......" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "تم اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں؟" اس کی کوفت مزید بڑھ گئی۔

"کھانا گرم کرنے آئی تھی۔" وہ شرمندہ سی اٹھ کر جلدی سے دیگچی سے پیالے میں سالن نکالنے لگی۔ پھر اس نے باؤل اوون میں رکھ کر سوئچ دبایا۔

"کیا تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ بھوک کی بہت کچی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ کھانے پینے کی شوقین بھی رہی تھی۔ سونے پہ سہاگہ کچن کی زیادہ تر ذمہ داری بھی اسے ہی سونپ دی گئی تھی۔ اور اس کا صحت مند وجود اب مائل بہ خرابی تھا۔ مگر پروا کس کو تھی اب بھی اس نے چن کر دو لیگ پیس پلیٹ میں نکالے تھے۔

''میں نے تو ماں کے ساتھ ہی کھا لیا تھا یہ تو آپ کے لیے گرم کر رہی ہوں۔''
''میرے لیے کیوں؟ میں خود کر لیتا۔'' اسے اپنی پہلے والی سوچ پر تھوڑی شرمندگی ہوئی۔
''ماں بتا رہی تھیں کہ آپ کو اوون چلانا نہیں آتا۔''
''تو یہ گیس والا چولہا جو ہے۔''
''گیس اس وقت کہاں آتی ہے؟'' وہ اس کی بے خبری پر ہنسی۔
پھر اس نے روٹیاں اور سالن کی پلیٹ سامنے ٹیبل پر دھری اور چائے بنانے کے لیے پتیلا اٹھایا۔
''رہنے دو......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ ''میں چائے نہیں پیوں گا۔ ورنہ نیند نہیں آئے گی۔''
''اچھا......تو پھر یہ کھا لیجیے گا۔'' اس نے کیبنٹ سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کا ڈھکن ہٹایا۔ اندر بیسن کی مٹھائی موجود تھی۔ ''ماں نے بنائی ہے۔'' اس نے ڈبا اس کے پاس رکھا اور پھر اس میں سے ایک بڑا سا پیس اٹھایا اور کھاتے ہوئے باہر نکل گئی۔
''اس لڑکی کا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے کھانا کھاتے ہوئے سر دائیں بائیں گھمایا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد اس نے برتن سمیٹے کچن کا دروازہ بند کیا۔ ابا جان کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے ان کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ جاگ رہے تھے۔ ''ابا جان۔'' اس نے ہلکے سے دروازہ بجایا۔
''آؤ ولی!'' وہ اندر داخل ہوا۔ ''آپ سوئے نہیں ابھی تک؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔
''ہاں ٹھیک ہے......! تم بتاؤ منشی سے بات ہوئی تمہاری؟''
''جی ہاں...... آج بات ہوئی تھی کچھ گاہک لگے تو ہیں اس کے مگر وہ دام کم دے رہے ہیں۔''
''میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد زمین بک جائے تا کہ ہم وہ چوہدری اشفاق والی کوٹھی خرید لیں۔ اچھے علاقے میں جائیں گے تو شاید لڑکیوں کا بھی کوئی اچھا سبب بن جائے۔'' ان کا لہجہ فکرمند سا تھا۔
''آپ فکر نہ کریں ابا......! زمین اچھے داموں بک جائے تو گھر بھی خرید لیں گے۔ میری بات ہوئی تھی چوہدری اشفاق کے سکریٹری سے فی الحال تو وہ اپنے بیٹے کے پاس یو کے گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی پر بیعانے کی رقم تو ہم ادا کر دیں گے۔ باقی کا بھی ان شاء اللہ انتظام ہو جائے گا۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔
''ہاں ان شاء اللہ! اب تم جا کر آرام کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔'' وہ تھکا ہارا تھا کمرے میں آتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ مگر نیند کی دیوی بڑی دیر بعد مہربان ہوئی۔

☆☆☆

ماہی کی شادی کی تیاریاں خوب جوش و خروش سے ہو رہی تھیں۔ گھر کی پہلی شادی تھی خوب ارمان نکالے جا رہے تھے۔ لڑکیوں نے مہندی کے لیے مونگیا شرارے سلنے دیے تھے مگر دیا بڑے سکون سے پھر رہی تھی۔
''بھئی میری کوئی فکر نہ کرے۔ میں نے آن لائن ریڈش میرون شرارہ آرڈر کر دیا ہے۔ بڑا دیدہ زیب ہے۔ بس کرتی کا گلا کچھ سادہ ہے۔ وہاں میں بٹن لگا لوں گی۔''
''باقی چیزیں بھی آن لائن آرڈر کر دو۔'' سارا کا منہ پھولا ہوا تھا۔
''نہیں! وہ میں مڈٹرم کے بعد زارا کے ساتھ بانو بازار جا کر خرید لوں گی۔'' انداز خاصا لاپروا تھا۔ سارا مزید جل بھن گئی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ ساری فضا پر دھند کا راج تھا۔ آسمان پر سفید دھوئیں کی چادر تنی تھی۔ دوپہر میں مطلع کچھ صاف ہوتا شام میں پھر سب کچھ دھواں دھواں ہو جاتا۔ حکومت نے ملک میں فوگ ایمرجنسی

نافذ کردی۔ تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ دیا کے مڈٹرم بھی کینسل ہو گئے۔ جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو روزمرہ کی سرگرمیاں بحال ہوئیں۔

دیا کے امتحانات کا نیا شیڈول بنا۔ جب وہ امتحانات سے فارغ ہوئی تو ماہی کی شادی سر پر کھڑی تھی۔ تمام لڑکیاں تو اپنی شاپنگ کر کے فارغ ہو چکی تھیں مگر اس کی تو کوئی تیاری ہی نہیں تھی۔

اب حال یہ تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ اس نے جھٹ زارا کو فون کھڑکایا۔

”زارا! آج ہی بازار چلتے ہیں۔ ہم بہت لیٹ ہو چکے ہیں۔“

☆☆☆

رکشہ کر کے دونوں بانو بازار پہنچیں۔ بے تحاشا رش تھا۔ اتنی شدید گرمی کے بعد خدا خدا کر کے تو کچھ موسم ٹھنڈا ہوا تھا۔ اس لیے کب کی رکی شادیاں بھی دھڑا دھڑ ہو رہی تھیں، کپڑے، جیولری اور جوتوں کی دکانوں پر تو عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم جمع تھا۔ اس بازار میں نسبتاً سستے داموں چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ اس لیے یہاں ہمیشہ ہی رش کا کم و بیش یہی عالم ہوتا تھا۔

دونوں کا ارادہ تو تھا کہ جیولری تو ڈھیر ساری رکھی ہے وہ نہیں خریدنا ایک جگہ جیولری آئٹمز کا اسٹال لگا تھا۔ دیا جھٹ گولڈن جھمکوں پر فدا ہو گئی اور زارا نے دو کنگن خرید لیے۔ کچھ مزید اضافی چیزیں خریدنے کے بعد دونوں کو خیال آیا کہ اصل میں جس چیز کی خریداری کے لیے وہ دونوں بازار آئی تھیں تو وہ بھول ہی گئیں۔ ”ہائے اللہ زارا! میرے فینسی بٹن تو رہ ہی گئے۔“

”اب ”شاہین دھاگہ بٹن“ تو شاید بہت پیچھے ہے۔“ دونوں واپس پلٹیں۔ دکان پر آج کوئی نیا شخص کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔

دونوں نے شوکیس میں سجے بٹن پسند کرنے شروع کیے۔

”ذرا یہ تو نکال دیں۔“ دیا نے جگمگ جگمگ کرتے گولڈن بٹنوں کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھیں جی وہ...... دیکھیں...... یہ دکان میرے دوست کی ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے مجھے کھڑا کر کے گھر ضروری کام سے گیا ہے۔

آپ بعد میں تشریف لے آئیے گا جی“ سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس ایک لمبا سا لڑکا شائستگی سے معذرت کرنے لگا۔

”کیا بعد میں......؟“ دیا نے تیوری چڑھائی۔

”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ ابھی دے دیں۔“

”وہ جی دراصل وہ دوسرا مددگار لڑکا بھی موجود نہیں ہے۔“ وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔ دیا کو تپ چڑھی۔

”مسٹر ہم کون سا مفت لے رہے ہیں جو آپ یوں آنا کانی کر رہے ہیں۔“

”مگر مجھے قیمت کا بھی اندازہ نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”مگر ہمیں تو ہے۔ اگر آپ کو نہیں ہے تو اپنے دوست سے فون پر پوچھ لیں۔“ دونوں نے اس کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر بٹن خرید کر ہی دم لیا۔

☆☆☆

دونوں دکان کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں جب زن سے ایک موٹر سائیکل ان کے بالکل پاس سے گزری۔ اس پر بیٹھے دو لڑکوں میں سے پیچھے والے نے دیا کی کلائی پر کچھ چبھویا۔ بس ایک لمحہ لگا اور وہ اس کا بریسلیٹ کسی چیز سے کاٹ کر یہ جا وہ جا۔ دونوں ہراساں سی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

”ہائے زارا میرا بریسلٹ“ دیا نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ وہ اس کی ایک عزیز ترین دوست نے گفٹ دیا تھا جو اب بیرون ملک شفٹ ہو گئی تھی۔

”ہائے اللہ! تمہاری کلائی سے تو خون نکل رہا ہے۔“ زارا نے گھبرا کر اپنا دوپٹا اس کی کلائی پر لپیٹنا شروع کر دیا۔

”کیا ہوا...... کیا ہوا......؟“ اب وہ کاؤنٹر والا لڑکا بھی تیزی سے ان کے پاس آیا۔ دیا تو مسلسل روئے جا رہی تھی۔ کچھ اور دکاندار بھی جمع ہو گئے۔

”پولیس میں رپورٹ درج کروانی چاہیے۔“

"آج کل اسٹریٹ کرائم کس قدر بڑھ گئے ہیں۔"

"عورتوں کو زیورات وغیرہ پہن کر گھر سے ہی نہیں نکلنا چاہیے۔"

بھانت بھانت کی آواز میں رنگ برنگے مشورے، اب ان دونوں کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ ہجوم دیکھ کر موٹر سائیکل پر ایک پولیس والا بھی وہیں آ پہنچا۔ لوگوں کے بتانے پر آگے بڑھ کر دونوں سے کہنے لگا۔

"بی بی آپ تھانے چل کر رپورٹ درج کروائیں۔"

"یہ کیوں تھانے جائیں۔ آپ یہیں ان کی رپورٹ درج کریں بلکہ ابھی پیچھے جائیں وہ لڑکے یہیں کہیں گھوم رہے ہوں گے۔" کاؤنٹر والا لڑکا ناراضی سے پولیس والے سے کہنے لگا کچھ اور لوگ بھی اس کی حمایت کرنے لگے۔ دونوں کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"اچھا، میں آن لائن ہی رپورٹ درج کر لیتا ہوں۔ آپ اپنے گھر میں سے کسی کا نمبر دے دیں تاکہ آپ کو اطلاع کی جا سکے۔"

دیا کے تو حواس جواب دے چکے تھے۔ زارا نے ہی اس کے چھوٹے بھائی فرحان کا نمبر لکھوا دیا۔ ذرا ہجوم منتشر ہوا تو وہ بھی جانے لگیں۔ دیا کی کلائی سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ زارا نے مضبوطی سے اپنے دوپٹے کا پلو اس کے اردگرد لپیٹ رکھا تھا۔

"ارے ان کی طبی امداد کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ آپ اندر تشریف رکھیں میں قریب ہی سے ایک میڈیکل اسٹور والے کو بلا لاتا ہوں۔"

زارا نے ممنون نظروں سے دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک لڑکے کو ہمراہ لیے پلٹ آیا۔ اس لڑکے نے دیا کے بازو کی مرہم پٹی کی۔ دیا تو چپ چاپ سسکیاں بھرتی رہی۔ زارا نے ہی اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے وہیں سے ان دونوں کو رکشہ کروا دیا اور وہ دونوں اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

کئی روز تک وہ دونوں یہ واقعہ یاد کر کے ہراساں ہوتی رہیں۔ دیا کی نظر جب اپنی سونی کلائی پر پڑتی تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ مائرہ نے کتنے پیار سے جاتے وقت وہ بریسلیٹ اس کی کلائی میں پہنایا تھا۔ اب وہ کہاں سے ملے گا۔"

وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی اپنی کرتی کو بٹن لگا رہی تھی جب قریب ہی موبائل بجنے کی آواز آئی۔ فرحان اپنا موبائل چارجر پر لگا کر خود اکیڈمی چلا گیا تھا۔ پہلے تو اس نے کال کاٹ دی مگر جب دوسری اور تیسری بار بھی فون بجتا رہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ فرحان اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے دوست اسے آپی کہا کرتے تھے۔ اس نے سوچا کہ کسی کو بے حد ضروری کام نہ ہو۔ دوبارہ فون بجا تو اس نے اٹھایا۔

"ہیلو کون؟" اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... جی...... میں شاہین دھاگہ بٹن" سے بات کر رہا ہوں۔"

"جی کیا "شاہین دھاگہ بٹن؟" وہ گم صم سی ہو گئی۔ بے اختیار آنکھوں کے سامنے سرمئی کپڑوں والے لڑکے کا سراپا گھوم گیا۔

"جی فرمایئے؟" اس نے روکھے سے لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی...... اس دن آپ کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا پولیس والے نے آن لائن رپورٹ درج کی تھی۔ ایک کاپی میرے پاس بھی تھی۔ ان لوگوں نے تو اس معاملے میں شاید کچھ نہیں کیا مگر مارکیٹ والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت چند آوارہ اور مشکوک لڑکوں کو پکڑا ہے جو شاپنگ کے لیے آنے والی لڑکیوں سے پرس اور جیولری، موبائل، وغیرہ چھین لیتے ہیں۔

ان سے مال وغیرہ تو کچھ نہیں ملا۔ ہاں البتہ کچھ رقم ضرور برآمد ہوئی ہے وہ مارکیٹ یونین کے صدر کے پاس ہے۔ آپ بھی اپنا نقصان بتا دیں ساری رقم تو نہیں بہرحال آدھی پونی شاید مل ہی جائے گی۔"

بریسلیٹ نہ ملنے کا سن کر اس کا دل ایک بار پھر دکھ سے بھر گیا۔

"وہ شاید بہت مہنگا تھا، گولڈ وغیرہ کا...... میں نے کہا تو ہے کہ ساری قیمت تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ تو

آپ کو مل ہی جائے گا۔" وہ اس کی خاموشی سے کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔

"جی وہ اتنا قیمتی نہیں تھا...... گولڈ کا بھی نہیں تھا۔ آرٹی فیشنل تھا۔ شاید دو تین ہزار کا......" وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا کہا...... آرٹی فیشنل ...... صرف دو تین ہزار کا......" وہ حیرت سے چیخ اٹھا۔

"اس سستے سے بریسلیٹ کے لیے آپ نے اس دن بازار میں اتنا ہنگامہ کھڑا کیے رکھا تھا۔ میں نے ایویں اتنی بھاگ دوڑ کی۔" وہ مایوسی کی حد پر تھا۔

اس کے ان خیالات پر وہ بھڑک اٹھی۔

"مسٹر! کیا سمجھتے ہیں آپ کہ صرف سونے چاندی سے بنی چیزیں قیمتی ہوتی ہیں۔ خلوص، وفا اور محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی وہ کسی کا دیا ہوا تحفہ تھا جو مجھے سونے سے بھی زیادہ قیمتی لگتا تھا۔ پھر میں نے کب آپ کی منتیں کی تھیں کہ آپ بھاگ دوڑ کریں۔ نہ کرتے......" اس نے بڑے خراب موڈ کے ساتھ فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ولی کا آج سارا دن بھاگم دوڑی میں گزرا تھا۔ زرعی زمین کا اچانک ایک اچھا گاہک مل گیا تھا۔ منشی کی مدد سے اس نے کاغذی کارروائی مکمل کی۔ اب چند روز تک ان کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ٹرانسفر ہوتی کہ وہ چوہدری اشفاق والی کوٹھی خرید لیتے۔ اس نے فارغ ہو کر گھر اطلاع دی تو زیبی کا جھٹ میسج آ گیا۔

"ماموں جان کہہ رہے ہیں کہ مٹھائی لیتے آئیے گا۔"

"وہ سمجھ گیا کہ یہ ماموں سے زیادہ ان کی بھانجی کی فرمائش ہے۔"

بہر حال وہ مٹھائی لے کر ہی گھر گیا۔ کچن سے پکوڑے تلنے کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی۔

"میں نے سوچا میٹھے کے ساتھ کچھ نمکین بھی ہو جائے۔" زیبی کا مسکراتا ہوا چہرا برآمد ہوا۔

"اتنا کھا کھا کر ڈھولو بھولو بن گئی ہو تم۔ رانیہ ثانیہ آپی کو دیکھا ہے کتنا کم کھاتی ہیں؟"

"وہ تو ڈائٹ پر رہتی ہیں ہر وقت۔ اپنے رشتوں کی ٹینشن جو ہے انہیں جبکہ میرا ایسا کوئی ایشو نہیں ہے۔" اس نے پکوڑوں کی پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

"کیوں کیا تم پیا دیس نہیں سدھارو گی۔ یونہی ہمارے سینوں پر مونگ دلتی رہو گی۔" اس نے چھیڑا۔

"میری بیوی آ کر تمہیں نکال باہر کرے گی۔" اس نے ڈرایا۔

"جاؤ منہ دھو کر رکھو۔ تمہاری بیوی کی تو ایسی کی تیسی۔" اس نے آستین چڑھائیں۔

"نہ بابا نہ وہ بے چاری واقعی تمہارا مقابلہ نہیں کر پائے گی۔" اس نے اس کے صحت مند وجود کو دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

ماہی کی شادی قریب ہی تھی مگر تیاریاں ابھی بھی آدھی ادھوری تھیں۔ سب ہی مصروف تھے۔ دیا مہندی کے ڈیزائن سرچ کر رہی تھی جب اماں چلی آئیں۔ "دیا ذرا! میرے ساتھ مسز قریشی کے ہاں تو چلو۔"

"وہ کیوں اماں......؟"

انہوں نے ہمارے پیچھے جو سفید کوٹھی ہے نا چوہدری اشفاق والی وہ خریدی ہے۔ اور آج اس کے گھر میں محفل میلاد ہے۔"

"مگر اماں مجھے تو آج بہت کچھ کرنا ہے۔"

"مجھے پتا ہے تم نے آج کچھ بھی نہیں کرنا سوائے اس موئے موبائل کو کھنگالنے کے۔"

"اماں پلیز سارا کو لے جائیں۔"

"اس نے سر میں تیل ڈال رکھا ہے۔ شام میں نہائے گی۔"

"تم چلو ہم ایک گھنٹے میں آ جائیں گے۔"

پھر اس کی نہ نہ کی پروا کیے بغیر اماں نے اسے تیار کروا کر ہی دم لیا۔

"اماں ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔"

"ہاں تو انہوں نے نو بجے ہی بلایا ہے۔ وہاں جا کر سپارہ بھی پڑھنا ہے۔ سخت بری لگتی ہیں مجھے وہ عورتیں جو عین کھانے کے وقت پہنچ جاتی ہیں۔"

☆☆☆

سفید دودھیا کوٹھی بڑی شان سے کھڑی تھی۔

سفید درودیوار پر کالا حاشیہ اس کی سجاوٹ کو مزید بڑھا رہا تھا۔ جہازی سائز گیٹ پر سفید اور سیاہ دھاریاں تھیں۔ ”ہائے اللہ! اماں کاش ہم خرید لیتے۔“ دیا دیکھ کر سحر زدہ سی رہ گئی۔

”کروڑوں کی ہے۔ تمہارے باوا کے پاس ہیں اتنے پیسے۔ جنہوں نے خریدی ہے۔ اللہ ان کے نصیب میں کرے۔“

دونوں اندر داخل ہوئیں تو وسیع و عریض لان پر دریاں بچھی تھیں، ساری فضا خوشبوؤں سے معطر سی تھی۔ اکا دکا ملازم ادھر ادھر کاموں میں مصروف تھے۔

”اماں میں نے کہاں تھا نا کہ ابھی کوئی بھی نہیں آیا ہوگا۔“ وہ کوفت سے بولی۔

وہ مزید آگے بڑھیں تو ایک ملازمہ جھٹ ان کے استقبال کو لپک کر آئی۔ اندرونی حصے سے سفید چکن کاری کے قمیض شلوار میں ملبوس سوبر سی مسز قریشی بھی چلی آئیں۔ بے حد تپاک سے ملیں۔ دیا نے ایک سپارہ اٹھایا اور دری پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھلا اور آنے والا اپنی جھونک میں اندر داخل ہوا کر بلند آواز سے چلایا۔

”فضلو! یہ دستر خوان کچن میں لے جاؤ۔“

دیا نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا آنے والے سے نظریں ٹکرائیں اور پھر دونوں اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ وہ شاہین دھاگہ بٹن“ والا لڑکا گیٹ کے عین بیچوں بیچ بت بنا کھڑا تھا۔ سفید شیفون کے دوپٹے میں وہ سنہری رنگت والی غصیلی سی لڑکی آنکھوں میں بے پناہ حیرت لیے اسے تک رہی تھی۔ اس کے بریسلیٹ کے نہ ملنے کا دکھ اسے کئی دن ستاتا رہا تھا۔

اس دن بازار میں سسکیاں بھرتی ہوئی وہ لڑکی اور اب ہل ہل کر سپارہ پڑھتی ہوئی کتنی مقدس اور پاکیزہ دکھ رہی تھی۔ منظر آنکھوں میں کھب سا گیا۔

”ولی! گلاب کی پتیاں بھی لے آؤ۔“ اچانک زیبی باہر آتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ دیا کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

☆☆☆

ماہی کی آج مہندی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ روشنی اور رنگوں کی برسات اتری ہوئی تھی۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ لڑکیاں تیار ہو کر تائی جی کے پورشن کی جانب جا رہی تھیں۔

ہاتھوں پر گجرے لپیٹتی اندر داخل ہوئی تو دیا شرارہ زیب تن کیے خود کو گھوم گھوم کر ڈریسنگ ٹیبل میں دیکھ رہی تھی۔

”واؤ! دیا! کتنی پیاری لگ رہی ہو۔“ سارہ نے بہن کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

”دیکھا! میں نے کہا تھا نا کہ یہ کلر بہت اٹھتا ہے۔ اب سارا سال یہی کلر خوب ان رہے گا۔“

”اچھا بابا! اب تم ماڈلنگ بند کرو اور جلدی چلو ماہی کے میسج آ رہے ہیں۔“

جس وقت وہ دونوں تایا جی کے گھر کے عین سامنے پہنچیں۔ اسی وقت ایک سفید گاڑی بھی ان کے پاس آ رکی۔ مسز قریشی اور ان کی بیٹیاں باہر نکل رہی تھیں۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ولی سحر زدہ سا سامنے سے آنے والی اس میرون لباس والی پری کو دیکھ رہا تھا جس کی آج سج دھج ہی نرالی تھی۔ اندر خانے کہیں وہ اس کی دید کی آس میں ہی یہاں آیا تھا حالانکہ زیبی نے کہا بھی تھا کہ پچھلی گلی میں تو گھر ہے، ہم پیدل ہی چلے جائیں گے۔ مگر اس نے ڈپٹ دیا تھا۔ ”اب اتنا تیار ہو کر یوں جاتے اچھے تو نہیں لگو گے۔“

دیا نے اس بے شرم کو اتنی فرصت سے خود کو تکتا پا کر جلدی سے اپنے باریک آنچل سے اپنا چاند چہرا چھپا لیا۔ اس کی اس معصوم ادا پر ولی نے فریفتہ ہو کر نظریں پھیر لیں۔ ان لوگوں سے ٹکراؤ عین دروازے پر ہوا تھا۔ اس لیے اخلاقاً ان دونوں کو رسمی سلام دعا بھی کرنی پڑی۔ دیا اس دن محفل میلاد پر مسز قریشی کی دونوں بیٹیوں سے ملی تھی کچھ ریزرو سی تھیں ہاں البتہ گول مٹول سی بھانجی خوب چہک رہی تھی۔

☆☆☆

یہ گھر قریشی صاحب اور ان کی فیملی کے لیے

واقعی بابرکت ثابت ہوا تھا۔ رانیہ اور ثانیہ کی رشتوں کا کب سے اٹکا ہوا معاملہ حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ آج رشتے والی ایک معقول رشتہ لائی تھی۔ رشتہ ایک ہی گھرانے کے دو بھائیوں کا تھا جن کی والدہ ماجدہ دو بہنوں کو بہوویں بنانے کی متمنی تھیں تاکہ بیٹوں میں آئندہ بھی سلوک اتفاق رہے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ کاروبار بھی پھلتا پھولتا ہوا تھا۔

''لڑکے والوں کے تاثرات تو حوصلہ افزا ہی لگ رہے تھے۔ لگتا ہے کہ اس بار رانیہ اور ثانیہ آپیوں کی بیل منڈھ ہی جائے گی۔''

مہمانوں کے جانے کے بعد زیبی کچن سمیٹتے ہوئے ولی سے کہہ رہی تھی۔

''اور ہاں ان کے بعد تم بھی اپنی تیاری پکڑو۔'' ولی نے الٹی میٹم دیا۔

''ہرگز نہیں! میں نے صاف کہہ دیا ہے ممانی جان سے کہ میں پہلے شیف کا کورس کروں گی۔ اس کے بعد کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جاب کے لیے اپلائی کروں گی۔ شادی فی الحال میرے پلان میں نہیں ہے۔ ہاں البتہ تم اپنی فکر کرو۔ اب تمہاری دلہن ڈھونڈنے نجانے کتنے کوس دور جانا ہوگا۔''

''زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔'' وہ ہولے سے بڑبڑایا مگر زیبی کے تیز کانوں نے فوراً سن لیا۔

''کیا کہا...... زیادہ دور نہیں...... اس کا مطلب ہے کوئی قریب ہی نظر میں ہے۔'' وہ اچھل پڑی۔

''نہیں...... نہیں...... میں تو یونہی مذاق کررہا تھا۔'' اس نے جان چھڑانی چاہی مگر وہ بھی زیبی تھی۔ پیچھے پڑ گئی۔

''بتاؤ نا ولی...... کون ہے؟ دیکھو میں تو تمہاری گوڑی سہیلی ہوں نا۔''

نہ نہ کرنے والی نے بالآخر ہتھیار ڈال لیے۔ ویسے بھی اسے آج کل شدت سے کسی راز داں کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔

''وہ دراصل اس دن تم لوگ پچھلی گلی میں مہندی پر گئے تھے نا۔'' اس نے کان کھجایا۔

''راستے میں دو لڑکیاں ملی تھیں۔'' وہ کچھ ہچکچا کر رکا۔

''ہاں...... ہاں...... میں سمجھ گئی۔''

''ان میں سے ایک بہت پیاری تھی۔ مونگیا شرارے والی...... وہ سارہ ہے۔ کتنی پیاری...... ایک دم لمبی اور گوری چٹی۔ قسم سے تمہارے ساتھ بہت سوٹ کرے گی۔ شکر ہے کہیں تم نے وہ میرون غرارے والی نہیں کہہ دیا۔ بہت مغرور اور نک چڑھی ہے۔ رنگت بھی سانولی سی ہے۔ وہ سارہ تو......''

''زیبی...... پلیز تم میری بھی سن لو......'' اس نے زیبی کی چلتی زبان کو بریک لگایا۔

''میں وہ میرون کپڑوں والی ہی کہہ رہا تھا...... دیا نام ہے اس کا۔'' زیبی کو سخت مایوسی ہوئی۔

''مگر وہ سارا زیادہ پیاری ہے۔''

''میں تو دیا کی بات کررہا ہوں۔'' وہ جھلا کر بولا۔

''مگر سارا تو......''

''زیبی......!!'' وہ دھاڑا...... ''شادی میں نے اس کے ساتھ کرنی ہے یا تم نے۔''

''اچھا ٹھیک ہے...... چلو دیا ہی سہی۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

☆☆☆

بارات کے فنکشن پر رانیہ اور ثانیہ نے تو جانے سے صاف انکار کردیا۔

''ہم نئے آئے ہیں۔ ہماری تو کوئی جان پہچان ہی نہیں ہے۔ اس دن مہندی پر بھی بہت بور ہوئے تھے۔''

مگر زیبی ولی کی خاطر جانے پر تیار ہوگئی۔ اور جاتے جاتے جتانا بھی نہیں بھولی۔

''صرف تمہارے لیے جارہی ہوں تاکہ سارا کے ساتھ راہ و رسم بڑھا سکوں۔''

''سارا نہیں دیا کے ساتھ۔'' وہ بھنا کر بولا۔

☆☆☆

بعض اوقات انسان کو اپنی منزل بہت دور اور منزل تک جانے والا راستہ دشوار ترین لگتا ہے۔ لیکن

اگر جذبے سچے اور نصیب نیک ہوں تو راستے سمٹ جاتے ہیں اور منزل قریب آجاتی ہے۔ ولی اور دیا کے دل کے تار بھی یونہی جڑ گئے مانو صدیوں سے ساتھ ہوں۔ کچھ آسانیاں راہ الفت کے ان ہمراہیوں کو زیبی کی کوششوں سے بھی میسر آئیں۔ رانیہ اور ثانیہ کی شادی کے بعد نمبر ولی کا ہی تھا کیونکہ زیبی سب سے چھوٹی تھی۔

مسز قریشی نے تو دل میں ولی کے لیے زیبی کو بھی سوچا تھا مگر پھر دونوں کی ایک دوسرے میں عدم دلچسپی بھانپ کر ولی کے لیے دلہن تلاش کرنی شروع کردی تھی۔ ولی تو شاید خود سے کبھی بھی نہ کہہ پاتا اس کے حصے کی ساری جدوجہد زیبی نے ہی کی تھی۔ مسز قریشی کو دیا کچھ خاص پسند بھی نہیں تھی۔ بہر حال وہ جاکر رشتہ ڈال آئی تھیں اور وہاں سے بھی کچھ وقت مانگا گیا تھا۔

☆☆☆

وقت کی جھولی میں ماہ سال کا ایک اور سکہ گرنے جارہا تھا۔ ایک نئے سال کی آمد آمد تھی۔ نیا سال...... جو اپنے دامن میں نجانے کس کے لیے خوشیاں...... اور کس کے لیے اداسیاں لانے والا تھا؟ ہر ایک کی امنگیں، خواہشات اور توقعات مختلف تھیں۔

دیا کی طرف سے ولی کو نئے سال کی خوشی میں ایک کارڈ واٹس ایپ کیا گیا تھا۔ کاسنی رنگ کا کارڈ...... لکھا تھا۔

"یہ سال اپنے ساتھ کاسنی رنگ لایا ہے۔ کاسنی رنگ...... محبت، خلوص اور وفا کے نرم گرم جذبوں کا عکاس ہوتا ہے۔" اس رنگ کو پسند کرنے والے مہربان، شفیق مگر ارادوں میں اٹل ہوتے ہیں۔" کارڈ کے ساتھ کاسنی پھولوں کے گلدستے کی تصویر تھی۔

☆☆☆

نئے سال کی وہ پہلی رات تھی۔ قریشی صاحب نے فرمائش کر کے بیگم سے بیسن کا حلوہ بنوایا۔ رانیہ اور ثانیہ سے فون پر بات کی۔ زیبی کو شیف کا کورس کرنے کے لیے داخلے کی اجازت دی حالانکہ اس سے پہلے وہ چاہتے تھے کہ زیبی ٹیچنگ یا نرسنگ کے پروفیشن کو اپنائے۔

ولی باہر کسی کام میں پھنسا تھا۔ اسے گھر جلد آنے کی تاکید کی۔ پھر اپنی دوا کھا کر سو گئے۔ اگلی صبح جب مقررہ وقت پر بیدار نہ ہوئے تو مسز قریشی نے ان کا کندھا ہلایا۔ ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایمرجنسی میں بلائے گئے پڑوسی ڈاکٹر نے ان کی موت کی تصدیق کردی۔

☆☆☆

سفید کوٹھی کئی دن تک سوگواری اور غم میں ڈوبی رہی۔ پھر زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ مسز قریشی نے اپنی عدت ختم ہونے پر دیا کے گھر والوں سے ایک بار پھر ولی اور دیا کے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے مزید کچھ وقت مانگا حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سوچ وچار کے لیے کافی وقت لے چکے تھے حالانکہ وہ اشاروں کنایوں میں دونوں بچوں کی باہمی دلچسپی کا تذکرہ بھی کرچکی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے زیبی کے لیے بھی سوچنا تھا۔

☆☆☆

"پھر آپ نے دیا اور ولی کے رشتے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ مسز قریشی کا کئی بار فون آچکا ہے۔" اماں نے رات کو ابا سے کہا۔

"بیگم! میں بھی اس معاملے میں کئی روز سے شش وپنج میں پڑا ہوں تم جانتی تو ہو کہ ولی مرحوم قریشی صاحب کا سگا بیٹا تو ہے نہیں ان کی تو صرف دو بیٹیاں ہی ہیں نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ولی کو کسی یتیم خانے سے گود لیا تھا۔ بلاشبہ اپنا بیٹا بنا کر پالا ہے۔

اچھی تعلیم وتربیت کی ہے مگر بیٹا بنانے اور سگا بیٹا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اب قریشی کی وفات کے بعد تو صورت حال زیادہ گھمبیر ہوچکی ہے۔

"ہائے اللہ...... وہ کیسے؟" اماں دہل کر بولیں۔

"اتنے دن سے میں نے اپنے سیکریٹری کو تحقیقات پر لگا رکھا تھا۔ آج اس نے جو رپورٹ دی ہے اس کے مطابق قریشی صاحب کی تمام زمین جائیداد کی مالک ان کی دونوں بیٹیاں اور بیگم ہیں۔ ہاں ایک پلاٹ ان کی بھانجی زیب النسا کے نام بھی ہے مگر ولی کے نام کچھ بھی نہیں ہے۔

قریشی صاحب کی چونکہ اچانک ڈیتھ ہوئی ہے اس لیے شاید انہیں وصیت وغیرہ کا بھی موقع نہیں ملا۔ ہوسکتا ہے کہ اگر زندگی مہلت دیتی تو وہ ولی کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ اب نیتوں کا حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ فی الحال ایسا کچھ ہوا تو نہیں ہے۔ اگر ولی اور دیا کی شادی ہو جاتی ہے تو جس طرح کا ہمارے معاشرے کا چال چلن ہے کہ لوگوں کی تو اپنی سگی اولاد سے نہیں بنتی یہاں تو پھر لے پالک کا معاملہ ہے۔ کسی کھٹ پھٹ کی صورت میں اگر مسز قریشی نے ہاتھ پکڑ کر ولی کو نکال باہر کیا تو پھر دیا کا اس کے ساتھ کیا مستقبل رہ جائے گا؟"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب ولی کی حیثیت تو ان لوگوں کی زمین اور فیکٹری کے کیئر ٹیکر کی سی ہے۔"

ابا کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آتی دیا نے دروازے کے باہر کھڑے ان کا لفظ لفظ سنا اور اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ وہ آج کل کی باشعور اور تعلیم یافتہ حقیقت پسند لڑکی تھی۔ پرانی فلمی ہیروئن کی طرح اتنی جذباتی نہیں تھی کہ علی الاعلان کہہ دیتی کہ میں ولی کے ساتھ جھگی میں بھی رہ لوں گی۔

وہ جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان جن سہولتوں کا عادی ہوتا ہے۔ ان کے بغیر رہنا بہت دشوار لگتا ہے۔ اس نے ولی کے سنگ پر آسائش زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ اس لیے اس نے ولی سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ولی! تم برا نہ ماننا۔ اماں ابا کے تمہارے بارے میں کچھ تحفظات ہیں۔ تم مسز قریشی سے کہو کہ وہ جائیداد کا کچھ حصہ تمہارے نام بھی کر دیں۔"

ولی کو اس قدر سفاک قسم کی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ حیران سا رہ گیا۔

"دیا! میں ان سے یہ بات نہیں کرسکتا۔ کیا یہ کم ہے کہ انہوں نے مجھے ایک یتیم خانے سے اٹھا کر اپنا بیٹا بنا کر پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا۔ باشعور بنایا ورنہ آج میں کہیں ٹین ڈبہ وغیرہ بیچ رہا ہوتا۔ مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے۔ تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس تعلیم بھی ہے۔ ہنر بھی اور تجربہ بھی اور سب سے بڑھ کر اپنے زور بازو پر بھروسا۔ میں خود محنت کروں گا اور تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔"

دیا نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ولی کبھی مسز قریشی سے کچھ نہیں مانگے گا۔ اور اپنی تعلیم اور ہنر کے بل بوتے پر وہ کتنا کما لے گا وہ خوب جانتی تھی۔ محبت اپنی جگہ مگر زمینی حقائق بھی تلخ تھے۔

☆☆☆

ولی اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف تھا جب زیبی چلی آئی۔

"ولی! دیا نے ابھی تک میرے کسی میسج کا ریپلائی ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس نے تو ابھی تک سین ہی نہیں کیا۔ کہیں نمبر تو نہیں بدل دیا۔"

"نہیں وہ خود بدل رہی ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خاموش اور گم صم۔

ولی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دیا سر جھکا کے اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو بار بار کھول اور بند کر رہی تھی۔

"ولی! تم نے اپنے اور میرے لیے کیا کیا ہے.....؟" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔

"میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں سوائے اس کے جو تم نے کہا تھا۔" (اس کا اشارہ مسز قریشی سے حصہ وغیرہ مانگنے کی طرف تھا۔)

"ولی! ہم دونوں نے ایک دوسرے سے محبت

کی تھی۔" وہ چیخ گئی۔
"کی تھی......!" وہ صدمے سے بولا۔
"ہاں شاید کی تھی۔" اب کے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"میں نہیں جانتا تھا کہ تمہاری محبت مشروط ہوگی۔" ولی کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔
"زندگی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ولی!" اس نے ایک بار پھر اسے قائل کرنا چاہا۔
"لالچ اور خود غرضی زندگی کا تقاضا نہیں ہوتے۔"
"تم میرے لفظوں کو غلط معنی پہناتے ہو۔ شاید تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔"
"ایسا تم نے خود کیا ہے دیا!" وہ صدمے سے چور چور تھا۔
"تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو خالی دامن سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔"
"کیا تمہارے نزدیک خلوص، محبت اور وفا کی کوئی قیمت نہیں ہوئی۔" اس نے اسی کے الفاظ اسے یاد دلائے۔
"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔" وہ آج اپنے کہے سے ہی پھیر گئی تھی۔" ولی سمجھ گیا کہ وہ صرف اچھے وقتوں کی ساتھی تھی۔
"تو کیا میں سب کچھ ختم سمجھوں۔" اس نے آخری باری بڑی آس سے پوچھا۔
"ہاں!" اس نے اپنا پرس اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اس نے ڈائری کھولی تو اندر سے بے شمار ننھے ننھے وشنگ کارڈ نکل کر بیڈ پر بکھر گئے۔ مختلف رنگوں کے کارڈ گلابی، نیلے، اسکائی بلیو، زرد، شوخ جامنی، ہلکے اور گہرے سبز، کتنے دیدہ زیب اور خوشنما کارڈ تھے۔ وہ سحر زدہ سا رہ گیا پھر دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔
"چائے لائی ہو؟ زیبی!" وہ بغیر مڑے بولا۔
"زیبی نہیں، میں ہوں، ولی!" ثانیہ بولی۔ وہ آج کل آئی ہوئی تھی۔
اس نے جلد چلے جانا تھا مگر ان دنوں گھر کی فضا اتنی اداس تھی کہ اس نے مزید رکنے کا ارادہ کیا۔
"اوہو! ثانیہ آپی...... آپ......" اس نے سیدھا ہو کر چائے کا مگ اس کے ہاتھ سے تھاما۔
"کیا کر رہے تھے؟" وہ سامنے صوفے پر ٹک گئی۔
"یونہی کتابوں کی الماری کھنگال رہا تھا تو یہ کالی ڈائری ملی ہے اور اس کے اندر سے یہ رنگ برنگے سے کارڈ نکلے ہیں۔ شاید زیبی کے ہیں۔ آخر آپ لڑکیوں کو رنگوں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟" اسے بے اختیار بے وفا کی یاد آئی۔
"ولی! یہ رنگ ہی ہم لڑکیوں کے زندگی ہوتے ہیں۔ یہ رنگ ہی تو ہیں جو ہم اپنے خوابوں میں بھرتی ہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔
"پھر وہ رنگ کچے ثابت ہوتے ہیں۔ جلد اتر جاتے ہیں یا پھیکے پڑ جاتے ہیں۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔
"ہر بار ایسا نہیں ہوتا ولی! کچھ لوگ خود مٹ جاتے ہیں مگر اپنی وفا اور محبت کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔"
"خیر چھوڑیں، یہ ہماری زیبی تو بڑی چھپی رستم نکلی۔ میرا تو خیال تھا کہ اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے ہی دلچسپی ہے مگر اس کا تو شعری ذوق بھی کمال کا ہے۔ کتنے خوب صورت اشعار لکھے ہیں نجانے کس کے ہیں؟"
"ولی! میرے بھائی یہ اس کی اپنی شاعری ہے وہ لکھتی بھی ہے۔" ثانیہ نے انکشاف کیا۔
"کیا واقعی......؟؟" وہ ششدر رہ گیا۔
"امیزنگ...... ونڈرفل۔"
وہ سحر زدہ سا موتیوں کی مانند بکھرے لفظوں کو دیکھ رہا تھا۔
اور ثانیہ سوچ رہی تھی کہ وہ تو شاید زیبی کے

بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا وہ چھوٹی سی تھی جب پھوپھو اپنے میاں کے ہمراہ ایک حادثے میں چل بسیں۔ اماں ایک گلابی سی گڑیا کو لیے ہوئے گھر آئی تھیں۔ ”رانیہ اور جانیہ! یہ تم دونوں کی بہن ہے اور اب یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔“

رانیہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی مگر اسے وہ گول مٹول سی گڑیا بہت بھائی۔ وہ اس کے ساتھ سوتی جاگتی، کھاتی پیتی مگر اتنی انسیت کے باوجود اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ولی کے بارے میں اس کے جذبات کب بدلے۔ اسے تو بڑی دیر سے سمجھ میں آیا۔

پہلی بار اس نے زیبی کو ولی کے لیے روتے تب دیکھا جب وہ ایف ایس سی کے انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گیا۔ پھر تب بھی جب موٹر بائیک سے گر کر اس نے اپنا بازو فریکچر کروالیا۔ پھر جب دیا اور اس کا بریک اپ ہوا تو کتنا روئی اس نے دونوں کو ملانے کے لیے کتنی محنت کی تھی۔

ہر بار وہ اس کے دکھ پر روئی۔ بیوقوف تھی نا اگر کبھی اپنے دکھ پر روئی ہوتی تو شاید اس کے جذبوں کی آنچ ولی تک پہنچ ہی جاتی۔ کئی بار ثانیہ کا خود دل چاہا کہ وہ ولی کو بتائے مگر وہ دیا میں اتنا انولو ہو چکا تھا کہ اسے زیبی کے انمول جذبات کو بے مول کرنا اچھا نہیں لگا۔

اس کی سوچوں سے بے نیاز ولی ابھی بھی کارڈز پڑھ رہا تھا۔

”کتنے خوب صورت لفظ ہیں...... محبت، خلوص، اور وفا سے گندھے...... نجانے کس کے لیے؟“ وہ بڑبڑایا۔

”تمہارے لیے ولی......“ اب کے ثانیہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

☆☆☆

2025 کی حسین صبح تھی۔ خوب صورت سی لکڑی کی میز پر سفید گلابوں کا گلاستہ رکھا تھا۔ سفید رنگ...... امن، آشتی، سکون اور خاموشی کا رنگ۔ صلح جو، ٹھنڈے، دیکھے اور محبت کرنے والوں کا پسندیدہ رنگ، پاکیزگی اور تقدس کی علامت...... سفید رنگ۔

گلدستے کے ساتھ ہی ایک بڑا سا کیک رکھا تھا جو ابھی ابھی بیک کیا گیا تھا کیونکہ اس سے گرم گرم خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھیں۔

زیبی کچن سے پلیٹ اور چھری لیے نکلی اور اس نے اپنے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس نے دلکش سی سفید ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ جس کا بارڈر ہلکا گلابی تھا۔ کانوں، گلے اور ہاتھوں میں سفید موتیوں کا زیور تھا۔ آج اس کی اور ولی کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔

”ولی! اٹھ جائیں پلیز! کیک کاٹیں۔ چاکلیٹ کیک کا گرم گرم کھانے میں ہی مزا ہے۔“ وہ دروازے میں کھڑی ہو کر بولی۔

”یار! بڑی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ بستر سے نکلنے کو دل ہی نہیں کر رہا۔“ وہ ذرا سا کسمسایا۔ پھر کمبل ہٹا کر باہر چلا آیا۔ ٹیبل پر نظر پڑی تو بے اختیار مسکرا اٹھا۔

”زیبی ڈیئر! تمہیں نیا سال اور شادی کی پہلی سالگرہ دونوں مبارک ہو۔“

وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا جو پہلے سے زیادہ صحت مند اور گول مٹول ہو چکی تھی مگر جس کا دل محبت، خلوص، اور وفا سے بھرا تھا۔

”آپ کو بھی۔“ وہ جواباً مسکرا بولی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ ولی نے شرارت سے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

اس نے محجوب سی ہو کر چھری اس کے ہاتھ میں تھمائی اور آنکھ سے ٹی وی لاؤنج کے دروازے کی سمت اشارہ کیا جہاں سے رانیہ اور ثانیہ بھی چلی آ رہی تھیں۔ اس نے شرمندہ ہو کر جلدی سے چھری کی الٹی طرف سے ہی کیک کاٹنا شروع کیا۔ زیبی کی ہنسی چھوٹ پڑی۔

مترنم سی، زندگی سے بھرپور ہنسی۔ رانیہ اور ثانیہ نے اس لمحے دونوں کی ابدی خوشیوں کے لیے دل سے دعا کی۔

☆☆

لبنیٰ آصف

دروازے کھلے رکھو

"السلام علیکم آپی!"

"وعلیکم السلام کیسی ہو عریبہ جیتی رہو خوش رہو گھر میں سب خیریت ہے۔ میاں بچے سب کیسے ہیں۔"

"ہاں آپی! سب خیریت ہے۔ بھائی آئے تھے آج۔"

"اچھا، نوید بھائی آئے تھے۔"

ہاں یہیں قریب، دکان کے کام سے آئے تھے بس تھوڑی دیر ہی بیٹھے جلدی میں تھے۔ دو سوٹ دے کر گئے ہیں کہہ رہے تھے ایک تمہارا ہے اور ایک حمیرا کا ہے، رمضانوں میں سلوا کر پہن لینا تمہاری بھابھی کل ہی لائی تھیں۔

آپی! میں تو اتنا خوش ہوئی بھائی کا شکریہ ادا کیا لیکن ابھی کپڑوں کی تھیلی کھولی تو دل جل جل کر کباب ہوگیا۔"

"کیوں؟ بھئی ایسا کیا ہوگیا جو تم نے دل پر لے لیا۔"

"آپی! خود تو بھابھی ہمیشہ ایک سے ایک کپڑے پہنتی ہیں۔ برانڈز کے اور میرا اور تمہارا سوٹ اتنا عام سا ہے۔ بس رنگ کا فرق ہے پرنٹ ایک ہی ہے۔ لگتا ہے جمعہ بازار سے لیا ہے کپڑا ابھی کچھ خاص نہیں ہے۔ قسم سے آپی، اتنا دل برا ہو رہا ہے کہ دل چاہ رہا ہے کہ بھابھی کو فون کر کے خوب سناؤں کہ خود ایسا پہنتی ہیں جو ہمیں یہ دیا ہے۔"

"عریبہ! یہ غلطی نہ کرنا بھائی سے بنا کر رکھنی



ہے تو بھابھی سے نہ بگاڑو۔"
"آپی! یہ غلطی ہے! یہ خوب کہی تم نے۔"
"ہاں غلطی ہی کرو گی۔ دروازے کھلے رکھو۔"

"کیا مطلب آپی؟"
ارے آج ایسا ہے کل اچھا بھی دیں گی۔ یہ تو میکے کا مان ہوتا ہے آج ایسا دیا ہے کل اچھا بھی دے گا۔
اس مہنگائی کے دور میں بھائی، بھاوج نے ہمارا خیال کیا ہمارے بارے میں سوچا کیا یہ بہت نہیں ہے۔ پہنچا کر بھی گیا ہے۔"
"آپی! سوٹ دینے کا خیال آ ہی گیا تھا تو اچھا دے دیتے۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو عریبہ۔ رشتے زیادہ امپورٹنٹ ہیں نا کہ چیزوں کی کوالٹی۔
خوشی سے رکھو اور بھابھی کو فون کر کے شکریہ بھی ادا کرو۔ بھابھی کو ہلکا سا شبہ بھی نہ ہو کہ تمہیں سوٹ پسند نہیں آیا۔"
"آپی! دل تو نہیں چاہ رہا تم کہہ رہی ہو تو کر لوں گی۔"
"ہاں ضرور کرنا اور میں بھی کروں گی فون بھابھی کو۔"
حمیرا نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

☆☆☆

رمضانوں سے پہلے حمیرا نے اپنا اور عریبہ دونوں کا سوٹ درزن سے سلوایا۔ عریبہ تو بالکل تیار نہ تھی۔
"آپی بے کار سلائی جائے گی تمہیں تو پتا ہے میں اتنے بڑے بڑے پرنٹ نہیں پہنتی۔"
"بس بھائی کے ہاں روزہ کھولنے جائیں گے تو دونوں بہنیں یہی سوٹ پہن کر جائیں گے۔
بعد میں بھلے نہ پہننا۔ کہہ دیا ہے میں نے اب کچھ نہ سنو۔" حمیرا نے ڈپٹ کر چھوٹی بہن کو خاموش کروا دیا۔

بھائی نے روزہ کھولنے کو بلایا تو عریبہ اور حمیرا کو اپنے سوٹ پہنے دیکھ کر بھاوج نے مسکرا کر کہا" تم لوگوں نے سلوا کر پہن بھی لیے۔"
"ارے بھابھی! آج ہی نئے پہن کر آپ کے گھر آئے ہیں۔ رمضان کا جمعہ بھی تھا تو بس نماز بھی پڑھی نئے سوٹ میں۔" حمیرا نے چہک کر جواب دیا۔" میری دیورانی تو کہہ رہی تھی کہ حمیرا بھابھی آپ تو اتنے ڈارک کلر نہیں پہنتیں۔ میں نے تو کہہ دیا میرے بھائی بھاوج نے دیا ہے یہ۔ کلر تھا بھی نہیں میرے پاس۔"
عریبہ حمیرا آپی اور بھاوج کی باتیں سن رہی تھی اور دل میں سوچ بھی رہی تھی کہ آپی بھی ناں اتنی تعریفیں کر رہی ہیں اتنے بے کار سوٹ ہیں۔ میں تو اپنا سوٹ ماسی کو دے دوں گی۔
حمیرا آپی کے گھورنے اور کہنی مارنے پر عریبہ نے بھی ہلکی پھلکی تعریف کر ہی دی سوٹ کی ورنہ گھر لوٹتے آپی خوب سناتیں۔

☆☆☆

ہفتے مہینے سال تو ایسے گزرنے لگے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ شعبان کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں رمضان کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ فون کی بیل ہوئی تو حمیرا فون اٹھا لیا دیکھا تو عریبہ تھی فون پر۔
"سلام آپی!"
"ہاں وعلیکم السلام خیریت صبح صبح۔"
"ہاں آپی! بھائی آئے تھے آج کہہ رہے تھے شام میں دونوں بہنیں چکر لگا لو اور اپنے سوٹ بھی پسند سے لے جاؤ، تمہاری بھابھی نے لے کر رکھے ہیں۔"
میرا تو آپی! بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ بھابھی نے پچھلے سال کی طرح بے کار سوٹ ہی لیے ہوں گے۔ تم چلی جانا اور لے آنا۔"
"کیا ہو گیا ہے تمہیں! جیسا بھی سوٹ ہو

بھائی بھاوج محبت سے دے رہے ہیں۔ یہی بہت ہے اور دونوں ساتھ جائیں، تیار رہنا شام میں۔"

دونوں بہنیں چائے کے وقت پہنچیں۔ بھائی گھر پر تھے۔ دوڑ کر سموسے اور جلیبیاں لے آئے بھاوج نے گرم گرم چائے بنائی۔ میکے کی چائے، سموسے جلیبیاں خوب پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ تینوں بہن بھائی ہنس بول رہے تھے۔ حمیرا بول پڑی۔

"بھائی کتنے عرصے بعد ایسے بیٹھے ہیں۔ کاش وقت تھم جائے۔"

"ارے شیلا! ان لوگوں کو سوٹ تو دکھاؤ۔" بھائی نے بھابھی کو مخاطب کیا۔

"ہاں ابھی لائی" کہہ کر بھابھی کمرے میں چلی گئیں۔

واپس آئیں تو ساتھ بڑا سا تھیلا تھا جس میں ڈھیر سارے سوٹ تھے، پیکنگ کے ساتھ ماڈل پک بھی تھی سب برانڈ کے تھے، بھابھی نے چارپائی پر الٹ دیے۔

عریبہ تو جوڑے دیکھ کر حیرت سے دنگ رہ گئی۔

"بھابھی بتانے لگیں۔" محلے میں ایک عورت کپڑے بیچتی ہے۔ کل آئی تھی تو تمہارے بھائی نے کہا، کپڑے چھوڑ جاؤ میری بہنیں پسند کرلیں پھر لے جانا۔"

"شیلا نے بھی اسی میں سے ایک سوٹ لیا ہے۔"

پچھلے سال شیلا کے بھائی، شیلا کو سوٹ دے کر گئے تو میں نے شیلا کو اتنا خوش دیکھا۔ تو سوچا بہنوں کو بھائی کے تحفے کی کتنی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے بھی اپنی بہنوں کو سوٹ دینے چاہئیں۔

پچھلے سال دکان کا کام بہت ہلکا چلا تو شیلا جتنے پیسے میں نے دیے تھے، قریبی مارکیٹ سے ہی تم دونوں کے سوٹ لے آئی تھی۔ اتنے اچھے تو نہیں تھے مگر تم دونوں کی خوشی دیکھ کر پچھلے سال ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس سال بہت اچھے سوٹ دوں گا۔ تم لوگ سلوا کر پہن کر بھی آئیں تو میرا دل بہت بڑا ہوا کہ میرے تحفے کی میری بہنوں کو اتنی قدر ہے۔ اچھے برانڈ کا سوٹ دوں تاکہ تم لوگ بھی کسی کو فخر سے بتا تو سکو کہ بھائی نے دیا ہے۔ اس سال نیت کی تو اللہ نے اسباب بھی بنائے دکان کا کام بھی اچھا چلا۔"

عریبہ تو رونے لگی۔ حمیرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ بھائی نے دونوں بہنوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور دونوں بہنوں کے دل کا غبار آنسوؤں کے ساتھ بہہ گیا۔ دل صاف ہوئے تو دونوں بہنوں نے دل کی گہرائیوں سے بھائی کی لمبی عمر، میکے کا مان قائم رہنے اور روزی میں برکت کی ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

اتنی ساری دعائیں سن کر بھائی، بھاوج دونوں طمانیت سے مسکرادیے۔

دونوں بہنوں نے سوٹ پسند کیے بہت اچھے سوٹ تھے، بھابھی نے بھی اپنا سوٹ دکھایا۔ جو انہوں نے پسند کیا تھا۔ دونوں بہنیں خوش خوش خدا حافظ کہہ کر گھر کی طرف روانہ ہوئیں۔

راستے میں عریبہ کہنے لگی۔ "آپی، تم صحیح کہتی ہو، دروازے کھلے رکھنے چاہئیں اگر پچھلے سال میں جذباتی ہو کر کچھ کہہ دیتی تو بھائی اور بھابھی کا دل کتنا برا ہوتا۔"

☆☆

نعیمہ ناز

جنوری کی سردی میں

مکمل ناول

اوسط درجے کا دو منزلہ مکان تھا جس کی بیرونی دیوار کو گلابی پھولوں کی بیلیں، ڈھانپے ہوئے تھیں۔

پھولوں اور سبز پتوں سے بھری اس دیوار کے ایک طرف نیلے رنگ کا گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے اندر جائیں تو دائیں طرف سیڑھیاں اوپر کو جاتی ہیں۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ایک مختصر سی جگہ ہے جہاں پھولوں کے گملے رکھے ہیں مگر باقاعدگی سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے یہ پودے مرجھائے مرجھائے سے ہیں۔

قطار میں رکھے گملوں کے ساتھ یہ جو لکڑی کا ایک دروازہ ہے۔ اس سے اندر آئیں تو ایک درمیانہ سا لاؤنج ہے۔ جہاں صوفے اور ڈائننگ ٹیبل ہیں۔ یہاں پھیلاوا اور بے ترتیبی ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کام والی ماسی نے کل چھٹی کی تھی اور آج ابھی تک وہ آئی نہیں تھی۔

دائیں طرف کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کمرے میں دیوار گیر الماری ہے۔ ایک طرف سنگل بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل اور دو نشستوں والا صوفہ ہے۔ سنگھار میز کے ساتھ والی دیوار پہ ایک درجن کے قریب تصاویر لگی ہیں۔ جو صاحب کمرہ منی عرف مانو کی ہیں۔ کچھ بچپن کی، کچھ لڑکپن کی اور کچھ جوانی کی، یعنی حالیہ اور تازہ ترین۔ ایک دو تصاویر فیملی کے ساتھ ہیں۔ جن میں مانو صاحبہ اپنے والدین اور خود سے تین سال بڑے بھائی کے ہمراہ موجود ہیں۔

مانو کو ٹک ٹاک بنانے اور اپنی سیلفیز لینے کا بے حد شوق ہے۔ شکل صورت بہت پیاری ہے۔ نہ بھی ہوتی تو ڈھیروں ڈھیر فلٹرز آخر کس مرض کی دوا ہیں؟

والد صاحب کی سختی کی وجہ سے اپنی ٹک ٹاک اور سیلفیز پبلک نہیں کرتی مگر کزنز اور دوستیں ضرور مستفید ہوتی ہیں۔

مانو کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اداکاری کرنے کا بھی شوق ہے اور اسی شوق کے دوران وہ خوابوں، خیالوں کی دنیا میں سفر کرتے ہوئے ''آسکر'' تک پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی کچھ اسی قسم کے خواب دیکھ رہی تھی۔

ایک روز جب میں بہت مشہور ہو جاؤں گی۔ بہت بڑی سیلیبریٹی بن جاؤں گی۔ میرے انٹرویوز ہوں گے۔ لوگ میرے ساتھ سیلفیز لیں گے اور کہیں گے۔

''مانو...... ایک کپ چائے تو بنا دو۔'' کاشان عرف شانی نے کمرے میں جھانکا۔

''چائے ے ے......'' مانو نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دانت کچکچائے۔ خوابوں کے انڈوں کا ٹوکرا دھڑام سے گر پڑا تھا۔

''ہاں چائے...... اور سنو چائے ہی بنانا۔ جوشاندہ نہیں۔'' حکم دے کر بھائی صاحب چلتے بنے۔

مانو جلتی بھنتی کچن میں آ گئی۔

''کچھ کر سکتی ہیں آج کل کی لڑکیاں یا کچھ بن سکتی ہیں؟ مردوں کی قوم نے انہیں کچن میں گھسا کے رکھا ہے چائے بنا دو، کھانا بنا دو، پھر چائے بنا دو۔''

بڑبڑاتے ہوئے اس نے ساس پین میں چائے کا پانی رکھا اور اس میں چینی پتی جھونک دی۔ اور اپنے خوابوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔



اور جب میں سیلیبریٹی بن جاؤں گی تو اپنے انٹرویوز میں بتاؤں گی کہ میں اپنے بھائی کے لیے چائے بنایا کرتی تھی۔'' مانو نے سوچا اور ابلتی چائے کو دیکھا۔

مگر پتا نہیں، انٹرویوز میں ایسی باتیں کہنی چاہئیں یا نہیں؟'' اپنے خیالات میں غلطاں مانو نے چائے میں دودھ بھی جھونک دیا۔ پھر کیبنٹ سے مگ نکال کر کاؤنٹر پہ رکھا اور اس پہ چھلنی رکھی۔

چائے نکالی اور لاؤنج میں لے گئی۔ جہاں بھائی جان موبائل دیکھتے ہوئے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ لیں۔'' شانی نے موبائل سے نظریں ہٹا کر میز پہ رکھے مگ پہ ڈالیں۔

''یہ چائے ہے؟''

''نہیں جوس ہے۔'' مانو چڑ گئی۔

''نہ چائے لگ رہی ہے نہ جوس۔'' شانی ابھی تک مشکوک انداز میں مگ کو گھور رہا تھا۔

''بغیر ٹیسٹ کیے، بس دیکھ کر پہلے سے پہلے فیصلہ کر لیں۔'' مانو کی چڑچڑاہٹ کا گراف مزید بلند ہوا۔

''چلو ٹیسٹ بھی کر لیتے ہیں۔'' شانی نے مگ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ اس کے چہرے پہ ایسے خوفناک تاثرات آ گئے جیسے اس ماہ کا بجلی کا بل؟ بھرنے کے لیے اس کے ذمے لگا دیا ہو۔

''یہ چائے ہے؟'' ٹیسٹ کرنے کے بعد پھر اس سے اپنا سوال دہرایا۔

''اتنی محنت سے بنائی تھی۔'' مانو منمنائی۔

''تم ہی پیو اپنا یہ کارنامہ۔'' شانی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نخرے دیکھو، توبہ، لڑکیوں سے بھی زیادہ جب پینی نہیں تھی تو اتنی محنت کروانے کی کیا ضرورت تھی۔'' مانو نے کلستے ہوئے شانی کی پشت گھوری۔ پھر چائے کے مگ کو ذرا پیار سے دیکھا۔

''اچھی بھلی چائے ہے۔ اتنی محنت کی ہے تو چلو میں ہی پی لیتی ہوں۔ ورنہ تو پھینکنی پڑے گی۔ رزق ضائع ہوگا۔''

مانو نے مگ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ گھونٹ بھرتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پتی اور چینی کی زیادتی سے کڑواہٹ اور مٹھاس کا ایسا امتزاج تیار ہوا تھا جو بالکل بھی حلق سے اتارنے کے لائق نہیں تھا۔ مانو کی آنکھیں باہر آ گئیں۔ منہ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے ابکائی روکی اور واش بیسن کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آیا اور صحن سے گزر کر اندر کچن میں پہنچ گیا جہاں رامین پتیلی میں کچھ بھون رہی تھی۔ دوپٹہ آگے کی طرف پھیلا کر اوڑھا ہوا تھا۔ بال حسب معمول جوڑے کی شکل میں سمٹے ہوئے تھے۔

''ایک کپ چائے بنا دو۔'' شانی مسمسی شکل بنا کر رامین کو مخاطب کیا۔

''سوری اس وقت بہت بزی ہوں۔'' رامین نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹکا سا جواب دیا اور بدستور بھنائی میں لگی رہی۔

''بنا دے یار! بہن نہیں ہے۔'' شانی کے لہجے میں لجاجت اور چہرے پر مزید مسکینیت چھا گئی۔

ہرگز نہیں، کسی کی بہن وہن نہیں ہوں میں وہ بھی گھڑی گھڑی چائے بنانے کے لیے ویسے بھی تمہاری بالکل سگی بہن اوپر موجود ہے۔ اس سے بنواؤ چائے۔''

رامین کے ہاتھ اور زبان یکساں رفتار سے چل رہے تھے۔ پھر ایک لمحے کو ٹھہر کر اس نے چھوٹے سے تولیے سے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔

''مانو سے ہی بنوائی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جو شاندہ بنا کر پیش کر دیا۔''

''عادت ڈال لو، جو شاندہ پینے کی۔'' رامین نے چولہے کی آنچ ذرا سی اور تیز کی۔

''اچھا اس میں چمچہ میں چلا دیتا ہوں۔ تم چائے بنا دو۔'' شانی نے پیش کش کی۔

''یہ چمچہ تم سے نہیں چلے گا۔ اس کے بجائے تم

چائے بنالو، میں بتا دیتی ہوں۔"

"بتاؤ۔" وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

اگلے پانچ منٹ میں رامین کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چائے چولہے پہ رکھ دی اور ذرا دیر بعد وہ چائے کا مگ اپنے سامنے رکھے اس کی خوشبو اور ذائقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"مانو کو بھی ترکیب بتا دو ایسی چائے بنانے کی۔" اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے رامین کو پروجیکٹ دیا۔

"ذائقہ ترکیب میں نہیں ہوتا، ہاتھ میں ہوتا ہے توجہ اور دھیان میں ہوتا ہے۔"

رامین نے سوجی کو دوسرے برتن میں نکالا۔ گرم گرم سرخ بھنی ہوئی سوجی کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا بنا رہی ہو؟"

"حلوہ۔" رامین نے پتیلی میں گھی گرم ہونے کو رکھا۔

"حلوہ؟" شانی کے چہرے کے تاثرات عجیب ہوئے۔

"ڈرو مت، کھانے والا حلوہ ہے۔ پہننے والا نہیں۔ ویسے بھی تم تو لڑکے ہو، تمہیں کاہے کا ڈر۔" رامین نے گرم گھی میں سبز الائچی ڈالتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"گھر کا ہے یا آرڈر کا؟" شانی نے بڑی امید سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے آرڈر کا ہے۔ گھر کے لیے اتنے بڑے دیگچے میں حلوہ بناؤں گی؟ اور بات سنو، وہ جو تمہارے حاجی صاحب ہیں نا، دو بیویوں والے، انہوں نے اس ہفتے کی پے منٹ نہیں کی ابھی تک اور میں نے سنا ہے۔ انہوں نے سموسے کے ریٹ بڑھا دیے ہیں اپنی دکان پر، مجھ سے تو اسی پرانے ریٹ پر لے رہے ہیں۔"

"اچھا۔ میں شام میں جا کر بات کرتا ہوں۔"

"کون سی شام میں؟ چار بج رہے ہیں۔ ابھی چلے جاؤ۔" رامین نے چاشنی میں چمچہ چلایا۔

"عصر کے بعد ملتے ہیں نا دکان پر۔" شانی نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کپ خالی کیا۔

"گھر کا حلوہ کب بناؤ گی؟"

"جب بناؤں گی، تمہارا حصہ مل جائے گا۔"

"کل بناؤ گی؟"

"کل؟ بہت جلدی ہے حلوہ کھانے کی؟ چچی سے بنوا لو۔"

"بنوایا تھا پچھلے ہفتے، ایسا لگ رہا تھا جیسے لئی پکائی ہے۔"

"شرم کرو، اپنی امی کی برائی کر رہے ہو۔"

"امی اور مانو کا تمہیں معلوم تو ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔

"اچھا نا۔ بنا دوں گی بہت جلد، رونے کی ضرورت نہیں ہے۔" رامین نے مسکراتے ہوئے شیرے میں سوجی اور میوہ ڈالا اور جلدی جلدی چمچہ چلانے لگی۔

☆☆☆

صبح اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ طلوع ہو چکی تھی۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، ان کے لکھنے میں خلل ڈالنے کے بجائے مہمیز کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ آخر سطور لکھ کر انہوں نے قلم رکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

رامین اندر آئی اور اس نے ہاتھ میں پکڑا مگ میز پر رکھا۔

"ددو! آپ کی سبز چائے۔"

"ہوں......" ددو نے بند آنکھیں کھولیں۔

"تھینک یو بیٹا۔"

"افسانہ مکمل ہو گیا؟" رامین نے صفحات اٹھائے۔

"ہاں......ہو گیا۔"

"ددو! آپ بڑی بڑی کہانیاں بھی لکھیں نا۔ کوئی ناول وغیرہ۔"

"یہی ٹھیک ہے بیٹا! اتنی طویل تحریریں لکھنا

میرے بس کی بات نہیں ۔ افسانے لکھنا ہی ٹھیک لگتا ہے۔" ددو نے سبز چائے کا گھونٹ بھرا۔

"اچھا بات سنو ثروت کا فون آیا تھا۔ اتوار کو آئے گی۔"

ثروت ان کی چھوٹی نند تھیں اسلام آباد میں بڑے بیٹے کے ساتھ مقیم تھیں ۔ آج کل چھوٹے بیٹے کے گھر کراچی آئی ہوئی تھیں ۔

"ٹھیک ہے۔" رامین نے میز پہ رکھے گلدان میں پھول ٹھیک کیے۔

عین اسی وقت اوپر کے پورشن میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی ۔ طارق صاحب تیار ہو کر میز کے گرد بیٹھے ناشتے کے منتظر تھے ۔ ان کی بے حد خوب صورت مگر ذرا کاہل اور کچھ لاپرواہ بیگم صاحبہ ناشتے کے معرکے سے نبرد آزما تھیں ۔

"ارے بھئی ، کب تک بن جائے گا ناشتہ ؟ آدھا گھنٹہ ہو گیا مجھے بیٹھے ہوئے۔" شوہر نامدار نے آواز لگائی۔

"آ رہی ہوں۔" بیگم صاحبہ سٹر پٹر چلتی ہوئی آئیں ۔ ایک ہاتھ میں انڈے کی پلیٹ ، دوسرے میں سلائس ، جو کہیں کہیں سے جلے ہوئے تھے۔

"یہ لیں ناشتہ ۔ ذرا صبر نہیں ہے آپ میں ۔ شور مچا مچا کر میرے ہاتھ پاؤں بھی پھلا دیتے ہیں۔"

"یہ کیا پھر انڈا سلائس؟" مجازی خدا کا منہ بن گیا۔ "کتنی بار کہا ہے پراٹھا بنا دیا کرو۔ ڈبل روٹی کھا کر ایک گھنٹے بعد ہی بھوک لگنے لگتی ہے۔ اور پیٹ الگ خراب ہو جاتا ہے۔" انہوں نے بیگم کو لتاڑتے ہوئے بے دلی سے لقمہ توڑا۔

"آٹا گوندھا ہوا نہیں تھا ، اب آٹا گوندھنے بیٹھ جاتی تو اور ٹائم لگ جاتا آپ پہلے ہی اتنا شور مچا رہے ہیں۔"

"تو ذرا جلدی اٹھ جایا کرو۔" طارق صاحب کچھ اور بھی کہنے لگے تھے کہ شایان آ گیا۔

"امی ! ناشتہ !" اس نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

"لا رہی ہوں۔" ملیحہ بیگم نے پھر کچن کا رخ کیا۔ پانچ منٹ بعد واپس آئیں تو وہی ناشتہ ہاتھ میں تھا جو شوہر صاحب کے حصے میں آیا تھا۔

"یہ کیا! امی روز روز انڈا اور سلائس بھی کچھ اور بھی بنا لیا کریں۔"

بیٹے کا بھی منہ بن گیا ۔ دراصل عمدہ اور متنوع پکوانوں کا ذوق و شوق رکھنے میں دونوں باپ بیٹے ایک ہی پیج پر تھے ۔ جب کہ ملیحہ بیگم پکانے کے ہنر اور شوق دونوں سے کوسوں دور تھیں ۔

"جو بنایا ہے کھا لو ، دونوں باپ بیٹے مل کر محاذ بنا لیتے ہیں میرے خلاف۔" بیگم صاحبہ بڑبڑائیں۔

"چائے تو لا دو۔" مجازی خدا نے سلائس اور انڈے کا آخری لقمہ منہ میں رکھا۔

"چائے ......؟" ملیحہ بیگم سٹ پٹا گئیں ۔ انڈے سلائس کے چکر میں چائے تو بھول ہی گئیں۔

"بس ابھی پانچ منٹ میں لاتی ہوں۔"

"رہنے دو، مجھے ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔" ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لنچ میں کچھ بنا لینا۔ شانی کو بھیج دوں گا۔"

"وہیں سے کچھ لے کر کھا لیا کریں ۔ آپ کے آس پاس اتنا کچھ تو ملتا ہے ۔ بریانی ، حلیم ، چھولوں کی چاٹ ، دال چاول ، اور وہ ابن دادا کا ہوٹل بھی تو ہے وہاں......"

"اب ہوٹل کا مینیو مت گنوا دینا۔" طارق صاحب چڑ گئے۔ "معلوم ہے کہ باہر کے کھانے مجھے پسند نہیں ، پھر ایسیڈیٹی بھی ہو جاتی ہے ۔ برائے مہربانی گھر پہ کچھ بھی بنا لینا مگر کچھ ڈھنگ کا اور کل پرسوں والی ڈش نہ بنانا ، تاریخ کافی ہے خود کو دہرانے کے لیے ، تم اپنے دو چار کھانوں کو بار بار مت دہرایا کرو۔"

مجازی خدا سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

"اونہہ ، ہیں نا آخر رائٹر اماں کے بیٹے ، طنز بھی کریں گے تو تاریخ و ادب سے ادھار لے کر۔" بیگم صاحبہ نے مجازی خدا کی پشت کو گھورا۔

"چلو صاحبزادے! تم بھی جلدی آجاؤ، چائے کے انتظار میں مت بیٹھے رہنا۔" مڑے بغیر انہوں نے بیٹے کو آواز لگائی۔

"ناشتہ تو ڈھنگ سے کرنے دیں اسے۔" وہ بڑبڑائیں۔

"آرہا ہوں ابو!" شانی نے ناشتہ ختم کیا اور پانی کا گلاس منہ سے لگالیا۔

"امی جی ...... چائے تو بنادیتیں۔" شانی نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔"اچھا بس پانچ منٹ ٹھہرو، میں ابھی بنادیتی ہوں۔"

"رہنے دیں، ابو بائیک لے جائیں گے۔ پھر مجھے چنگ چی میں جانا پڑے گا۔" شانی اٹھ کر باپ کے پیچھے پیچھے لپکا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ کمرے کی طرف بڑھے، رامین کچن سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

"السلام علیکم چچا جان!"

"وعلیکم السلام بیٹا، جیتی رہو۔" وہ آگے بڑھ آئے اور حسب عادت و روایت اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ناشتہ کرلیں۔"

"ناشتہ تو میں کر کے آیا ہوں، بس ذرا چائے مل جاتی تو......" انہوں نے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ دیکھا۔

"یہ لے لیں!"

"جزاک اللہ۔" مگ اٹھا کر وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوئے۔

رامین کچن میں آکر دوبارہ چائے رکھنے لگی۔

"میں بھی پیوں گا۔" شانی منمنایا۔

"پہلے ناشتہ تو کرلو۔" رامین نے ٹرے اس کے آگے کھسکائی۔ جس میں ایک پراٹھا اور دو کباب تھے۔

"انڈا اسلائس کھا کر آیا ہوں۔"

"اچھا چلو رہنے دو۔" رامین نے کندھے اچکا کر ٹرے واپس کھسکائی۔

"ایسا کرو، پیک کردو۔ میں دکان پر کھالوں گا۔" شانی کھڑا ہوگیا۔

"میں دادی جان کو خدا حافظ کہہ دوں۔"

"شانی!" کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ رامین پیچھے سے چائے لے کر آگئی۔ اور شانی کو پکڑائی۔

"اب تم بھی چائے پی کر جاؤ گے؟ دیر ہورہی ہے۔" ابو جان نے اپنا خالی مگ تپائی پہ رکھا۔

"چند منٹ ٹھہر جاؤ، بچے کو سکون سے چائے تو پینے دو۔" ددو کے چہرے پہ شفقت اور محبت تھی اپنے اکلوتے پوتے کے لیے۔

"چلیں۔" شانی نے دو منٹ میں کپ خالی کر دیا۔

وہ دونوں خدا حافظ کر کے جارہے تھے جب رامین نے ایک بار پھر حاجی صاحب سے پے منٹ لانے کی یاددہانی کرائی۔

☆☆☆

کشور اچانک ہی مہمانوں کو لے کر پہنچ گئیں۔ ملیحہ بیگم گڑبڑا گئیں۔ خاص الخاص مہمان تھے۔ مگر انہیں تو اتوار کو آنا تھا۔ آج اس وقت، اچانک کیسے آگئے۔ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ کشور کو ایک طرف لے جا کر یہی سوال کررہی تھیں۔

"اتوار کو انہیں کہیں جانا تھا۔ مجھے بھی راستے سے فون کیا تھا کہ ہم پہنچ رہے ہیں۔" کشور نے صفائی پیش کی۔

"مجھے کال ہی کر دیتیں۔ اپنا اور گھر کا حلیہ درست کرلیتی۔"

"کتنی بار کوشش کی، تمہارا فون بند جارہا تھا۔"

"مانو ہوگی ساری چارجنگ ختم کر دیتی ہے موبائل کی۔" انہیں دل ہی دل میں اپنی بیٹی پر غصہ آیا۔

شوہر صاحب کو کال کر کے مہمانوں کے لیے چیزیں منگوائیں، مانو کو ڈھنگ سے تیار ہونے کی ہدایت دی اور خود ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

لڑکے کی والدہ اور نانی آئی تھیں۔ لڑکے کی

تصویر اور بائیو ڈیٹا پہلے ہی بھیج چکی تھیں۔ جو ملیحہ بیگم کو بے حد پسند آیا تھا۔ تب ہی انہوں نے مہمانوں کو گھر بلانے کی ہامی بھر لی تھی۔

ذرا دیر میں شانی سامان لے آیا تھا۔ سموسے، پیٹز، گلاب جامن، چپس، نمکو اور جوس کے ڈبے۔ کشور نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مہمان خواتین چائے نہیں پیتیں۔

میز پہ سامان خورد و نوش سجا ہوا تھا۔ ملیحہ بیگم بار بار مہمانوں کی پلیٹوں میں کچھ نہ کچھ ڈال کر اچھی میزبان ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ دونوں خواتین کھانے کے ساتھ ساتھ مانو کا تفصیلی انٹرویو لے رہی تھیں۔ جو پیازی اور انگوری رنگ کے امتزاج کا جوڑا پہنے، ہلکی پھلکی تیار، بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”ماشاء اللہ آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔“

لڑکے کی امی، مانو پہ قربان ہوئی جا رہی تھیں جبکہ نانی سہیل وڑائچ بن گئی تھیں۔ پے در پے سوالات۔

”کب سوتی ہو؟ کب جاگتی ہو؟ کیا کرتی ہو؟ کیا نہیں کرتی ہو؟ کون کون سے کھانے کھا لیتی ہو؟ کون سے پکا لیتی ہو؟ بڑوں کا کتنا ادب کرتی ہو؟ چھوٹوں کا کتنا لحاظ کرتی ہو؟ موبائل سے کتنا عشق، محبت اور عقیدت ہے؟ محدود یا لامحدود؟“

ان کے جانے کے بعد مانو نے سکون کی ایک گہری سانس لی تھی۔

رات میں چھت پر ٹھنڈی ہوا اور نمکو کے مزے لیتے ہوئے، رامین اور مانو، دونوں گپ شپ کر رہی تھیں۔

”اچھا پھر کیا ہوا؟“ رامین نے دلچسپی سے سوال کیا۔ مانو آج اچانک آنے والے مہمانوں کی روداد سنا رہی تھی۔

”اس کی امی تو بہت اچھی تھیں۔ اتنی تعریف کی انہوں نے میری، مگر وہ بڑی بی، پورا کوئسچن پیپر تیار کر کے لائی تھیں میرے لیے، اتنے سوالات کہ بس، اللہ اللہ کر کے وہ گئیں تو امی سے ڈانٹ پڑ گئی۔“

”کیوں؟“

”وہ کبابوں کی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے بتا دیا کہ میری کزن نے بنائے ہیں۔ وہ بڑے مزے مزے کی چیزیں بناتی ہے۔ امی کا تو بس نہیں چل رہا تھا۔ پانی پر بھی میرا نام لگا دیتیں کہ میں نے بنایا ہے سموسے اور گلاب جامن میرے کھاتے میں ڈال دیے اب وہ چالاک بڑی بی مجھ سے گلاب جامن بنانے کی ریسیپی پوچھنے لگیں اور مجھے تو ان سب کی اے بی سی ڈی بھی نہیں معلوم، وہ تو شکر ہے کشور آنٹی نے مداخلت کر کے معاملہ سنبھال لیا۔“

مانو بتاتے ہوئے ہنس رہی تھی اور رامین سنتے ہوئے ٹھنڈی ہوا نے آنچل سے اٹھکیلیاں کیں۔

رامین نے اڑتے ہوئے پلو کو قابو کیا اور ذرا سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بھی آج کل ایسے خاص مہمانوں کو بھگت رہی تھی۔

”یہ جو لڑکے والے ہوتے ہیں۔ میں آج تک انہیں سمجھ نہیں پائی۔ آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟“ نمکو ٹونگتے ہوئے رامین شروع ہوئی۔

”لڑکی شدید قسم کی خوب صورت ہو، اعلا تعلیم یافتہ ہو، بے حد سگھڑ ہو۔ بہت زیادہ امیر ہو اور بہت ہی کم عمر ہو۔“

”ایسی لڑکی تو آرڈر پہ بنوانی پڑے گی۔“ مانو نے اپنی خوب صورت چھوٹی سی ناک سکیڑی اور ایک جھرجھری لی۔

”سردی لگ رہی ہے۔ نیچے چلیں؟“

”چلو۔“ رامین بھی کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

سردیوں کی دھوپ تھی۔ دیواروں پہ کاہلی سے اونگھ رہی تھی۔ دیوار کی اوٹ میں بلی بھی سستی سے لیٹی دھوپ کا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ ٹفی تھی۔ ددو کی تین عدد پالتو اور لاڈلی بلیوں میں سے ایک، باقی دو مفی اور ذیفی ددو کے کمرے میں ان کی لکھنے کی میز کے نیچے گھسی ہوئی ایک دوسرے پہ غرا رہی تھیں۔

یہ دونوں ٹام اینڈ جیری تھیں۔ کانا مجھے بھائے نہیں، کانا بن سہائے نہیں۔

ددو نے اپنا نیا افسانہ شروع کیا ہوا تھا۔ اور رامین ان کے سر ہو رہی تھی بازار جانے کے لیے، تین روز سے پروگرام بن رہا تھا۔ مگر زبانی کلامی پروگرام عمل سے کوسوں دور تھا۔

"چلیں نا ددو! تیار ہو جائیں۔ میں اور میری اسکوٹی دونوں ریڈی ہیں۔"

"نہیں بھئی، تمہاری اسکوٹی پہ نہیں جاؤں گی۔ تم ایسے زگ زیگ بھگاتی ہو جیسے پہاڑی راستوں پہ چلا رہی ہو؟ ہر لمحے گرنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ تم آن لائن کوئی سواری منگوا لو۔"

"اچھا۔ میں آہستہ آہستہ، آرام آرام سے چلاؤں گی۔ پکا وعدہ۔"

ددو نے اس کی طرف رخ کیا۔ "تم گھر میں بیٹھ کر ایسے ہی وعدے کرتی ہو اور سڑک پہ جا کر سب بھول جاتی ہو۔"

"شانی کے ساتھ تو آپ اتنی جرح نہیں کرتی ہیں۔ بڑے آرام سے چلی جاتی ہیں۔"

"وہ لڑکا ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہو تو سنبھال سکتا ہے بائیک کو بھی اور مجھے بھی۔" ددو نے قلم ہاتھ سے رکھا اور اپنی عینک سر کے اوپر کی۔

"کر دی نا، پھر وہی بات، وہ لڑکا ہے، میں ایک لڑکی ہوں وہ سموسہ ہے میں فقط چٹنی، وہ بریانی ہے، میں صرف رائتہ۔" رامین نے منہ پھلا لیا۔

"اچھا بھئی، اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟ میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔"

"اپنے دور کی اتنی پروگریسو خاتون سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی مجھے۔" رامین کا منہ گول گپے سے ذرا پچک کر کچوری بن گیا۔

"اپنے دور کی۔" "کیا مطلب؟ بھئی جب تک دل زندہ اور جوان ہے، ہر دور ہمارا ہے۔ چاہے عمر کا نمبر ٹوئنٹی ہو یا سیونٹی۔" ددو نے کاغذ قلم سمیٹ کر ایک طرف رکھا۔

"چلیں؟" رامین نے خوش ہو کر سوال کیا۔

"ہاں بھئی، چلتے ہیں، لیکن اگر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو تمہیں ہی خدمت کرنی پڑے گی۔"

خریداری میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا، گروسری اور کچھ لوشن، کریمیں، رامین نے اپنی اور ددو کی پسندیدہ چاکلیٹس لیں۔ ثروت دادی کے لیے ایک جوڑا خریدا گیا۔ انہیں کل آنا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن طلوع ہوا۔ جاتی سردیوں کا سورج پھیکی پھیکی سی دھوپ لٹا رہا تھا۔ دوپہر میں ثروت آ گئیں۔ ڈرائیور چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ ددو کے کمرے میں بیٹھی عادت کے مطابق بے تحاشا بول رہی تھیں۔

"بھابھی کا پیٹس (Pets) رکھنے کا شوق اب تک برقرار ہے؟"

انہوں نے کمرے میں ایک طرف رکھے بڑے سے فش ایکوریم کا جائزہ لیا جس میں رنگ برنگی، خوش رنگ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ بعض کے رنگ تو اتنے خوب صورت تھے کہ بس دیکھتے ہی رہو۔

تینوں بلیاں بھی کمرے میں ہی لوٹ لگا رہی تھیں۔ البتہ طوطے صاحب صحن میں براجمان تھے۔ ان کے پنجرے میں رامین ابھی امرود اور ہری مرچ ڈال کر آئی تھی۔ پھر بھی ان کی ٹیں ٹیں جاری تھی۔

"شوق کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔" ددو مسکرائیں۔

"آپ کا لکھنا لکھانا کیسا چل رہا ہے؟" ثروت بیگم نے اگلا سوال دے مارا۔

"وہ بھی جاری و ساری ہے۔ کبھی ناغہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی ہمت ہے بھابھی! آپ اپنے شوق کے سارے کام کر ہی لیتی ہیں۔ ہم تو ایک جنجال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اپنا تام جھام سمیٹ کر کبھی ایک بیٹے کے گھر اسلام آباد کبھی دوسرے کے گھر کراچی، میں تو اسی میں ہی پوری ہو جاؤں گی کسی دن۔"

ثروت دادی نے بولتے بولتے ایک انگڑائی لی اور تکیے پہ سر رکھا۔

ددو نے اپنی عینک انگلی سے بیلنس کی اور مہمان

نند صاحبہ سے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹوں کی شادی کر دی۔ اب انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دو اگر تم اسی فکر میں گھلتی رہو گی کہ بہو کیا پکا رہی ہے؟ کیا کھلا رہی ہے؟ کتنا خرچا کرتی ہے کتنا جوڑتی ہے بچاتی ہے؟ بچے کیسے پل رہے ہیں؟ یا..."

"فکر تو ہوتی ہے، کیا کروں، میں بھی عادت سے مجبور ہوں۔ کراچی میں ہوں تو اسلام آباد کی فکر رہتی ہے۔ وہاں چلی جاؤں تو یہاں کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔"

"آپ یہاں آجائیں ہر قسم کی پریشانی سے نجات مل جائے گی۔" رامین نے پیش کش کی۔

دادی ہنسنے لگیں۔

"یہاں آ گئی تو وہ حساب ہوگا کہ یک نہ شد دو شد پھر دونوں طرف سے فکر ہوتی رہے گی۔"

"تمہاری اس عادت کا کوئی علاج نہیں۔" ددو نے بات ہی ختم کر دی۔

دوپہر کے کھانے میں رامین نے پلاؤ بنایا تھا کباب فرائی کیے، اور دادی کی خصوصی فرمائش پر بنایا تھا۔ کھنڈویوں کا سالن۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔" ثروت دادی دستر خوان پہ بیٹھیں تو نہال ہو گئیں۔ کولا ڈرنکس کی جگہ رامین نے نمکین لسی بنائی تھی۔

"کتنے عرصے بعد کھنڈویاں کھائی ہیں۔ ایسا دل چاہ رہا تھا کہ کیا بتاؤں۔"

"بس اب دل بھر کے کھالو۔" ددو مسکرائیں۔

کھانے کے بعد رامین کچن صاف کر کے ذرا دیر کے لیے لیٹ گئی۔ کمرے میں دونوں نند بھاوج اس رشتے کے بارے میں بات کرنے لگیں جو ثروت دادی بتا رہی تھیں۔

☆☆☆

فضا میں باربی کیو کی اشتہا انگیز خوشبو اور دھواں پھیلے ہوئے تھے۔ فٹ پاتھ پہ لگی درجنوں میز کرسیوں میں سے ایک پر وہ تینوں بیٹھے ہوئے، اپنے سامنے رکھے مالولات و مشروبات سے اچھی طرح انصاف کر رہے تھے۔

"اف یار، کیا ملائی بوٹی ہے پورے علاقے میں اس سے اچھا باربی کیو کہیں نہیں ملتا۔" اشعر نے چٹخارا لیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے بھائی! ادھر کے کھانوں کی بات ہی الگ ہے۔" انس نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"زبردست ہے یار، کیوں شہزادے؟" اشعر نے شایان کو دیکھا جو بغیر کسی تبصرے اور تعریفوں کے پلندے کے خاموشی سے کھا رہا تھا۔

"ہاں بس ٹھیک ہی ہے۔" شایان کا جواب بھی اس کے چہرے کے تاثرات کی طرح نارمل تھا۔

"صرف ٹھیک؟ ابے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس بات یہ ہے کہ جو ذائقے میں نے کھائے ہیں نا، اور کھاتا ہوں، ان کے آگے یہ کچھ نہیں۔"

شایان نے لسی کا گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

اشعر اور انس دونوں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"ہمارے بغیر اکیلے اکیلے کہاں جاتا ہے پیارے، پیٹ پوجا کے لیے؟"

"کہیں نہیں جاتا۔" شایان نے لسی کا میز پہ رکھا۔

"میری کزن اتنے مزے کی ڈشز بناتی ہے، کیا بتاؤں۔"

اشعر اور انس نے معنی خیز نگاہوں سے پہلے ایک دوسرے کو پھر شایان کو دیکھا۔

"کزن ......! مزے مزے کے کھانے بناتی ہے؟"

"کتنے مزے کے؟"

شانی نے سادگی کے ساتھ اپنی ہی دھن میں جواب دیا۔

"یار! وہ چٹنی بھی بناتی ہے نا تو قورمے کا مزا

آجاتا ہے۔"

"اچھا......!......!......!"

"اس کے ہاتھ کی چائے پی لو تو پھر کسی کی چائے اچھی نہ لگے۔"

"واقعی ؟" دونوں بدتمیزوں نے آنکھیں گھمائیں۔

"اور جب وہ بریانی بناتی ہے نا تو بندہ خوشبو سے ہی پیٹ بھر لے۔"

"واہ......کیا بات ہے۔" دوستوں کے منہ، آنکھیں اور زبانیں سب ایک ساتھ چل رہے تھے۔

شایان مگر کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ کھانا بھول کر وہ فضا میں دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

"ایسے خستہ شامی کباب، گرما گرم چٹ پٹے رول، سموسے، کڑک اور کراری چٹخارے دار چنا چاٹ، خوشبودار اور ذائقے دار سالن، کھلے کھلے مزے دار چاول چٹنیاں اور ذائقے، لاجواب میٹھے......"

"بس کر پگلے، رلائے گا کیا؟" دونوں نے اداکاری کی۔

"پتا ہے میں پہلے بھنڈی نہیں کھاتا تھا جب سے رامین کے ہاتھ کی بھنڈی کھائی ہے۔ بھنڈی سے محبت ہوگئی ہے۔"

"محبت؟ وہ بھی فقط بھنڈی سے؟" اشعر اور انس کی شکلوں پہ شرارت ناچ رہی تھی۔

"تاریخ محبت میں بھنڈی کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا جسے چاہا گیا، جس سے محبت کی گئی۔"

شایان نے مشکوک نگاہوں سے دوستوں کو دیکھا۔

"ابے، تم لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"ہماری یہ مجال، آپ کی اور آپ کی بھنڈی محبت کی شان میں گستاخی کریں؟" دونوں نے اپنے اپنے کان پکڑتے ہوئے آنکھ ماری۔

☆☆☆

مہمانوں کو شام میں آنا تھا۔ رامین نے رس ملائی بنا کر فریج میں رکھ دی۔ آج موسم ذرا گرم سا تھا۔ ٹھنڈ کا تو کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔

رامین نے فریزر کا جائزہ لیا۔ کباب اور رول سموسے تھے۔ بس نکال کر فرائی کرنے تھے۔

دڈو کو اس نے شام کی تیاری ساری بتادی تھی۔ ثروت دادی بھی سن رہی تھیں۔ مسکرادیں۔

"اللہ کی شان ہے۔ دادی کو کبھی کچن اور کوکنگ سے لگاؤ نہیں رہا اور پوتی ماشاء اللہ اس ہنر کو بزنس بنا کر ورکنگ وومین بن گئی ہے۔"

"ہماری دڈو بہت اسٹرونگ تھیں۔ جو کرنا چاہتی تھیں۔ وہ کیا۔ جو نہیں کرنا تھا، وہ نہیں کیا۔"

رامین نے فخر اور محبت سے اپنی دادی کو خراج تحسین پیش کیا۔

"بھئی، ہمیں کوئی زیادہ شوق نہیں تھا، گھنٹوں گھنٹوں چولہے کے آگے کھڑے ہو کر رنگ برنگ پکوان پکانے کا، اللہ بخشے رحمت آپا کو ہم نے کچن کے کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ بیس سال کا ساتھ تھا ہمارا ان کا، بچے چھوٹے سے بڑے ہوگئے۔ مجبوری میں کرلیتے تھے کوکنگ مگر شوق سے کبھی نہیں کی۔" دڈو نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"رامین کس پر چلی گئی! اپنی ماں پہ؟"

"ہاں، عفت تو بڑے شوق سے کوکنگ کرتی تھی اور بہت ذائقہ بھی تھا اس کے ہاتھ میں۔" دڈو نے تائید کی۔

☆☆☆

شہد اور لیموں سے بنا گھریلو ماسک چہرے پہ لگائے تقریباً پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ رامین منہ دھونے کے لیے اٹھی۔ اندر آتا ہوا شایان اسے دیکھ کر ٹھہر گیا۔

"سرمد بھائی نے پیمنٹ بھجوائی ہے سینڈوچز کی۔"

"ہوں......!" رامین نے اسے اشارہ کیا بیٹھنے کا اور خود منہ دھونے چلی گئی، ذرا دیر بعد آکر شایان کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے نرم وملائم چہرے پہ سنہری چمک اور تروتازگی تھی۔ یہ چمک شایان کی

آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ اس نے جیب سے والٹ نکالا اور نوٹوں کا لفافہ رامین کو دیا۔

''سرمد بھائی سے کہنا، آئندہ اتنی لیٹ پے منٹ دی تو فائن لگادوں گی۔'' نوٹ گنتے ہوئے رامین نے دھمکی دی۔

''آج بھی کوئی مہمان آرہے ہیں کیا؟'' شایان نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔ گھر میں بھی غیر معمولی صفائی ستھرائی اور آرائش وزیبائش تھی۔

''ہاں، ثروت دادی کے جاننے والے ہیں کوئی۔'' رامین کا لہجہ سرسری تھا۔

''تمہاری شادی ہوجائے گی تو تمہارے کام کا کیا ہوگا؟'' شایان نے تشویش کا اظہار کیا۔

''کام یونہی چلے گا۔ اتنی محنت کی ہے میں نے، ایسے ہی تھوڑی چھوڑ دوں گی۔'' رامین کا لہجہ مضبوط تھا بالکل وڈو کی طرح۔

''چلو اچھا، گڈ لک۔'' شانی الجھا الجھا سا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

مانو اور امی دونوں اپنے اپنے موبائل میں گم تھیں۔

''ابو نے لنچ منگوایا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' امی کے سر پہ بم پھوٹ گیا۔

''صبح تو منع کر کے گئے تھے، کہ بولٹن جانا ہے، شام تک واپس آئیں گے۔''

''نہیں گئے۔'' شانی مختصر جواب دے کر صوفے پہ آڑا ترچھا ہو کر لیٹ گیا۔

''اب اتنی ایمرجنسی میں کیا بناؤں؟'' وہ بھنائی ہوئی اٹھیں۔

''میکرونی یا نوڈلز بنالیں۔'' مانو نے مفت مشورہ دیا۔

''تمہارے ابو کھاتے ہیں یہ الا بلا؟'' بیٹی کے مشورے نے انہیں تپادیا۔

فریزر کھول کر جائزہ لینے لگیں۔

''اس میں چکن کا ایک پیکٹ رکھا تھا، کہاں گیا؟''

''وہ تو اچینی میں ڈال دیا تھا۔'' مانو کے انکشاف پر ان کا پارہ مزید ہائی ہوگیا۔

''بتا نہیں سکتی تھیں کہ چکن ختم ہوگئی ہے۔ میں منگوالیتی۔''

''آپ کو بھی تو کھلائی تھی۔'' مانو منمنائی۔

''کیا لانا ہے۔ مجھے بتادیں، میں لادیتا ہوں۔'' شایان نے مداخلت کی۔

یکا یک ہی عجیب سی بے زاری نے اس کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ امی اور بہن کی بحث سے بھی اسے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔

''رہنے دو، تم کب لاؤ گے، کب پکے گا، کب لے کر جاؤ گے۔'' امی بیٹے کو جواب دے کر بیٹی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جا مانو! رامین سے پوچھ، کوئی سالن یا سبزی، دال، کچھ بھی رکھا ہو تو اپنے چچا کے لیے دے دے۔''

''مجھے پتا تھا، آپ یہی کہیں گی۔'' مانو کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

''امی آپ آئے دن یہی کرتی ہیں۔ رامین کے پاس بھیج دیتی ہیں۔'' شایان نے بھی بہن کی حمایت کی۔

''اوفوہ، تو کیا ہوگیا؟ تمہارے ابو کھانے پینے کے لیے جو کچھ لاتے ہیں۔ رامین کا حصہ ضرور نکالتے ہیں۔ میں ہمیشہ اسے ماسک، بنا بنا کر دیتی ہوں۔ اور کتنے سارے آرڈر دلوائے ہیں اسے اپنے میکے میں۔ سب جگہ فری کی ایڈورٹائزمنٹ کی ہوئی ہے اس کی۔ پچھلے سال اسکوٹی سے گر کر فریکچر کرلیا تھا پیر میں، ہم نے ہی ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگائے تھے اور خیال رکھا تھا اس کا۔'' امی نے احسانات کی ایک لمبی فہرست گنوادی۔

''اچھا بھئی، منگوالیں۔'' شایان جھلا گیا۔

مانو نیچے جا کر سالن لے آئی، شانی لنچ لے کر چلا گیا۔ دوپہر دھیرے دھیرے سہ پہر کے گلے لگی اور سہ پہر دوڑ کر شام سے جا ملی۔

مہمانوں کی آمد ہوئی۔ خاطر مدارت کے دوران بہت سی باتیں بھی ہوگئیں۔

دڈو اور ثروت دادی کو قوی یقین تھا کہ یہاں بات بن جائے گی اور یہی ہوا۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کردی تھی بس ایک چھوٹی سی اڑچن تھی۔ ان کے ہاں خواتین کا کام کرنا یعنی پیسے کمانے کے لیے کام کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ بہت سارے معاملات میں ''لوگ کیا کہیں گے'' والی تھیوری پر یقین رکھتے تھے۔

دڈو نے فیصلہ رامین پر چھوڑ دیا تھا اور رامین پہلے ہی فیصلہ کرچکی تھی۔

''میں اپنا کام نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میرا شوق اور ہنر دونوں ہیں اور پھر گھر بیٹھے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے میرا کانفیڈنس لیول ہائی رہتا ہے۔''

ثروت دادی کی رائے مختلف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ رشتہ اچھا ہے، اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

''ابھی تو ہاں میں ہاں ملادو، بعد میں اپنی منوالینا۔'' انہوں نے رامین کو مشورہ دیا۔

''جس رشتے کی بنیاد جھوٹ اور دھوکے پر رکھی جائے، اس میں کیا خیر و برکت ہوگی؟''

رامین نے ان کی تجویز مسترد کردی۔

ان سارے دنوں میں شایان پتا نہیں کیوں کچھ بوکھلایا ہوا، کچھ جھنجلایا ہوا سا تھا۔ ابو سمیت سب کو ہی اس کی یہ عجیب سی بے زاری نظر آرہی تھی۔

''صاحبزادے کیوں رسیاں تڑا تڑا کر بھاگ رہے ہیں؟'' وہ اپنی بیگم صاحبہ سے استفسار کررہے تھے۔

''مجھے کیا پتا۔'' ملیحہ بیگم خود پریشان تھیں، کشور کے بتائے رشتوں میں جو لڑکا انہیں سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ وہاں سے اتنے دنوں کی سوچ بچار کے بعد انکار ہوگیا تھا۔ انہیں تو یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی اتنی حسین بیٹی کو کوئی مسترد بھی کرسکتا ہے؟

''کون سی مس ورلڈ چاہیے انہیں!'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کشور سے سوال کیا تھا۔

''میں تو خود عاجز آگئی ہوں۔ اتنی لڑکیاں دکھا چکی ہوں، وہ بڑی بی پتا نہیں کیا چاہتی ہیں۔ اپنے زمانے کی کوئی لڑکی چاہیے نواسے کے لیے، جس میں طریقہ، سلیقہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہو۔ منہ میں زبان نہ ہو۔ موبائل نام کی کسی شے سے واقف نہ ہو۔ کہاں سے لاؤں ایسی عجوبہ روزگار لڑکی۔''

کشور نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے، اور ساتھ ہی دوسرا کوئی اچھا سا رشتہ بتانے کی ہامی بھری۔

☆☆☆

ثروت دادی واپس چلی گئیں مگر اس یقین دہانی کے ساتھ کہ اگلی بار کسی اور اچھے سے رشتے کے ساتھ آئیں گی۔

رامین کوئی بہت زیادہ زود رنج اور حساس نہیں تھی۔ بہت جلدی مایوس اور اداس بھی نہیں ہوتی تھی مگر اس آئے دن کی رشتہ پریڈ سے تنگ آگئی تھی۔ حالانکہ دڈو سوچ سمجھ کر منتخب فیملیز کو ہی بلاتی تھیں پھر بھی کسی نہ کسی اعتراض کو لے کر معاملہ ختم ہوجاتا تھا۔ ابھی تک کہیں بات نہیں بنی تھی۔

☆☆☆

ادھر مانو بہت ڈس ہارٹ تھی۔ اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی اسے بھی ریجیکٹ کرسکتا ہے؟

دونوں اپنا ''غم'' غلط کرنے چھت پر موجود تھیں۔ جہاں ہوا ٹھنڈی نہیں تھی اب مگر خوش گوار ضرور تھی۔ گرین شیڈ کے نیچے دونوں کرسیوں پہ بیٹھی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی میز پر غم غلط کرنے کا سامان تھا۔ چپس، موموز اور ڈونٹس، دونوں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہی چیزیں کھا کر گزارہ کرنے کا ارادہ تھا۔

''ڈراموں میں ہیرو نمودار ہوتے ہیں اور بہار آجاتی ہے۔ یہاں تو دور دور تک کوئی ہیرو تو کیا کوئی ولن بھی نہیں ہے۔'' مانو نے منہ بسورتے ہوئے موموز اٹھایا۔

''یہ اصل زندگی ہے یہاں اور ڈرامے تو بہت ہوتے ہیں مگر ہیرو کی انٹری والا ڈرامہ ہر ایک کے

ساتھ نہیں ہوتا۔" رامین بھی بے حد "دکھی" تھی اور آدھی پلیٹ موموز ختم کر چکی تھی۔

"اب تو شہزادے بھی نہیں ہوتے جو عام لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جا کر شہزادی بنا دیا کرتے تھے۔" مانو اب بھی سنڈریلا، ریپنزل، سنو وہائٹ اور سلیپنگ بیوٹی کے سحر میں گرفتار تھی۔

"کیا ضرورت ہے شہزادوں کو سر پہ چڑھانے کی؟ ان میں اور کیا خوبی ہوتی ہے سوائے اس کے، کہ بادشاہ کے محل میں پیدا ہو جاتے ہیں اور اب تو "ویمن" پاور" نے یہ کہانیاں بھی الٹ پلٹ کر کے رکھ دی ہیں۔ اب لڑکیاں، شہزادوں کو محل سے نکال کر ایک عام انسان بنا دیتی ہیں۔" رامین کو میگھن مارکل کا خیال آیا۔

"اب تو محبت میں تاج محل بنانے والا بھی نہیں رہا کوئی۔" مانو نے ایک اور دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ڈونٹ کھانا شروع کیا۔

"دفع کرو ان بادشاہوں اور شہزادوں کو، آخر ہم شہزادوں کا انتظار کرتے ہی کیوں ہیں؟ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ہمیں ریجیکٹ کرے یا سلیکٹ کرے؟ اب یہ کام ہم خود کریں گے۔ ویمن امپاورمنٹ کا دور ہے۔ چائے کی ٹرے کا بائیکاٹ ہونا چاہیے۔" رامین عالم کو جلال آ گیا۔

"جب کوئی "دیکھنے" نہیں آئے گا تو شادی کیسے ہوگی؟" مانو نے سوال اٹھایا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" رامین نے اسے جھڑکا "جب چائے ایجاد نہیں ہوئی تھی تو لوگوں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں کیا؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔" مانو نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا اور پلیٹ میں رکھا۔ آخری ڈونٹ بھی اٹھا لیا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ بس بہت ہو گئی۔ اب کوئی مہمان نہیں، کوئی چائے کی ٹرے نہیں۔" رامین کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"میں بھی امی سے کہہ دوں گی۔" مانو کو بھی جوش آیا۔

"اور میں دڈو کو بتا دوں گی۔" رامین نے گلاس میں پانی انڈیلا اور پینے لگی، بول بول کر حلق خشک ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بڑے ماموں کے گھر سے مٹھائی آئی تھی۔ ان کے بیٹے کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد اب سب بیٹھے مٹھائی سے انصاف کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی۔ اصل میں باتیں تو ملیحہ بیگم، شانی اور مانو کر رہے تھے۔ ابو جان موبائل ہاتھ میں لیے ہوئے بس ہوں، ہاں کر رہے تھے۔

"یہ دانیال، ہمارے شانی کے ساتھ کا ہی ہے۔ بتاؤ ذرا، اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اب میں بھی اپنے بیٹے کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر رہی ہوں۔" امی جان نے اعلان کیا اور ساتھ ہی مجازی خدا کو مخاطب کیا۔

"آپ سن رہے ہیں میری بات؟"

"بالکل سن رہا ہوں۔ آپ کی "سننے" کے لیے تو برضا و رغبت، تین بار قبول ہے کہہ کر کاغذوں پہ دستخط کیے تھے۔ اب راہ نجات کوئی ہے نہیں۔"

"بیٹے کی شادی کی کوئی فکر ہے یا نہیں؟ اب تو ماشاء اللہ کمانے لگا ہے۔" امی جان کو یکایک بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کا ارمان ستانے لگا۔

"بیٹے سے پوچھ لو، کہیں اور مرضی نہیں ہے تو دیکھ لو کوئی لڑکی۔"

"اس کی مرضی کہاں ہوگی، ان سب چکروں میں نہیں رہتا میرا بیٹا، اتنا سیدھا سادا تو ہے۔"

"ہوں!" ابو جان نے پھر موبائل میں منہ دے رکھا تھا۔

"امی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی "لڑکی" دیکھنے۔" مانو "بھابھی ڈھونڈ مہم" کے لیے بہت پرجوش تھی۔

"چاندی سی بہو لاؤں گی اپنے چاند کے لیے۔"

''ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ چاند پر بہت بڑے بڑے خوفناک قسم کے گڑھے اور غار ہیں۔'' شانی نے لب کشائی کی۔

''تم دیکھ کر آئے ہو؟''

''سائنس دان کہتے ہیں۔'' شانی نے کندھے اچکائے۔

''ایک تو ان کم بخت مارے سائنس دانوں کو چین نہیں ہے۔ بچوں کی طرح ہر چیز میں گھس گھس کر بخیے ادھیڑ دیتے ہیں۔'' امی بڑبڑائیں۔

''چھوڑیں نا مما! چاند جیسی نہیں تو پھولوں جیسی بہو لے آئیں۔''

''گوبھی کے پھول جیسی؟''

''جی نہیں۔ گلاب جیسی۔''

''گلاب تو کئی رنگوں میں ہوتا ہے، سرخ، پیلا، سفید، گلابی اور نج اور کالا بھی ہوتا ہے۔''

''میں تو گلابی گلاب جیسی دلہن لاؤں گی اپنے شہزادے کے لیے، لوگ دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔''

''اور جب وہ ہمارے بیٹے کو یہاں سے نکال لے جائے گی۔ تو ہم دونوں بھی دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔'' ابو کا آدھا دھیان ان سب کی طرف بھی تھا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' امی دہل گئیں۔ ''آپ کو تو بس ایسی باتیں......

''مما، یہ سب چھوڑیں، بھائی کی شادی کی باتیں کریں۔ کتنا مزا آئے گا۔ اتنے سارے ایونٹس ہوں گے، ڈھیر سارے ڈریسز بناؤں گی میں اور......''

''بات سنو ڈیر سسٹر، اپنی شادی کے سنہرے سہانے سپنے میں خود دیکھ لوں گا، تم اٹھو اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ سب کے لیے۔ مگر چائے سمجھیں، اصلی ٹیسٹی چائے۔'' شانی نے اسے وہاں سے بھگایا۔

''اف ف......'' مانو بھنا کر کھڑی ہوگئی۔ ''آپ کی شادی تو کسی شیف سے ہونی چاہیے۔ جو ہر وقت چائے بنا بنا کر پلاتی رہے اور اچھے اچھے کھانے بنا کر ٹھساتی رہے۔'' مانو نے جلتے کڑھتے کچن کا رخ کیا۔

''واؤ، واٹ آ گڈ آئیڈیا، اس آپشن پر بھی غور کرنا چاہیے، کیوں مما جانی؟''

''چل ہٹ بے وقوف کہیں کا۔''

☆☆☆

لائٹ براؤن بالوں کا جوڑا بنائے، دڈو نے اپنی پیاری بلیوں کو کھانا دیا، اور خود کرسی پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ذیفی کچھ سست سست دکھائی دے رہی تھی۔ ورنہ تو سب سے زیادہ ایکٹیو یہی تھی۔

''تمہیں کیا ہو گیا بڑی بی؟'' انہوں نے پیار سے اس کی پشت پہ ہاتھ پھیرا۔

''دڈو کھانا لگاؤں؟'' رامین اندر آئی۔

''ضرور لگاؤ، اور ذرا کل کا بھی دیکھ لینا، ثروت آئے گی مہمانوں کے ساتھ۔''

''میں نے بائیکاٹ کیا ہوا ہے ایسے مہمانوں کا، آپ مجھے مجبور مت کریں۔'' رامین کا لہجہ اٹل تھا۔

''میں مجبور نہیں کر رہی بیٹا! تم جانتی ہو، میں ہر ایک کو یونہی نہیں بلا لیتی، یہ فیملی ہماری بہت پرانی جاننے والی ہے۔ عالیہ شادی ہو کر مسقط چلی گئی تھی۔ اب اس کے بچے بڑے ہو گئے، دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کے لیے بہو ڈھونڈ رہی ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ وہیں جاب کرتا ہے۔ عالیہ اچھی عادت مزاج کی خاتون ہے۔'' دڈو نے تفصیل سے بتایا۔

''ہوں گی۔ مگر بیٹے یا بھائی کے لیے لڑکی دیکھتے وقت سب کی آنکھوں میں ایکسرے مشین فٹ ہو جاتی ہے۔''

''وہ تمہاری تصویر دیکھ کر تمہیں پسند کر چکی ہے اور تمہارے کام کا سن کر تو بہت ہی امپریس ہو رہی تھی اپری شیٹ کر رہی تھی۔ فون پہ ہماری بات ہوئی تھی۔''

''یعنی آپ چاہ رہی ہیں کہ میں ایک بار پھر چائے کی ٹرے لے کر کسی کے سامنے آؤں؟'' رامین نے روٹھے روٹھے انداز میں کہا۔

ایموشنل کیریکٹر کیوں بن رہی ہو، رامین بچہ۔ چائے کی ٹرے کے ساتھ تو تم آج تک کسی کے سامنے نہیں آئیں جو مہمان آتے ہیں میں اور تم مل کر انہیں ویلکم کرتے ہیں اور نارمل ہی بی ہیو کرتے ہیں۔'' دادو مسکرائیں۔

''آپ اپنی بات منوا کر رہتی ہیں۔''

''کچھ اشارے قدرت کی طرف سے بھی ہوتے ہیں۔ ان پر دھیان دینا چاہیے۔''

اور دھیان تو شایان کا بھی ادھر ادھر بھٹک رہا تھا اور سب جگہ سے واپس آکر خیال کا پرندہ ایک جگہ آکر چپ بیٹھ رہا تھا اور اسے خاموشی سے تک رہا تھا۔ کہ یہ خاموشی کب تلک؟

رات کروٹوں پہ کروٹیں بدلنے کے بعد صبح تک اس نے یہ خاموشی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

صبح بڑی مختلف اور انوکھی تھی، نہا دھو کر تیار ہو کر میز پہ آیا تو فضا میں پراٹھے پکنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''آج سورج کہاں سے نکلا ہے؟'' طارق صاحب کا موڈ بھی خوش گوار ہو چلا تھا۔ روز روز سلائس کھا کر مزاج اور پیٹ دونوں ہی خراب ہو جاتے تھے۔ مگر پراٹھے پک کر سامنے آئے تو تو پہلے تو وہ ان کی شکل دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ پراٹھوں سے زیادہ وہ پاپڑ لگ رہے تھے کڑک، سخت اور کہیں کہیں سے جلے ہوئے۔

''انہیں چبانے کے لیے لوہے کے دانت کہاں سے لائیں؟'' شوہر نامدار لگی لپٹی رکھنے کے عادی نہیں تھے۔

''آپ کو تو بس موقع چاہیے مجھ پہ تنقید کرنے کا اور باتیں بنانے کا۔'' بیگم صاحبہ چراغ پا ہو گئیں۔

''زیادہ نہیں سینکتی تو آپ کو کچے لگتے۔ پھر اس پر بھی کچھ نہ کچھ بنا دیتے۔''

''اچھا تم خود کھا کر دیکھ لو۔'' انہوں نے بیگم کو دعوت دی۔

''آپ کے لیے بنائے ہیں، آپ ہی کھائیے، روز پراٹھے پراٹھے کرتے رہتے تھے، آج بنا دیے تو نخرے دکھانے لگے۔'' بیگم نے ان کی دعوت بھی رد کر دی اور دو باتیں مزید سنا دیں۔

شایان اس بحث سے بے نیاز چپ چاپ گھی میں تر بتر وہ پاپڑ چبا رہا تھا۔

''کوشش کی تھی پکانے کی تو ذرا محنت بھی کر لیتیں۔'' پھر مشورہ ملا۔

''اپنے بیٹے سے ہی کچھ سیکھ لیں، وہ بھی تو خاموشی سے کھا رہا ہے۔ پراٹھے اتنے برے ہوتے تو کھاتا؟''

''اپنی سگی ماں سے اتنی مروت تو دکھا سکتے ہیں برخوردار۔''

''مگر آپ ذرا بھی مروت نہیں دکھا سکتے۔ آپ کی تو جیسے سوتیلی بیوی ہوں۔''

بیگم کی بے ساختگی پر ان کا قہقہہ نکل گیا۔

''سوتیلی ہوں......واہ، کیا بیگم بھی سگی سوتیلی ہوتی ہے؟'' انہوں نے پاپڑ نما پراٹھا توڑ کر کھانا شروع کیا۔

''جو شوہر اپنی بیوی پر ہر وقت تنقید اور اعتراضات کرتے رہتے ہیں، وہ اپنی بیوی کو سگا نہیں سوتیلا سمجھتے ہیں۔''

ملیحہ بیگم کی منطق نے باپ بیٹے دونوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر دی تھیں۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے دن ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ رات کا مزاج سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ اپنی مرضی کی مالک۔ کبھی ٹھنڈی، کبھی گرم۔

شانی لنچ لینے گھر آیا تھا، رامین کچن میں تھی۔ وہ وہیں آ گیا۔ جہاں وہ کٹنگ بورڈ پر منجمد گوشت کے پتلے پتلے پارچے کاٹ رہی تھی۔

''رامین......'' شانی نے اسے مخاطب کیا۔

''نہ چائے کا کہنا، نہ کسی اور چیز کا۔ اس وقت میرا موڈ بہت خراب ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

"کچھ نہیں۔"
"تمہارا موڈ بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔"
"کیوں؟ آج عید ہے کیا؟"
"ایک بات کہنی تھی تم سے۔"
"کہو!" رامین نے کٹا ہوا پارچہ ایک طرف رکھا۔
"تم...... مجھ سے...... شادی کرو گی؟"
"اف ف...... رامین نے دانت پیس کر دیکھا۔ "میں نے کہا نا کہ میرا موڈ بہت خراب ہے ایسا چھچھورا مذاق دوبارہ کیا تو یہ بیلن سر پر پڑے گا۔"
شایان کو اس کا موڈ خراب ہی نہیں بلکہ بہت خونخوار لگا تھا۔ مگر وہ اوکھلی میں سر دے چکا تھا، موصلوں سے ڈرتا تو بات نہیں بنتی، تب ہی محاذ پہ ڈٹا رہا۔
"میں تم سے زیادہ سیریس ہوں، اٹھاؤں بیلن؟"
"تم میری بات سمجھنے کی تو کوشش کرو۔"
"مجھے سب سمجھ میں آتی ہے۔ تم شاہ رخ خان بننے کی کوشش نہ کرو۔"
گوشت کے پتلے پتلے پارچے ایک طرف کرکے، اس نے باقی ماندہ گوشت کی بوٹیاں بنانی شروع کیں۔
"دیکھو رامین! میں......" شایان نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا مگر رامین کی ہیلپر آنٹی شاہدہ اندر آ گئیں۔
"آنٹی! پہلے یہ سنک کے برتن دیکھ لیں اور یہ گوشت دھو کر چھلنی میں رکھ دیں۔ اس کے بعد سبزیوں کی کٹنگ ہے اور کچھ مسالے پیسنے ہیں۔"
رامین نے احکامات اور ہدایات کی فہرست جاری کی۔
"ٹھیک ہے۔ میں پہلے یہ برتن دھو لوں۔" وہ سر ——— ہلاتے ہوئے سنک کی طرف بڑھ گئیں۔
شایان نے بے بس سی نگاہ رامین پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ وہ سیدھا دڈو کے کمرے میں گیا۔ وہ کاغذ قلم لیے بیٹھی تھیں۔ شایان ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان کا قلم رک گیا۔ سوالیہ نگاہیں پوتے پر تھیں۔
"آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"
"کہو۔"
"مجھے رامین سے شادی کرنی ہے۔"
"ابھی؟"
"دڈو! میں سیریس بات کر رہا ہوں۔"
"میرے چاند! جو بات مجھ سے کہی ہے۔ وہ مجھ سے پہلے اور کسی سے کہی؟ اپنی مما سے، پاپا سے؟"
"ان سے بھی کر لوں گا۔ پہلے تو آپ سے اور رامین سے بات کی ہے۔" شایان نے وضاحت کی۔
"رامین سے بھی کہہ دیا؟"
"جی!"
"ڈانٹ پڑی ہو گی، آج اس کا مزاج ذرا برہم ہے۔" دڈو اپنی پوتی کو خوب جانتی تھیں اور سمجھتی بھی تھیں۔
"دڈو، کچھ کریں، رامین کو ایگری کریں۔ مما میرے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ اپنی جیسی کوئی مس ورلڈ لے آئیں گی۔ میں تو بھوکا مر جاؤں گا۔"
"تو تم نے رامین کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ وہ ہر وقت کچن میں موجود رہ کر تمہارے چٹورپن کی تسکین کرتی رہے؟" دڈو انتہائی سنجیدہ تھیں۔
"نن...... نہیں تو۔" شایان بوکھلا گیا۔ "میں اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ نوکرانی نہیں اور کھانے کی بات یہ ہے کہ جب سے اس کے ہاتھ کا ذائقہ منہ کو لگا ہے۔ کوئی اور ذائقہ اچھا ہی نہیں لگتا۔"
"تو بات ذائقے کی ہے؟" شایان کے صفائی پیش کرنے پر دڈو نے پھر سوال کیا۔
شایان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات جو انہیں قائل کرنے میں معاون ثابت ہو۔
"کوئی صورت پہ مرتا ہے، کوئی سیرت پہ، اور

کوئی کسی کی صلاحیت یا ہنر پہ...... جتا کر ہوتے ہی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے نا۔"

"اچھا۔" وہ مسکرا دیں۔ "اگر کبھی اس کا جی ہٹ گیا کچن سے، نہ کرنا چاہا یہ کام تو؟ تم جانتے ہو کہ وہ متلون مزاج بھی ہے۔" دادی نے اس بات سے ڈرایا تھا جس سے وہ آگاہ تھا۔

"تو......؟" شایان نے ایک گہرا سانس لیا "تو یہ کہ میں بھی اپنے دادا کا ہی پوتا ہوں۔ جب وہ اپنی بیگم کے لیے کھانا پکانے والی رکھ سکتے ہیں تو میں بھی رکھ سکتا ہوں۔"

"تو ارادہ پکا ہے؟" وہ مسکرائیں۔

"جی۔"

"تو پھر جاؤ، ملیحہ کو بتاؤ اور مناؤ، طارق تو فوراً ہی راضی ہو جائے گا۔ تمہاری ماں ذرا ٹائم لے گی۔"

"امی؟" شایان کو یقین نہیں آیا۔ "رامین تو ان کی فیورٹ ہے۔"

"تم بات کرو گے تو تمہیں خود ہی علم ہو جائے گا۔" دادو نے اپنی رائے دینے سے گریز کیا۔

"آپ رامین سے بات کریں گی؟"

"کرلوں گی لیکن زبردستی نہیں کروں گی۔ فیصلہ بہرحال اس کی مرضی پر ہی ہوگا۔"

☆☆☆

ثروت دادی کا فون آیا۔ مہمانوں کا آج آنا کینسل ہو گیا تھا۔ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اب انہیں اگلے ہفتے آنا تھا۔

رامین نے سکون کی ایک سانس لی۔ کبھی کبھی وہ سچ مچ بہت جھنجلا جاتی تھی۔

شاہدہ آنٹی نے ساری سبزیاں کاٹ کے دھو کے چھلنی میں خشک کر دی تھیں۔ مٹر بھی چھیل دی تھی۔ رامین سبزیوں میں مسالے ملا کر فرائی کرنے لگی۔ یکا یک اسے شایان کا خیال آیا۔

"بہت شوخا بن رہا ہے۔ بدتمیز کہیں کا، آ جائے ذرا گھر، بتاتی ہوں اسے۔ اچھی طرح طبیعت صاف نہ کر دی تو میرا نام بھی رامین نہیں۔"

کام کے دوران وہ دل ہی دل میں اسے "سدھارنے" کے منصوبے بناتی رہی۔

شام ہو گئی، رات بھی آ گئی مگر شایان گھر نہیں آیا۔

ابو نے اسے رات میں گھر بھیجا تھا، دکان سے نکلتے ہی انس اور اشعر نے گھیر لیا۔ اشعر کے بڑے بھائی کی منگنی ہوئی تھی۔ اس خوشی میں وہ دونوں گہرے دوستوں کو ٹریٹ دے رہا تھا۔

اس وقت تینوں ایک اوسط درجے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"منگنی بڑے بھائی کی ہوئی ہے۔ ٹریٹ چھوٹے بھائی کی طرف سے۔ یہ کیا گھپلا ہے؟"

"تیرے بھائی کی فائل اوپر آ گئی ہے نا، بس اسی خوشی میں جیب ہلکی کر رہا ہوں۔" اشعر کی بتیسی مستقل نکلی ہوئی تھی۔

"ہاتھ ملا یار! میں بھی اپنے بڑے بھائی کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ ٹھکانے سے لگ جائیں تو میری فائل بھی اوپر آ جائے گی۔" انس نے پرجوش ہو کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

شایان کوئی تبصرہ کیے بغیر مسکراہٹ پہ اکتفا کیے ہوئے تھا۔ جب ویٹر نے ان کا آرڈر سرو کرنا شروع کیا تو انس اور اشعر نے مل کر شایان کا گھیراؤ کیا۔

"ہمارے شہزادے کی کہانی کہاں تک پہنچی؟ کوئی مٹھائی بریانی کا آسرا ہے یا نہیں؟"

"پتا نہیں یار!" شایان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"خیریت تو ہے دوست؟ مشکل کا گھڑیال ٹو ٹیلو او کلاک کیوں بجا رہا ہے؟" دونوں ہم زادوں کو تشویش ہوئی۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے، ابے ہم سے چھپائے گا؟ اپنے بچپن کے دوستوں سے؟ لنگوٹیے یار ہیں تیرے۔" دونوں جذباتی ہو گئے۔

"یار...... وہ میری کزن ہے نا!"

''وہی مزے دار کھانوں والی؟''
''ہاں، وہی، جب بھی اس کی شادی یا رشتے کی بات ہوتی ہے تو ادھر کچھ کچھ ہوتا ہے۔'' شایان نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔
''یہی تو پیار ہے پگلے، تو اسے پسند کرتا ہے۔''
''فٹافٹ پروپوز کردے ایسا نہ ہو کہ کوئی اور آ کر اس کی ڈولی لے جائے اور تو دیکھتا رہ جائے۔'' مخلص دوستوں نے مشورے دینے کے ساتھ ساتھ سیخ کباب سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔
''میں نے اسے پروپوز کیا تھا۔'' شایان نے جیسے اپنے جرم کا اقرار کیا۔
''کیا؟'' دونوں دوستوں کی آنکھیں پھٹ گئیں، منہ کھل گئے۔ انس نے سیخ کباب کا ٹکڑا چٹنی میں ڈبونے کے بجائے پانی کے گلاس میں ڈبو دیا۔ اشعر کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا وہ اسے منہ میں ڈالنا بھول گیا۔
''اتنی دلیری؟'' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔
''جواب کیا ملا؟ پروپوز کہاں کیا؟ کیسے کیا؟ کیونکر کیا؟ کچھ تو بتا۔'' پراٹھے کباب کھانا فراموش کر کے دونوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
''وہ کچن میں گوشت کاٹ رہی تھی۔ میں نے پروپوز کر دیا۔ اس نے ڈانٹ دیا۔'' شایان نے تین جملوں میں کہانی تمام کی۔
دوستوں کی نگاہوں میں بے یقینی اتر آئی۔ دونوں شایان کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے سر پہ سینگ اگ آئے ہوں۔
''تو نے کچن میں پروپوز کیا؟'' اشعر کی آواز میں صدمہ تھا۔ ''وہ بھی گوشت کاٹتی لڑکی کو؟'' انس نے نوالہ توڑتے ہوئے لقمہ دیا۔
''گدھوں کے سالار اعظم، شکر کر، صرف ڈانٹ ہی پڑی۔ گوشت کاٹنے کی چھری نہیں پڑی، ورنہ تیرا ابھی قیمہ بن جاتا۔ کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں ملی پروپوز کرنے کے لیے؟'' اشعر ابھی تک صدمے کے عالم میں تھا۔
''کوئی ہوتا کینڈل لائٹ ڈنر، پھولوں اور خوشبوؤں کے درمیان، نیل ڈاؤن ہو کر، انگوٹھی ہاتھ میں پکڑے، سجا سنورا خوشبوؤں میں مہکا، ہمارا ہینڈسم، اسمارٹ ہیرو اور نازک، حسین و جمیل ہماری بھابھی، شرماتی، لجاتی۔''
''ابے چپ کرو تم دونوں، کسی چینل کی ٹیلی فلم چل رہی ہے کیا؟'' شایان کی بس ہو گئی۔
''کہاں لے جاتا اسے؟ اور کس بہانے لے جاتا۔ چھتیس سوالات وہ خود کرتی — دؔدو اور پھر میری امی اور ویسے وہ کہیں بھی آنے جانے کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ خود ہی اسکوٹی چلاتی ہے۔'' شایان نے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا۔
''اصل زندگی ہے یہ، ہر فلم سے بڑھ کر بڑی فلم اور ہر ڈرامے سے بڑا ایک ڈرامہ۔''
''اچھا اب دیوداس نہ بن، یہ لے، کباب کھا؟'' اشعر نے دل جوئی کرتے ہوئے کباب کی پلیٹ اس کے آگے کی۔
اگلے ہفتے جو فیملی آ رہی ہے، وہ اسے دیکھنے نہیں بلکہ رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔ میری فون پہ بات ہوئی تھی عالیہ سے۔''
دؔدو کی بتائی ہوئی خبر شایان کا منہ لٹکانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے دوستوں کو اپنے ''غم'' میں شریک کیا تو دونوں ہی پرجوش ہو گئے۔
''بات سن یار! میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے۔'' انس نے جوش میں کہا۔
''کیا؟'' اشعر اور شایان دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
''یہ جو تیرا ہونے والا رقیب ہے نا، اس کا پتا نکال، کڈنیپ کر لیتے ہیں۔''
''کڈنیپ؟'' شایان نے پہلے اسے گھور کے دیکھا پھر اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے اشعر سے مخاطب ہوا۔
''میری طرف سے ایک لگا اس کی گدی پر۔'' اشعر نے فوراً اسے پیشتر عمل کیا۔

"پھر کیا کرے گا؟ اس کی شادی پہ کرسیاں لگائے گا یا دکھی ہیرو کی طرح گانے گائے گا؟" انس نے اپنی گدی سہلاتے ہوئے سوال کیا۔

"بات سن یار! تو پہلے بھابھی کو پکا کر، پھر بڑوں میں بات کر، یہی شریفانہ طریقہ ہے۔" اشعر کی تجویز معقول تھی۔

"ہاں، یہ بہتر ہے۔" شایان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور اگر بھابھی نہیں مانیں تو سوسائیڈ کی دھمکی دینا، بلکہ ایسا کر، سوسائیڈ کر ہی لینا۔" انس نے پھر ٹانگ اڑائی۔ اس بار دونوں نے ہی اسے گھور کے دیکھا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ سوسائیڈ کرنے کا ڈرامہ کر لینا۔ بہت امپریشن پڑے گا۔"

"یار! پہلے تو اس ڈرامے کا دی اینڈ کردے۔" شایان نے بے چارگی سے اشعر کو مخاطب کیا۔

اشعر نے ایک بار پھر گدی سے پکڑ کر اسے آگے کو جھکایا۔

"چارلی چپلن کی فلم بن جا تو، بالکل سائلنٹ سمجھا۔" ہوں ں ں......

انس اسی پوز میں جھکا بمشکل آواز نکال پایا۔

☆☆☆

گھر میں بہت بڑا طوفان تو نہیں آیا مگر ایک چھوٹا سا بھونچال ضرور آ گیا تھا۔ طارق صاحب خوش تھے۔ ملیحہ بیگم بالترتیب پہلے حیران پھر پریشان اور پھر آتش فشاں بن گئیں۔ مانو کبھی ابو کی خوشی دیکھتی، کبھی امی کا غصہ اور برہمی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی والا ری ایکشن دے یا ابو کی طرح ردعمل دے۔

"یہ کیا سوجھی تمہیں رامین سے شادی کی؟" شایان عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔

"کیا برائی ہے اس میں؟" شایان نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

"ہاں، بس، ٹھیک ہے، مگر اتنی خوب صورت تو نہیں ہے نا جیسی میں نے تمہارے لیے سوچی تھی۔ امی کا اعتراض وہی روایتی ماؤں والا۔

"گھر میں پہلے ہی آپ اتنی پیاری، میری بہن اتنی حسین۔ میں خود ہینڈسم، بھرو جوان، ابو اتنے ڈیسنٹ، اب بہو بھی چاند کا ٹکڑا چاہیے؟ کیا کریں گی ایک ہی گھر میں اتنا حسن اکٹھا کر کے؟"

"لوگ بھی تو دیکھتے ہیں۔ کیا کہیں گے۔ بیٹا، اتنا ہینڈسم۔ بہو بھی تو ٹکر کی ہونی چاہیے۔"

"تاکہ گھر آ کر سب کو ٹکریں مارے۔" ابو بڑبڑائے۔

"میری پیاری امی! رامین بہت ٹیلینٹڈ ہے۔ محنتی ہے۔ یہ بھی تو انسان کی خوب صورتی ہی ہوتی ہے۔ اس کا اخلاق، ذہانت، ہنر، صلاحیت۔" شایان ماں کو قائل کرنے کے لیے اپنا سارا زور لگا رہا تھا۔

"تم پہ کیا جادو کر دیا ہے اس نے۔ اسی کے گن گائے جا رہے ہو۔" امی چڑ گئیں۔ "ابھی سے اتنی وکالت کر رہا ہے۔ آگے کیا کرے گا؟"

"تعریفیں تو آپ بھی کرتی تھیں اس کی؟"

"اس لیے تھوڑی کرتی تھی کہ لا کر سر پہ چڑھا کر بٹھا دوں۔"

"آپ کے سر پہ کیوں بیٹھے گی وہ، گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے کیا؟" شایان جھنجلا گیا۔

"دیکھ رہے ہیں بیٹے کے تیور؟ ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں کیا حال ہوگا؟"

"میں تو تمہارا بھی غیظ و غضب دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ شادی ہو گئی تو تمہارا کیا حال ہوگا بعد میں؟" ابو جان نے جلتی پہ تیل چھڑکا۔

"آپ دونوں باپ بیٹے مل کر میرا دماغ خراب نہ کریں۔"

ملیحہ بیگم احتجاجاً وہاں سے اٹھ کر چل دیں مگر جانے سے پہلے بیٹی پہ خشم آلود نگاہ ضرور ڈالی تھی جس میں ملامت بھی موجود تھی۔

"ماں کی حمایت میں کچھ بول نہیں سکتی تھیں؟ گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو؟"

"میں کیا بولوں!" مانو [illegible]
مگر اس کا جواب سننے سے پہلے ہی امی وہاں سے جاچکی تھیں۔

☆☆☆

پودوں کو پانی دے کر اس نے عارفہ کو مخاطب کیا جو دڈو کے کمرے کی صفائی کر کے آئی تھی۔

"ڈرائنگ روم ذرا اچھی طرح صاف کر دینا۔ مہمان آئیں گے شام میں۔"

"کون سے مہمان آرہے ہیں آج؟" سیڑھیاں اترتا ہوا شایان چونکا۔

"عاقب ماموں اور ان کی فیملی۔"

"خیریت؟ کیوں آرہے ہیں؟"

"یونہی، ملنے آرہے ہیں، تمہیں کیوں تشویش ہو رہی ہے؟" رامین نے اسے گھور کے دیکھا۔ ابھی تو پرسوں کا حساب برابر کرنا تھا۔ تب سے شایان ہاتھ ہی نہیں لگا تھا۔

"کیا بناؤ گی مہمانوں کے لیے؟" شایان نے مہمانوں کی طرف سے مطمئن ہو کر دلچسپی سے سوال کیا۔

"تمہارا دل و دماغ بس کھانے پینے میں ہی اٹکا رہتا ہے؟"

"نہیں خیر، دل تو کہیں اور ہی اٹکا ہے۔" شایان کی آنکھیں جگمگائیں۔

"قابو میں رکھو دل کو، ایسا نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

رامین کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ شایان کو ہنسی آگئی۔ مگر دھمکی کو ایک طرف کر کے اس نے پھر سوال دہرایا۔

"آج کا مینیو تو بتادو؟"

"کابلی پلاؤ، اور......"

"ایں......وہ تو ڈراما ہے نا؟" شایان کو لگا وہ مذاق کر رہی ہے۔

"یہ ایک افغانی ڈش بھی ہے۔" رامین نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"جانتا ہوں، مذاق کر رہا تھا۔" شایان ہنسا۔

"پرسوں کی طرح؟"

"وہ مذاق نہیں تھا۔ بالکل بھی نہیں۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا؟ مذاق نہیں تھا تو کیا مسٹیک تھی؟"

"ایک آرزو، خواہش، تمنا، جو چاہو سمجھو۔"

"ٹھہر جاؤ، چچا سے لگاتی ہوں تمہاری شکایت، پھر وہی ٹھیک کریں گے تمہیں۔"

"ذرا سی دیر میں دو بار دھمکا چکی ہو مجھے، بالکل لیڈی ڈان لگ رہی ہو، اور جہاں تک چچا کی بات ہے تو سب سے زیادہ خوش وہی ہیں۔"

"کیا؟" رامین چونک پڑی، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کمرے سے دڈو کی پکار سنائی دی، وہ رامین کو بلا رہی تھیں۔

"تمہارا موبائل بج رہا ہے۔"

"جی اچھا!" پیشانی پہ سوچ کی ایک لکیر سجائے وہ کمرے سے چلی گئی۔

"پتا نہیں یونہی کہہ رہا ہے یا سچ مچ چچا کے آگے کچھ اول فول بک دیا؟"

☆☆☆

"مانو!" موبائل میں غرق تھی، جب امی اس کے پاس آکر بیٹھیں۔

"بات سنو۔" انہوں نے بیٹی کا کندھا ہلایا۔

"ہوں......"

"اسے بند کرو اور ذرا میری بات سنو۔"

"جلدی جلدی بول دیں امی!" بیٹی نے بادل ناخواستہ فون آف کیا۔

"رامین سے کوئی بات ہوئی تمہاری؟ یہ جو شانی نے شوشا چھوڑا ہے اس کے متعلق؟"

"نہیں۔" مانو نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں کی؟ کچھ نہیں کہا؟ دو گھنٹے تم اس سے باتیں بگھار کے آگئی ہو۔" امی کو حیرت ہوئی۔

"سچ کہہ رہی ہوں، رامین نے اس ٹاپک پہ کچھ نہیں کہا۔ ہم تو بس اپنی ہی باتیں کرتے رہے۔"

"اچھا بات سنو۔" امی نے رازدارانہ انداز میں مانو کو مخاطب کیا۔ "آج رامین کو بتا دینا، کہ شانی کیا ضد کر رہا ہے۔ اور......"

"اچھا بتا دوں گی۔" مانو نے پوری بات سنے بغیر جلدی سے ہامی بھری اور موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پوری بات تو سن لو۔" امی نے دانت کچکچاتے ہوئے موبائل اپنے قبضے میں لیا۔

"جی!" وہ جی بھر کے بے زار ہو رہی تھی۔

"اس کو بتا دینا کہ امی بہت غصے میں ہیں۔ بالکل بھی ایگری نہیں ہیں۔" ملیحہ نے اس کے کندھے پہ بندوق رکھ کر چلائی۔ "اور یہ بھی بتا دینا کہ میں شانی کے لیے لڑکی فائنل کر چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، بتا دوں گی۔ اب تو دے دیں موبائل۔" مانو نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"توبہ ہے، تم لوگوں سے، ایک منٹ اس کے بغیر گزارا نہیں ہے۔ آکسیجن کے بغیر سانس لے لیں گے موبائل کے بغیر نہیں۔" انہوں نے کلستے ہوئے بیٹی کے ہاتھ میں موبائل دیا۔

"جب چارجنگ ختم ہو جائے تو برتن دھو لینا، اس سے پہلے تو جان چھوڑو گی نہیں موبائل کی۔"

مانو نے ان کی بات توجہ سے سنی یا نہیں مگر اثبات میں سر ضرور ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

دڈو کا معمول تھا۔ رات کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر چہل قدمی ضرور کرتی تھیں۔ اپنے معمول سے فراغت پا کر کمرے میں آئیں تو رامین ان کی منتظر تھی۔

"شانی نے آپ سے بات کی تھی میرے متعلق؟"

"ہاں بھئی، کی تو تھی۔" دڈو نے سہولت سے تکیے پہ سر رکھا۔

"آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے؟"

"ابھی تو میں خود سوچ بچار کر رہی تھی۔ آج کل میں بتا ہی دی۔

"چچی کا موڈ آف ہے۔ بہت زیادہ۔" رامین نے اطلاع دی جو اسے مانو کے ذریعے پہنچی تھی۔

"وہ تو ہونا ہی ہے، بیٹا اپنی مرضی کا اظہار کرے، اپنی شادی کے معاملے میں تو ہر ماں ان سیکیور ہو جاتی ہے۔" دڈو نے ہنسی سی اڑائی۔

"میں اس فضول ایکسر سائز کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔ شانی کو ذرا اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔" رامین بیٹھے بیٹھے گرم ہینڈ لوشن سے اپنے ہاتھوں کا مساج کر رہی تھی۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ میں، تمہیں سمجھاؤں، تم کہتی ہو کہ میں اسے سمجھاؤں۔ تم دونوں ڈائریکٹ ایک دوسرے کو کیوں نہیں سمجھا لیتے؟"

"کوشش کی تھی میں نے سمجھانے کی مگر وہ خود کو رومیو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"کیا حرج ہے، گھر کا بچہ ہے۔ دیکھا بھالا، ہر خوبی، خامی سے واقف ہیں اس کی، تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔" دڈو نے صلاح دی۔

"ثروت کی کال آئی تھی۔ عالیہ کو بلاؤں یا رہنے دوں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"بلا لیں، انہیں بھی دیکھ لیتے ہیں۔" رامین جھلا گئی۔

☆☆☆

کچن کاؤنٹر پہ سامان ادھر سے ادھر تک پھیلا ہوا تھا۔ مختلف سبزیاں، گوشت، مسالے۔

ملیحہ بیگم جی جان سے لگی ہوئی تھیں۔

"دونوں باپ بیٹے چٹورے ہیں۔ بیوی اور بہو بھی ایسی چاہیے جو اچھے اچھے کھانے بنا کر ٹھونساتی رہے اب میں بھی نئی نئی ڈشز بنا کر کھلاؤں گی۔ یہ دونوں سمجھتے ہیں۔ رامین کے سوا دنیا میں کسی کو کچھ پکانا نہیں آتا۔ آج میں بھی ثابت کر دوں گی میں کسی سے کم نہیں۔" بیگم صاحبہ کے خوب صورت چہرے پہ برہمی تھی اور عزم بھی۔

یوٹیوب پہ کوکنگ ویڈیو دیکھتے ہوئے وہ اپنی مہم

پر لگی ہوئی تھیں۔

"آج کل کوکنگ کرنا کون سا مشکل ہے۔ ہزاروں ویڈیوز ہیں۔ دیکھ دیکھ کر ایک سے ایک چیز بنالو۔"

بیٹی سے مخاطب ہو کر انہوں نے گیان دیا۔ جو آج کی مہم میں ان کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی، اور اس ایڈونچر پہ دل بھر کے بیزار ہو رہی تھی۔

"آپ نے بھی ڈھونڈ کر اتنی مشکل ریسیپی نکالی ہے۔ سینکڑوں تو انگریڈیئنٹس ہیں اس میں۔" مانو نے درجنوں پیالیوں، پلیٹوں پہ نگاہ کی جن میں مختلف مسالے رکھے تھے۔

"جتنا گڑ ڈالو، اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ بس دیکھتی جاؤ آج تمہارے ابو اور بھائی کو کیسا سرپرائز ملے گا۔"

اور واقعی میز پہ رکھی نامانوس قسم کی ڈشوں کو دیکھ کر طارق صاحب اور شانی دونوں سرپرائزڈ ہی ہو گئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" شانی نے ہی سوال میں پہل کی تھی۔

"یہ ہیں انڈونیشین ٹھنڈے ملائی کوفتے ودھ ملائیشین بیف اسٹکس کورین سوپ اینڈ تھائی رائس۔" بیگم صاحبہ نے فخریہ اپنے کارنامے کا نام بتایا۔

طارق صاحب کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ انہوں نے پلیٹ میں سب کچھ ڈال کر کھانے سے پہلے چکھا اور پھر بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"بیگم! کھانے کو پہلے آنکھیں قبول کرتی ہیں پھر زبان اور پھر معدہ لیکن اس کھانے کے لیے یہ تینوں اعضا تین حرف بھیجنے کی فریاد کر رہے ہیں۔"

مانو اور شانی دونوں ہی کھی کھی کرنے لگے۔ ملیحہ بیگم تپ گئیں۔

"چپ کرو بدتمیزو! ان کو تو عادت پڑ گئی ہے میرے پکائے ہوئے ہر کھانے میں نقص نکالنے کی۔ اپنے ہاتھ سے پانی کا گلاس بھی دوں تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی برائی نکال دیں گے۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" مجازی خدا نے فوراً تردید کی۔ "آپ کے پانی میں کوئی خوبی ہو نہ ہو مگر چائے میں بالکل پانی کا مزا ہوتا ہے۔"

"دیکھا، کیسی دل جلانے والی باتیں کرتے ہیں ایک تو اتنی محنت کرو۔ اوپر سے ان کی جلی کٹی باتیں سنو۔ اسی لیے تو مجھے کوئی شوق نہیں ہوتا۔ کچن میں جل سڑ کے ہنڈیاں بھوننے کا۔"

"اتنی محنت کے بعد امی کا غصہ بچوں کو تو جائز لگ رہا تھا۔ مگر مجازی خدا کی زبان تالو سے نہیں لگتی تھی۔

"اب یہ تہمت مجھ پہ تو نہ لگاؤ، کچن میں گھسنے کا شوق تمہیں پہلے بھی نہیں تھا، کئی بار کہا ہے۔ کسی کھانا پکانے والی کو رکھ لو۔"

"دو عورتوں کو رکھا تو تھا، دونوں چور نکلیں، راشن چرا چرا کر لے گئیں میرا، بلکہ برتن بھی غائب کر دیے تھے۔"

"کس نے کہا تھا کہ کچن پورا ہی ان کے حوالے کر کے خود بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ملازموں کے سر پہ سوار ہو کر کام کروانا پڑتا ہے۔"

"میں اپنا کچن کسی کے حوالے نہیں کر رہی۔" ملیحہ بیگم کو اس بارے میں بہت تلخ تجربات ہوئے تھے۔

"اُفوہ......" شانی دونوں کی بحث اور تکرار سے تنگ آ گیا تھا۔

"امی، اس کھانے کا تو بتا دیں، کیسے کھانا ہے؟ روٹی کے ساتھ یا چاول کے ساتھ، چمچے سے کانٹے سے، یا سلاد کے ساتھ؟"

"میرے کلیجے کے ساتھ۔" ملیحہ بیگم نے غصے میں وہاں سے واک آؤٹ کیا۔

"میں نے ایسا کیا پوچھ لیا؟" شانی حیران تھا۔

☆☆☆

سرد ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ ماسی ابھی تک نہیں آئی تھی، ملیحہ بیگم اور مانو کمبل میں دبکی ہوئی تھیں۔ مدیحہ خالہ کی کال آئی، انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع دی اور آمد کی

غایت بھی بتائی۔
ملیحہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ فٹافٹ انہوں نے پہلے اپنی ہیلپر کو فون کھڑکایا اور فوراً آنے کی ہدایت دی، پھر مجازی خدا کو کال کر کے اطلاع دی۔ کچھ ہدایات دیں۔ اس کے بعد انہوں نے کمبل تہہ کر کے رکھ دیا۔

"امی! میں رامین سے کچھ بنوالوں شام کے لیے؟"

"رہنے دو، بازار میں سب کچھ ملتا ہے۔ منگوالوں گی میں" امی نے منہ بنایا۔

مانو ان کے انکار کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ خاموش ہو گئی۔ مگر ماں کی نظر بچا کر چپکے سے رامین کو میسج کر کے اطلاع ضرور دے دی تھی۔ اس نے فوراً ہی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارک باد دے دی۔

خالہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ رہی تھیں۔ وجیہہ، خوش حال اور کماؤ پوت، خاندان میں سب کی نظریں ارباز پر تھیں مگر قرعہ فال مانو کے نام نکلا تھا۔

☆☆☆

شام تک مہمان بھی آ گئے۔ ابو بھی شوروم سے آ گئے تھے۔ خالہ ان کے شوہر اور ارباز کے علاوہ بیٹی داماد اور چھوٹا بیٹا، سب ہی آئے تھے ارباز کی میٹھی میٹھی نگاہیں خود پہ محسوس کر کے مانو سمٹ سی گئی۔

سب کچھ دیکھا بھالا تھا۔ پھر بھی ابو نے رسمی طور پر سوچنے کے لیے وقت لیا ددو گھٹنوں کی تکلیف کے سبب سیڑھیاں چڑھنے سے قاصر تھیں۔ لہٰذا مہمان اور میزبان ددو کے کمرے میں محفل جما کر بیٹھے تھے کچھ دیر ددو سے گفتگو کر کے سب کے سب پھر اوپر کے پورشن میں چلے گئے۔

ملیحہ بیگم نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے بازار سے پکا پکایا کھانا منگوایا تھا۔ شوہر صاحب کو کہا تھا۔ انہوں نے بازار سے لینے کے بجائے، رامین کو آرڈر کر دیا تھا۔ ملیحہ بیگم کو تب علم ہوا جب تیار کھانا ان کے کچن میں آیا۔

"رامین سے بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ پکا پکایا کسی ریسٹورنٹ سے لے آتے۔" وہ شوہر کے سامنے بڑبڑائیں۔

"پہلی بار بنوایا ہے کیا؟ کتنی بار کچھ نہ کچھ بنواتی ہی رہتی ہو تم۔ جیسے وہ باہر سے آرڈر لیتی ہے۔ ایسے ہی میں نے دے دیا۔ کیا ہوا؟"

ملیحہ بیگم، مجازی خدا کے آگے تو مزید کچھ نہ بولیں مگر اپنی آپا کے آگے دکھڑا رونے سے باز نہ آئیں۔

"شانی کو کیا نظر آ گیا اس لڑکی میں؟" خالہ بھی حیران ہوئیں۔

"ٹھیک ہے، کوکنگ اچھی کرتی ہے۔ تو کیا ہوا؟ بازار میں ہر چیز ملتی ہے بنی بنائی، پکی پکائی، خریدو اور کھاؤ۔" دونوں بہنوں کے خیالات بہت سے معاملات میں ایک جیسے ہی تھے۔

"پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ پتا نہیں کیا جادو کر دیا ہے میرے بچے پر۔"

"پریشان مت ہو۔ میں کچھ نہ کچھ بندوبست کرتی ہوں۔" خالہ نے بہن کو تسلی دی۔

رات کے کھانے پہ خاصا اہتمام تھا۔ مٹن بریانی، فرائی فش، چپلی کباب، نرگسی کوفتے، آلو بخارے کی چٹنی، سلاد، رائتہ اور گرما گرم سوپ اور مانو کی پسند کا پیزا، خاص تحفہ۔

سب نے کھانے کی تعریف کی اور خوب ڈٹ کے کھایا۔ جو بذات خود ایک تعریف تھی۔ رامین نے چچا کے بہت اصرار پر بھی صرف سامان کی رقم لی۔ اپنی محنت کی نہیں۔ بہن جیسی پیاری مانو کے لیے اس کی خوشی کے موقعے پر اتنا تو کر ہی سکتی تھی۔

☆☆☆

سوچ بچار کے لیے رسمی طور پر جو وقت مانگا تھا وہ تیسرے چوتھے روز تمام ہوا۔ خالہ خود آئی تھیں جواب لینے اور انہیں "ہاں" میں جواب دے دیا گیا۔ مانو بوکھلائی بوکھلائی سی پھر رہی تھی۔

"ایں...... یہ سب اتنا آسان بھی ہوتا ہے؟"

خالہ کے خود آنے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ جو

انہوں نے بہت راز داری کے ساتھ اکیلے میں بیان کیا۔

''یہ لو۔'' انہوں نے ملیحہ بیگم کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھمایا۔

''یہ کیا ہے؟''

''شانی کے لیے تعویذ لائی ہوں۔ تین دن پانی یا چائے وغیرہ میں گھول کر پلا دینا۔ بہت زود اثر ہے۔ دیکھنا اس کا نام لینا بھی بھول جائے گا۔ وہاں کا رخ بھی نہیں کرے گا۔'' خالہ کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ فوراً ہی انہیں بھی یقین آ گیا۔

تعویذ نے پہلے ہی روز کام کر دکھایا مگر آدھا۔ جس روز صبح انہوں نے وہ چائے میں گھول کر پلایا۔ اسی روز دوپہر میں شانی دکان سے گھر واپس آ گیا۔ اسے بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔ اور اگلے تین روز تک رہا۔

وہ بخار میں تپتا اپنے کمرے تک محدود ہو گیا۔ نیچے جانے کی، رامین کی طرف رخ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی مگر رامین کا نام نہ لینے والا اثر تعویذ نے نہیں دکھایا۔ تینوں دن وہ مانو کے پیچھے پڑا رہا کہ رامین سے یخنی، دلیہ وغیرہ بنوا کر لے آئے۔

مانو امی کے حکم کی پابند تھی۔ مگر رامین کسی کے حکم کی پابند نہیں تھی۔ یخنی میں بنا ہوا دلیہ جس میں چکن کے ریشے اور پسی ہوئی کالی مرچ موجود تھے۔ پیالہ بھر کے شانی کے لیے آیا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اسے علم نہیں ہوا۔ ملیحہ بیگم کو فکر ہوئی۔

''کہیں کوئی جادو ٹونا تو نہیں کیا، کھانے کے ذریعے؟'' ان کے دل میں چور تھا۔ دوسرے بھی انہیں چور دکھائی دے رہے تھے۔

''نہیں نہیں۔ رامین ایسی نہیں ہے۔'' مانو نے فوراً پرزور الفاظ میں نفی کی۔

''تمہیں کیا معلوم؟ دنیا دیکھو گی تو پتا چلے گا۔ لوگ کیسے دوغلے ہوتے ہیں۔ اندر سے کچھ، باہر سے کچھ۔''

''مگر رامین تو بہت سویٹ ہے۔'' مانو نے بھاپ اڑاتا ڈش نما پیالہ کاؤنٹر پہ رکھا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''بھائی کو جگا کر دے دوں؟ چائے اور دودھ کے ساتھ سلائس، رسک اور بسکٹ کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔''

''نہیں ہرگز نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ جانے کیا گھول گھول کر پلاتی رہی ہے جو ایسے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

''میں کھالوں؟ بھوک لگ رہی ہے، ابھی تک تو کچھ بنایا بھی نہیں آپ نے۔''

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔'' امی جان نے اعتراف کیا۔

''یہی کھالیں پھر؟ خوشبو کتنے مزے کی آ رہی ہے۔'' مانو کو اتنی بھوک میں صبر کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔''

''کوئی گڑبڑ نہ ہو اس میں؟'' امی نے پھر خدشہ ظاہر کیا۔

''کیا ہو گیا ہے امی آپ کو؟ سینکڑوں چیزیں کھائی ہیں رامین کے ہاتھ کی، اب پتا نہیں کس بات کا وہم ہو گیا ہے۔'' مانو جھنجلائی۔

''چلو اللہ کا نام لے کر کھا لیتے ہیں۔ کچھ ہو گا بھی تو ہم پہ تھوڑی اثر ہو گا۔'' امی نے جیسے خود کو بہلایا۔

''بھائی کے لیے الگ نکال دیتی ہوں۔ اٹھیں گے تو دے دوں گی۔''

''نہیں نہیں۔ اسے مت دینا۔ بس خود ہی کھا کر ختم کر دو۔'' امی کا لہجہ ڈھلمل سا تھا۔ اصل میں تو انہیں رامین سے اس قسم کی حرکت کی امید بھی نہیں تھی۔ مگر بس دل کا چور اکسا رہا تھا۔

☆☆☆

مہمان بالآخر آ ہی گئے۔ ڈرائنگ روم میں ثروت دادی۔ ددو، عالیہ آنٹی اور ان کا لائق فائق بیٹا موجود تھے۔

رامین کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

اور اس سے ذرا ہٹ کے شایان کھڑا بحث کر رہا تھا۔
"تم نے آخر ان مہمانوں کو کیوں آنے دیا؟"
"میں جواب دے چکی ہوں اس بات کا۔" رامین نے کانوں میں ٹاپس پہنے۔
"میں تمہیں برا لگتا ہوں؟" اس کے چہرے پہ مایوسی اور اداسی رقم تھی۔
"تم اچھے ہو شایان! بہت اچھے۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ آج کل چچی جان کو میں اچھی نہیں لگ رہی اور مجھے ان کی یہ بات۔" رامین نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور شایان کی طرف رخ کیا۔
"میں نہیں چاہتی کہ ساری زندگی انہیں بری لگتی رہوں۔"
"یہ سب وقتی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بلیومی۔"
"اور اگر نہیں ہوا تو؟" رامین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہاں وہاں سادگی، سچائی اور خلوص تھا۔ مگر......
عزت نفس سب سے پہلے ہے۔ محبت سے بھی پہلے پسند لگاؤ، شوق اور انسیت سے بھی پہلے۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں ثروت دادی چہک رہی تھیں۔ عالیہ آنٹی کے چہرے پہ خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ ددو اپنے مخصوص، باوقار انداز میں زوار سے بات کر رہی تھیں۔ زوار نپے تلے، اور محتاط اور مختصر جواب دے رہا تھا۔
رامین کا سنہری چہرہ بے تاثر تھا۔ میز پہ لوازمات سجے تھے۔ ثروت آنٹی اس کی کوکنگ سمیت دیگر معاملات میں تعریفوں کے پلندے باندھ رہی تھیں۔ عالیہ آنٹی نے بھی ذائقے کی تعریف کی تو وہ مسکرا دی۔ شایان وہاں بیٹھا جز بز ہو رہا تھا۔ اور خود کو کوس رہا تھا۔ آخر وہ وہاں آ کر بیٹھا ہی کیوں؟
"بات یہ ہے۔" عالیہ آنٹی کھنکھاریں۔
"ہمارے پاس زیادہ دن نہیں ہیں۔ واپسی سے پہلے، مختلف شہروں میں رشتے داروں سے ملنے بھی جانا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔ اس طرف سے کام پکا کر کے بے فکر ہو جاؤں۔" انہوں نے اپنا بیگ کھولا۔
"آپ کی فیملی تو بچپن سے ہی دیکھی بھالی ہے میری اور رامین نے بہت امپریس کیا ہے مجھے، کئی رنگ آپ ہی کے جھلکتے ہیں اس میں۔"
وہ ددو کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ بیگ سے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک ڈبیا تھی۔ خوب صورت مخملیں ڈبیہ "میں انگوٹھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔ آپ کی اجازت ہو تو بسم اللہ کروں؟"
شایان کا چہرہ فق ہو گیا۔ زوار حیران تھا۔ رامین سراسیمہ ہو گئی اور ددو کے چہرے پہ اضطراب کا عالم تھا۔
"میں پہلے رامین سے ......؟" ددو نے دھیرے سے بات کا آغاز کیا ہی تھا کہ زوار کی بلند اور تیز آواز میں ان کی دھیمی آواز دب گئی۔
"اٹس ناٹ فیئر! آپ ایسے کیسے یہ کر سکتی ہیں؟ آپ نے کہا تھا، ہم ابھی مل کر واپس آ جائیں گے۔" زوار کے چہرے پہ برہمی تھی۔ سب کے چہروں پہ موجود مسکراہٹ کملانے لگی۔
عالیہ آنٹی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔
"زوار! ہم یہ بات گھر پہ کر سکتے ہیں۔" وہ بہت مشکل سے مسکرائی تھیں۔ "آپ رنگ اپنے ساتھ لائی ہیں اور مجھے خبر بھی نہیں۔" زوار کی برہمی کچھ اور ہی کہانی بتا رہی تھی۔ جو اگلے چند لمحوں میں سامنے آ گئی۔
"آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ امی اتنی جلدی سب کچھ فائنل کر لیں گی۔ میں......"
"تم نے زوار سے بات نہیں کی تھی آنے سے پہلے؟" ثروت دادی نے عالیہ آنٹی کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جن کے چہرے کی بے یقینی غصے کی سرخی میں بدلنے لگی تھی۔
"زوار ......!" انہوں نے بیٹے کو سخت آواز میں پکارا تو اس میں فہمائش تھی۔ مگر زوار پندرہ سال پہلے کا اسکول اسٹوڈنٹ نہیں تھا۔ جوان کی آواز اور

لہجے کی سختی پر سہم جاتا یا دبک جاتا۔ وہ تو کسی کہانی، ڈرامے یا فلم کے کردار کی طرح سب کو حیران کرنے لگا تھا۔

"آئی ایم سوری، مجھے ایجوکیٹیڈ اور کانفیڈنٹ لائف پارٹنر چاہیے۔ جو کچن میں اپنا ٹائم پاس کرنے کے بجائے میرے سرکل میں، میرے ساتھ موو کر سکے۔"

کمرے میں سناٹا تھا۔ ددو نے ایک گہری سانس لی اور اپنی عینک ٹھیک کر کے جملہ حاضرین پہ ایک نظر دوڑائی، عالیہ آنٹی کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ساتھ خفت کی سرخی بھی تھی۔ ثروت دادی خجالت کا شکار تھیں۔ وہ رامین کی ان ہی صلاحیتوں کی تعریف کرتی رہیں جو کچن سے متعلق تھیں۔ عمومی افراد کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ مگر کوئی فرد ایسا بھی ہوتا ہے جس کے نزدیک یہ معاملات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ زواران ہی میں سے ایک تھا۔

رامین کا چہرہ بے تاثر ہی تھا۔ شایان کا چہرہ سب سے الگ نظر آ رہا تھا۔ جس پہ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا اور پھر بالآخر وہ بول ہی اٹھا۔ جب مہمان نے لحاظ نہیں کیا تو وہ کیوں مروت کا مظاہرہ کرتا۔

"محترم! آپ کو اپنی مرضی اور پسند یہاں آنے سے پہلے اپنی والدہ کو بتا دینی چاہیے تھی۔ یہاں آ کر اس طرح کی باتیں کرنے کا کیا مقصد ہے؟"

شایان نے کھڑے ہوتے ہوئے رامین کی طرف رخ کیا۔

"اب تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ کچھ اور سننا باقی ہے؟" وہ جھنجلایا اور رامین مسکرادی اور کھڑی ہو گئی۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" اس نے زوار کو مخاطب کر کے سر خم کیا اور باہر نکل گئی۔

کمرے میں گئی تو شایان پیچھے پیچھے آ گیا۔ وہ اس وقت کوئی زخمی شیر لگ رہا تھا۔

"کس بات کا شکریہ ادا کر رہی تھیں تم؟"

"فیصلہ کرنا آسان ہو گیا ہے اور ویسے وہ شکریہ تمہاری طرف سے کیا تھا۔" رامین ایکوریم کے پاس کھڑی تھی۔

"میری طرف سے؟" شایان نے اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اور رامین کی بات سمجھ کر دھیمے سے مسکرایا۔

"جب تک تم ایگری نہیں ہوتیں۔ کسی کے انکار سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے ایکوریم میں تیرتی مچھلیوں پہ نگاہ جمائی۔ جن کے رنگ بڑے خوب صورت تھے۔ محبت کی طرح۔

"مگر اس وقت تک اسے سارے ہی رنگ پھیکے اور مدھم لگ رہے تھے۔ زندگی کے بھی۔ محبت کے بھی، شانی، ددو کی رائٹنگ چیئر پہ بیٹھ گیا۔ جس کے نیچے براجمان زلیخی کی موٹی گھنیری دم اس کے قدموں میں تھی۔"

"تو پھر جاؤ۔ چچی کو راضی کر لو۔" رامین نے ایکوریم کے شیشے پہ انگلیاں پھیریں۔

"ہیں؟" شایان نے پہلے تو بے یقینی سے آنکھیں پھاڑیں۔ پھر دھیرے دھیرے بے یقینی کی جگہ خوشی نے لے لی۔

"سچ مچ؟" ایکوریم میں تیرتی مچھلیوں کے رنگ آج سے پہلے اتنے دلکش، اتنے خوب صورت پہلے کبھی نہیں لگے تھے۔

"ویسے مجھے معلوم تھا، تم مان جاؤ گی۔"

"کیسے؟"

"سنا ہے کہ محبت خود کو منوا لیتی ہے۔"

"یہ تو محبت کا کمال ہوا۔ انسان کا کیا کمال ہے؟"

"تو محبت بھی انسان ہی کرتا ہے نا، کوئی مچھلی یا بلی تو نہیں۔" شایان نے نیچے جھک کر زلیخی کو تھپتھپایا جس کی دم اس کے پیر میں گدگدی کر رہی تھی۔

"مہمان کے سامنے تمہارا بولنا اچھا لگا۔" رامین کی نگاہیں ایکوریم میں موجود مصنوعی گھاس اور رنگ برنگے پتھروں پر تھیں۔

"میں تو اور بھی بہت کچھ کہنے والا تھا۔ ددو نے اشارے سے روک دیا۔" شایان نے انکشاف کیا۔

"مجھے بھی ان کی آنکھوں سے تنبیہہ کے سگنلز موصول ہوئے تھے، خاموش رہنے کے ورنہ تم جانتے ہو مجھے۔" رامین کا چہرہ پر سکون تھا جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

"تم ہرٹ ہوئی ہو اس کی بات سے؟"

"انکار سے تو نہیں ہوئی۔ اقرار سے شاید ہو جاتی۔" رامین کے لبوں پہ ایک مطمئن تبسم ٹھہر گیا۔

زیفی شایان کی گود میں چڑھ رہی تھی۔ شایان نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اتنے میں ددو اندر داخل ہوئیں۔ زیفی شایان کی گود سے چھلانگ مار کر نیچے اتری اور ددو کے قدموں میں لوٹ لگانے لگی۔

ان کے پیچھے پیچھے ثروت دادی آئی تھیں۔ مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتی ہوئی آئیں اور بیڈ پر ٹک گئیں۔

"میں اب چلتا ہوں۔" شایان اٹھ کھڑا ہوا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

"میں نے تو بڑی نیک نیتی سے کوشش کی تھی۔ مگر......"

ثروت دادی کا ہر وقت ہنستا مسکراتا چہرہ اس وقت بجھا بجھا سا تھا۔

"اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تم کیوں اپنا دل چھوٹا کر رہی ہو؟ تمہارا قصور تھوڑا ہے۔" ددو نے بردباری سے کہا اور زیفی کو چمکارنے لگیں جو ان کے برابر میں بیٹھ کر سستی کے عالم میں جمائی لے رہی تھی۔

رامین کے موبائل کی میسج ٹون بار بار بج رہی تھی۔ اس نے چیک کیا۔ مانو کے پیغامات ایک تواتر سے آ رہے تھے۔

"رات میں بات کریں گے۔" رامین نے اسے جواب دے کر موبائل آف کیا۔

☆☆☆

سردی کا موسم اور مہینہ آ گیا تھا۔ مگر سردی تھی کہ

بھلے وقتوں کی شرمیلی دلہن کی طرح گھونگھٹ ڈالے بیٹھی تھی۔ دونوں نے ایک جیسے لباس پہنے ہوئے تھے جو ابھی سیزن شروع ہونے سے پہلے خریدے تھے۔ جینز کے ساتھ شنیل کی کرتیاں، گلے میں اسٹالر۔

چھت پہ ٹھنڈی ہوا تھی۔ جو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سامنے گرما گرم مونگ پھلیوں کا ڈھیر تھا۔ جس میں سے آدھی کھا چکی تھیں اور اس کے دوران رامین نے آج کی تازہ ترین تفصیلات بھی اسے بتا دی تھیں۔ جنہیں سن کر مانو نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔ اور زوار کو بے وقوف کے لقب سے نوازا اور ساتھ ہی رامین کو اطلاع دی۔

"کل ہم لڑکی دیکھنے جائیں گے۔"

"اچھا؟" رامین کو ہنسی آ گئی۔ "چچی نے کہا ہوگا یہ اطلاع مجھ تک پہنچانے کے لیے؟"

"تمہیں ہر بات پتا چل جاتی ہے؟" مانو کھسیانی ہو گئی۔

"اور کوئی نئی تازی؟ تمہاری سسرال کی آمدان کی کوئی خیر خبر؟"

"سب ٹھیک ہیں۔" مانو شرما گئی۔

"کتنی کیوٹ لگ رہی ہو شرماتے ہوئے۔"

"یہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔" مانو اور بھی گلابی ہو گئی۔

"اف مانو تم! اور تمہارے یہ۔" رامین لوٹ پوٹ ہو گئی۔

☆☆☆

کھڑکی کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔ کھلی کھڑکی سے دھوپ کی نرم گرم کرنیں اندر داخل ہوئیں اور سب جگہ پھیل گئیں۔

ملیحہ بیگم صوفے پہ بیٹھی بڑی بہن سے باتیں کر رہی تھیں۔ بلکہ اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔

"کیا بتاؤں، لڑکا تو پہلے ہی ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ طارق بھی بیٹے کے حمایتی بنے ہوئے ہیں۔ اور بیٹی کو بھی میرے اعتراض اور انکار پہ حیرانی ہے۔ بتائیں، میں کیا کروں۔ سب ہی میرے خلاف ہو

گئے ہیں۔" ان کی آواز میں رقت آ گئی۔
"میں ایک ترکیب بتاؤں؟"
"ہاں ہاں بتائیں۔" ملیحہ بیگم پرجوش ہوئیں۔
"اس لڑکی کو کسی لڑکے کے ساتھ انوالو کردو۔"
"کیا مطلب؟"
"ارے بھئی، گھر میں بتاؤ کہ اس کا چکر چل رہا ہے کسی اور لڑکے کے ساتھ؟ مرد کے دل میں اگر ایک بار شک آ جائے نا عورت کے خلاف تو پھر اسے منہ نہیں لگاتا وہ، چاہے کتنی ہی محبت اور چاہت کا دعوا ہو۔"
"مگر...... آپا! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔" ملیحہ بیگم نے کمزور سی آواز میں رامین کا دفاع کیا۔
"افوہ...... تمہیں بیٹے کی جان چھڑانی ہے یا نہیں؟" آپا چڑ گئیں۔
"وہ تو ٹھیک ہے مگر ایسا جھوٹا الزام؟ یہ تو بہت غلط بات ہو جائے گی۔" وہ تذبذب سے بولیں۔
"ہونا، سدا کی بے وقوف، یا تو شرافت دکھالو، یا بیٹا بچالو۔"
"امی...... ی...... ی......!" شانی کی آواز آئی۔
"اچھا آپا! شانی آ گیا ہے۔ بعد میں بات کرتی ہوں آپ سے۔"
انہوں نے جھٹ سے اللہ حافظ کہہ کر کھٹ سے موبائل آف کیا۔ اور بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئیں جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔
"لنچ تیار ہے تو ابو کے لیے دے دیں۔"
"اور تم؟"
"مجھے بھوک نہیں ہے ابھی۔" وہ صوفے پہ بیٹھ گیا۔ چہرے پہ اداسی اور پریشانی تھی۔
"چائے بنا دوں؟" انہوں نے بیٹے کی پسند کا نام لیا۔
"دل نہیں چاہ رہا۔" شایان نے آنکھیں موند کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔
"کیا ہوا، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" ملیحہ بیگم کو تشویش ہوئی، اتنا خاموش اور اتنا اداس تو وہ پہلے کبھی نہ تھا۔
"کیا فرق پڑتا ہے۔ طبیعت ٹھیک ہو یا خراب؟" شایان کی آواز اور انداز میں کچھ تھا۔ جس سے وہ ٹھٹھک گئیں۔
"کیوں نہیں فرق پڑتا، میں ماں ہوں تمہاری۔"
شایان چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔
"میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ آپ میری ماں ہیں۔ میری ہر خواہش، ہر خواب میں میرے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ مگر میں غلط تھا۔ آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں۔"
روٹھا روٹھا شایان اس لمحے بے حد اجنبی سا لگا۔ وہ یک دم ڈر گئیں۔
"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو شایان؟ ماں کی محبت پہ شک ہے تمہیں؟" انہوں نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اتنا سنجیدہ، اتنا تلخ، ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
"آپ لنچ دے دیں۔ ابو انتظار کر رہے ہوں گے۔" شایان نے جواب دینے کے بجائے بات پلٹ دی۔
"پیک کر کے دیتی ہوں۔" وہ مضمحل انداز میں قدم اٹھاتی کمرے سے نکلیں مگر ان کا دل وہ نہیں رہا تھا جو شایان کے آنے سے پہلے تھا۔
ان کے جاتے ہی شایان نے موبائل نکال کر اشعر کو پیغام بھیجا۔ "ڈن" اس کے ساتھ ایک ایموجی، انگوٹھا اوپر کر کے فاتحانہ انداز......
جواب میں اشعر کا جواب تفصیلی تھا۔
"پیارے! میں نے کہا تھا نا کہ یہ جو امیاں ہوتی ہیں ایموشنز والی ہوتی ہیں۔ اپنی بات منوانی ہے تو اپنی شکل کو ٹریجڈی فلم کا ٹریلر بنالے، مسکین اور فاقہ زدہ۔ پھر دیکھ، ایک ماں کا دل کیسے پگھلتا ہے۔"
"مانتا ہوں استاد۔" شایان نے دوست کو خراج تحسین پیش کیا۔
امی کے قدموں کی آہٹ آ رہی تھی۔ وہ جلدی

سے دیو داس کا دلیپ کمار اور شاہ رخ دونوں بن گیا۔

☆☆☆

لنچ کا ٹفن ہاتھ میں لیے، سیڑھیاں اترتا ہوا۔ نیچے آیا تو باہر نکلنے سے پہلے حسب عادت کچن میں جھانکا۔

''ہیلو۔'' خود کو روکتے روکتے بھی وہ اندر چلا آیا۔

رامین کاؤنٹر پہ سامان سجائے اپنے کام میں مصروف تھی۔

''تم گئے نہیں ابھی تک؟ چچا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''جا رہا ہوں۔'' شایان کی نگاہیں، رامین سے ہوتی ہوئی۔ کاؤنٹر پہ جا ٹکیں۔

''یہ کیا ہے؟'' ایک پیالے میں کالے سیمنٹ جیسا سفوف دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''باجرے کا آٹا ہے۔ میٹھی ٹکیاں بناؤں گی۔ سردی تو یہاں نخرے دکھا دکھا کر آتی ہے۔ اس کی سوغات بنانے کے لیے اور کتنا انتظار کریں۔''

رامین نے بولتے بولتے گڑ بھگویا۔ اور ایک پیالی میں سفید تل نکالے۔

''ایک بات تو بتاؤ۔'' شایان نے پھر کچھ پوچھنے کے لیے تمہید باندھی۔ اور رامین نے اسے گھور کے دیکھا۔

''تم ایسا کرو۔ کوئسچن پیپر بنا کر لے آؤ، ایک ہی بار، میں سارے سوالوں کے جواب اکٹھے دے دوں گی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی سوال لے کر میرے سر پہ کھڑے ہو جاتے ہو؟''

''تم نے کیا سوچ کر ہاں کی؟''

''تعریف سننا چاہ رہے ہو اپنی؟''

''ہاں؟''

''اچھا تو پھر سنو۔'' رامین مسکرا دی۔ تم نے مسٹر زوار کے سامنے مجھے پروٹیکٹ کیا۔ مجھے اچھا لگا اور یہ بھی لگا کہ آئندہ بھی تم مجھے پروٹیکٹ کر سکتے ہو۔

رامین نے ایک ساس پین میں دودھ پتی چائے بننے کو رکھ دی تھی اور سلائس پر کچھ لگا رہی تھی۔

''اور؟''

''اور کیا؟''

''بس یہی ایک خوبی دکھائی دی مجھ میں؟'' شایان جیسے مایوس ہوا۔

''فی الحال تو یہی نظر آئی ہے۔ مستقبل میں کوئی دکھائی دی تو ضرور بتاؤں گی۔'' رامین نے اس کے سامنے سینڈوچ رکھا اور چائے چھان کر نکالنے لگی۔

''میں، تمہاری اتنی تعریفیں کرتا ہوں۔ تم میری ذرا سی تعریف نہیں کر سکتیں؟'' شایان نے سینڈوچ کھانا شروع کیا۔ مگر انداز خفا خفا تھا۔

''جوابی تعریف کے لیے اتنی تعریفیں کرتے ہو تو اپنے الفاظ نہ ضائع کرو۔'' رامین نے اس کے سامنے چائے کا مگ رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت ہی کھڑوس ہو۔''

''اس کی جوابی تعریف کر سکتی ہوں۔ سیم ٹو یو۔'' رامین کھلکھلائی۔

''اچھا اب ایسے تو مت ہنسو۔''

''کیوں؟''

''کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگتی ہو۔'' شایان شرارتی ہوا۔

''آ گئے اپنی اوقات پہ؟ جلدی سے چائے پیو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' رامین کی مسکراہٹ گلابی، دھانی، بنفشی، نقرئی، سنہری جانے کتنے رنگوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ رنگ اتنے واضح تھے کہ شایان کو بھی نظر آ رہے تھے۔

''تم شرما رہی ہو مجھ سے؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جی نہیں، بلکہ تم مجھے اکسا رہے ہو کہ میں یہ ڈوئی یا بیلن اٹھاؤں اور تمہاری تواضع کروں۔''

''بالکل بیویوں والی باتیں کر رہی ہو۔'' شایان چائے کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں کے بھی مزے لے رہا تھا۔

''اور تم چھچھوروں والی۔'' رامین نے رخ موڑ

کر گڑ اور تھوڑا سا پانی ساس پین میں ڈالا اور ہلکی آنچ پہ پگھلنے رکھ دیا۔

''اچھا بھئی، ہم چلے۔'' چائے کا آخری گھونٹ پی کر شایان نے مگ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''مہربانی اور خدا حافظ۔''

''خدا حافظ زندگی!'' شایان اپنی ہی ترنگ میں لہرایا اور مڑ کر کچن سے نکلنے لگا تھا کہ گڑبڑا گیا۔

کچن کے دروازے پہ دادو کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم!بوکھلا کر سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے پوتے کو غور سے دیکھا۔ نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''اللہ حافظ۔'' جھینپ کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خوب اچھی طرح پھینٹ پھینٹ کر جھاگ دار کافی بنائی تھی۔ کمرے میں آ کر شوہر نامدار کے سامنے چھوٹی سی ٹرے رکھی۔ جس میں دونوں مگ تھے۔ گرم گرم کافی سے سوندھی سوندھی چاکلیٹی مہک اٹھ رہی تھی۔ جس میں تلخی بھی تھی اور مٹھاس بھی۔ ان دونوں کے رشتے کی طرح۔

''شکریہ بیگم۔'' طارق صاحب نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ اور بیگم صاحبہ کو بغور دیکھا۔

''کیا فرمائش لے کر آئی ہیں آج، جو اتنی مزے دار کافی بنا ڈالی؟''

''اب اتنی مطلبی بھی نہیں ہوں میں۔'' انہوں نے اپنا مگ اٹھایا۔

''چلیے، جتنی بھی ہیں۔ اب شروع ہو جائیں۔''

''شروعات تو آپ کے بیٹے نے کر رکھی ہے۔ آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں ہیں؟''

''سمجھایا تھا مگر اس کی فرمائش ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔'' شوہر نامدار مزے سے گھونٹ گھونٹ کافی پی رہے تھے۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں؟''

''جو آپ کی مرضی ہے اور دل میں ہے، وہی کیجیے۔''

''شانی کو دیکھا آپ نے، کتنا خاموش اور اداس رہنے لگا ہے۔'' بیگم صاحبہ کے چہرے پہ تفکر اور تشویش کی لکیریں تھیں۔

''ابھی سے شوہر بننے کی پریکٹس کر رہا ہوگا۔''

''میں سیریس بات کر رہی ہوں، آپ مذاق میں اڑا رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا کہوں؟''

''کوئی مشورہ تو دیں۔''

''جیسی بہو آپ لانا چاہتی ہیں۔ لے آئیں۔''

''لیکن اگر شایان خوش نہ ہوا تو؟''

''تو پھر اس کی بات مان لیں۔''

''ایسے کیسے مان لوں؟ ابھی سے من مانی کرے گا۔ کل کو بالکل ہی ہاتھوں سے نکل جائے گا۔'' وہ چیخ گئیں۔

''تو پھر اپنی مرضی چلا لیں۔''

''لیکن بیٹے کی خوشی بھی عزیز ہے مجھے، اب اتنی سنگ دل تو نہیں ہوں۔''

''تو بیٹے کی پسند اپنا لیں۔'' انہوں نے کندھے اچکائے۔

''آپ مشورہ دے رہے ہیں یا پاگل بنا رہے ہیں مجھے۔'' بیگم صاحبہ نے مشکوک نظروں سے انہیں گھورا۔

''میرے پاس دو ہی مشورے ہیں بیگم۔'' مجازی خدا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''یا تو اپنی مرضی چلا لیں یا بیٹے کی خوشی میں خوش ہو جائیں۔''

وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔ اضطراری حالت میں کافی کے خالی مگ کو ٹرے میں گھمایا۔

''میں نے کیا کیا خواب دیکھے تھے بیٹے کی دلہن کے لیے، ایسی حسین ماہ جبین جسے لوگ دیکھیں تو دیکھتے رہ جائیں۔'' ملیحہ بیگم آزردہ تھیں۔

مجازی خدا نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''حسین وہی ہے جو ہماری آنکھوں کو حسین نظر

آئے، جیسے ہماری نگاہوں کو آپ آج بھی چھبیس سال پہلے کی ملیحہ بیگم نظر آتی ہیں۔"

"تو یہ ہے، بچے بڑے ہو گئے، آپ کا رومانس ابھی تک برقرار ہے۔" وہ بے طرح شرمائیں۔

"بچے بے شک بوڑھے ہو جائیں، ہمارا رومانس تو اپنی جگہ رہے گا۔" طارق صاحب مسکرائے اور پھر بولے۔

"ویسے بیٹے کی نگاہوں سے دیکھیں تو رامین بہت خوب صورت ہے۔"

"ہاں، اچھی تو ہے مگر......" ملیحہ بیگم کی سوئی اگر مگر پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"اچھی نہیں، بہت اچھی لڑکی ہے۔" مجازی خدا مسکرا دیے۔

بیٹے کو یقین دلایا تھا کہ بیگم صاحبہ کو منا لیں گے اور اب انہیں بھروسا ہو چلا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھ ہی جائے گی۔

☆☆☆

آج ہوا سرد تھی۔ گرم شال پہننے کا شوق پورا کر کے مانو خوش تھی۔ لگاتار کئی سیلفیز لے کر خود کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ تب ہی ملیحہ بیگم چلی آئیں۔

"موبائل ایک طرف کر کے میری بات سنو۔" انہوں نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے حکم دیا۔

"جی......؟" مانو نے ایک آہ بھر کے موبائل رکھا۔

"ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتانا۔" بولتے بولتے انہیں زوردار چھینک آ گئی۔

"رامین...... آ آ آ...... چھیں۔ آ آ چھیں۔" انہوں نے ایک لفظ کہنے کے بعد لگاتار کئی چھینکیں ماریں۔

"یہ لیں۔" مانو نے میز پہ رکھے ڈبے سے ٹشو نکال کر ماں کو دیے۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ...... رامین کوئی بات کرتی ہے شانی کے متعلق؟" انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

"بھائی کی تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہم تو اپنی ہی باتیں کرتے ہیں بس۔"

"اپنی کیا باتیں؟"

"ہوتی ہیں بہت ساری باتیں، اب آپ کو کیا بتاؤں؟"

"اچھا...... آں...... آ۔ آ...... چھیں اف۔" انہوں نے ٹشو پیپر سے ناک صاف کی۔ "ساری چھینکیں آج ہی آئیں گی۔"

"جوشاندہ پی لیں مما! کہیں نزلہ زکام نہ ہو جائے۔"

"بس مشورے دینا ماں کو، یہ نہیں کہ ذرا ہاتھ پیر ہلا کر ایک کپ جوشاندہ بنا کر لا دو۔"

وہ بیٹی پر برس پڑیں ایک تو دماغ پہلے ہی گھن چکر بنا ہوا تھا۔ مستقل سوچتے رہنے کی وجہ سے سر میں درد ہو گیا تھا۔ اوپر سے متواتر چھینکیں۔

"جاؤ ایک کپ جوشاندہ بنا کر لے آؤ۔" اپنے چکراتے سر کے ساتھ وہ صوفے پہ ڈھیر ہو گئیں۔

☆☆☆

سر پہ دوپٹہ باندھ کر وہ بستر پہ لیٹی تھیں۔ سر میں درد، نزلہ، ہلکا ہلکا بخار۔ تھوڑی تھوڑی کھانسی ان پہ رقت طاری کرنے کو یہ سب کافی تھا۔

"میں ٹھیک تو ہو جاؤں گی نا۔"

مجازی خدا کا بازو پکڑ کر انہوں نے سوال کیا۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ ذرا ذرا سی تکلیف اور معمولی بیماری کو بھی اپنے ہی نہیں گھر والوں کے اعصاب پہ بھی سوار کر دیتی تھیں۔

"جیسے ہمیشہ ٹھیک ہو جاتی ہو۔ ایسے ہی اس بار بھی ہو جاؤ گی۔ اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو؟" شریک حیات نے تسلی دی۔

"امی! یہ کھا لیں، مانو نے ٹرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی، چائے اور سلائس۔

"کل سے یہی کھا رہی ہوں۔ کچھ اور ہی بنا دیتیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھیں۔

"دلیہ بنایا تو تھا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا۔" مانو

منمنائی۔

"ہاں تو کچا دلیہ۔ اتنا سخت سخت، نہ مزا نہ ذائقہ۔" امی نے ٹرے آگے رکھی اور بے دلی سے سلائس کا ٹکڑا توڑا۔

"روز روز بریڈ کھا کر انسان بے زار ہو جاتا ہے۔"

"شکر ہے، آپ کو احساس ہوا۔"

شوہر نامدار کی کا لہجہ جتاتا ہوا تھا۔ جس پر انہوں نے دھیان نہیں دیا۔ بے دلی سے آدھا ٹکڑا کھا کر چائے پینے لگیں۔

"اے ہائے مانو، چائے تو ڈھنگ سے بنانا سیکھ لو، بدمزہ چائے پی کر منہ کا ذائقہ اور خراب ہو گیا۔" انہوں نے کپ واپس رکھ دیا۔

"بازار سے کچھ منگوا دوں؟ وہاں تو سب کچھ ملتا ہے۔ بنا بنایا، پکا پکایا۔" مجازی خدا کے الفاظ جانے پہچانے سے تھے۔

بیگم صاحبہ نے گھور کے دیکھا۔

"بازار کے کھانے صحت مند لوگوں کے لیے ہوتے ہیں، بیمار کے لیے پرہیزی کھانا تو گھر میں ہی بنتا ہے نا!"

"جو رامین بنا کر لاتی تھی آپ کے لیے اور...... اور جو۔" ان کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ رامین مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں سوپ کا پیالہ تھا جس کی خوشبو بہت ہی اشتہا انگیز تھی۔

"السلام علیکم چچی جان کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ میں سوپ لائی تھی آپ کے لیے۔"

"بڑی عمر ہے بیٹا! تمہاری ابھی ہم یہی ذکر کر رہے تھے کہ رامین کی تیمارداری یاد آ رہی ہے۔" چچا جان خوش خلقی سے بولے۔ اور بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوئے۔

"لیجیے، آپ کی بھوک کا سامان آ گیا۔"

"اں...... ہاں۔ بھوک تو بہت لگ رہی ہے۔" ملیحہ بیگم نے گڑبڑا کر سچ بولتے ہوئے رامین کی طرف نگاہ کی۔ کاٹن کے سوٹ پہ شال نما دوپٹہ اوڑھے کرسی پر بیٹھی تھی۔ سنہری رنگت والے دلکش نقوش دمک رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات نارمل تھے۔ وہ ان کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔

"بس ابھی تو ایسی ہی ہے۔" انہوں نے گرما گرم اشتہا انگیز سوپ چمچے میں بھرا اور پی لیا۔

"تمہارے ہاتھ میں سچ مچ جادو ہے رامین!"

ملیحہ بیگم بیماری اور بھوک میں ہمیشہ ہی انتہائی نرم دل کی مالک ہو جاتی تھیں، اس وقت بھی ان پہ رقت طاری تھی اور معاملات تو وہ فراموش کیے بیٹھی تھیں۔

گرما گرم مزے دار سوپ پی کر ان کی آنکھوں میں روشنی اور جان میں جان آئی۔

☆☆☆

طوطے کی ٹیں ٹیں نے گھر کو سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے، کیوں اتنا شور مچا رہے ہو؟" رامین نے اسے ڈانٹا۔

جواب میں اس کی ٹیں ٹیں میں اور شدت آ گئی۔

"اس بے چارے کو تو بخش دو۔ میں کافی نہیں ہوں کیا ڈانٹ کھانے کے لیے؟" سیڑھیاں اتر کر آتے شانی نے کہا۔

"تم سے زیادہ ٹیں ٹیں کرنے لگا ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے؟" رامین نے تشویش سے طوطے کو دیکھا۔ پنجرے میں ادھ کتری ہری مرچ پڑی تھی۔

"کیا خبر اسے بھی تنہائی محسوس ہوتی ہو۔" شانی بھی پنجرے کے پاس ٹھہر گیا۔

"طوطے کے دل کی خبر بھی رکھتے ہو؟" رامین نے مذاق اڑایا۔

"کیا کروں۔" شانی نے ایک سرد آہ بھری۔
"ظالم انسان تو اپنے دل کی خبر ہونے نہیں دیتے۔"

"ظالم نہیں محتاط انسان۔" رامین نے مسکراہٹ دباتے ہوئے تصحیح کی۔

"کب تک رہے گی یہ احتیاط؟"

"فالتو باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ، چچی جان کی طبیعت کیسی ہے اب؟" رامین نے سوال کیا۔

”ابھی پیر دبا کر آرہا ہوں۔ ویسے بہتر ہیں۔“
”اچھی بات ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔“
”بالکل آخرت کی بھی اور دنیا کی بھی۔“ شانی نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور مسکرایا۔ مسکراہٹ معنی خیز تھی۔
”اتنے پراسرار کیوں ہو رہے ہو؟“ رامین نے سلاخوں کے درمیان طوطے کو انگلی لگائی۔ اس نے اپنے پر پھڑ پھڑائے۔
”تم میرے سارے انداز پہچان لیتی ہو؟“ شانی کے پاس واقعی ایک سرپرائز تھا اسے بتانے کے لیے۔
”ٹیلنٹ ہے۔ جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔“
”اور کیا کہتا ہے تمہارا ٹیلنٹ؟“ شایان نے ذرا جھک کر سوال کیا۔
”کل بتاؤں گی۔“
”مگر میں تو ابھی بتانا چاہتا ہوں ایک بات......“
شایان کی بات ادھوری رہ گئی۔ رامین کی ہیلپر اسے بلانے آئی تھی۔
”مسالہ ریڈی ہے جی، آکر دیکھ لیں، کیا کرنا ہے۔“
”چلو۔“ رامین فوراً ہی چل دی۔
”ظالم سماج ......ظالم انسان۔“ شایان نے باری باری دونوں کو گھورا اور حسب مراتب القابات سے نوازا۔

☆☆☆

سردی کی دلہن نے بالآخر اپنے رخ سے گھونگھٹ اٹھا ہی دیا تھا۔ سرد ہواؤں نے شہر میں ڈیرے ڈالے اور لوگ باگ گرم کپڑے پہنے باہر نکل پڑے۔ چند دن کی مہمان ہوائیں تھیں۔
رامین اور مانو نے جیکٹس پہن کر ہڈ سر پہ رکھ لیے۔ چھت پر اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھی تھیں۔ درمیان میں چھوٹا سا بون فائر، گود میں رکھے باؤل میں مونگ پھلیوں کا ڈھیر، گجک اور خشک میوے تھے جنہیں ٹونگتے ہوئے اپنی باتوں میں لگی تھیں۔
”کیا بات ہے آج کل گروپ میں تمہاری سیلفیز پوسٹ نہیں ہو رہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“
”ہاں ٹھیک ہے۔“ مانو نے مسکراہٹ دبائی۔
”تو پھر؟“ رامین نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔
”کسی کا کہنا ہے کہ سراہنے کے لیے دو آنکھیں اور ایک دل کافی ہے۔ باقیوں کی ستائش کا کیا کرنا ہے؟“
”اوہو، امپریسو۔“ رامین نے ہونٹ سکیڑے۔
”شکر ہے کہ دوسری پارٹی عقل شعور والی ہے۔“
”تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ میرے پاس۔“ مانو نے گجک کا ٹکڑا توڑا۔
”بڑی ممانی ہیں نا ان کی کال آئی تھی امی کے پاس اپنے بھائی کا پروپوزل دیا ہے تمہارے لیے۔ ددو سے ملنے آئیں گی شاید کل پرسوں یا سنڈے کو۔“ مانو نے دھماکہ کیا اور خود خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔
”مذاق کر رہی ہو؟“ رامین نے بے یقین نگاہوں سے دیکھا۔
”میرا تمہارا مذاق ہے کیا؟“
رامین چند لمحے اسے گھورتی رہی۔ آگ کے شعلوں میں مانو کا چہرہ دہک رہا تھا۔ مگر اس پر سچائی رقم تھی۔
”اب کیا ہوگا؟“ مانو نے سوال کیا۔
”دیکھتے ہیں۔“ رامین کی گود میں دھرا پیالہ اپنی نعمتوں سمیت اچانک ہی بے ذائقہ ہو گیا تھا۔
اگلے روز سہ پہر میں اسے پتا چل گیا کہ مانو کی خبر سچی ہے۔ اس کے ماموں، ممانی آئے تھے۔ وہ ددو کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ چچی جان بھی وہیں آ گئی تھیں۔

رامین سلام کر کے کچن میں آ گئی تھی۔ آج رات کے لیے بریانی کا آرڈر تھا۔ اپنی ہیلپر کے ساتھ وہ اس کی تیاری کر رہی تھی۔ مہمانوں کے لیے بھی ددو نے اہتمام کا حکم دیا تھا۔

رامین نے بے دلی سے کباب اور رول فرائی کیے۔ گاجر کا حلوہ گرم کیا۔ میکرونی بنائی اور کمرے میں سرو کر دی۔ مہمانوں نے تو اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ بیٹھے مگر وہ کام کا کہہ کر کچن میں چلی آئی۔ کاموں کے دوران اس کا چہرہ گہری سوچ کا آئینہ دار بنا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر ایک بے چینی تھی۔

''اب یہ ماموں مومانی کہاں سے ٹپک پڑے۔'' وہ دل ہی دل میں جھنجلا رہی تھی۔

''پیاز جل جائے گی؟'' ہیلپر نے لپک کر آنچ دھیمی کی۔ پیاز کی رنگت گہری ہونے لگی تھی۔ رامین نے چونک کر پتیلے میں جھانکا جلدی جلدی چمچہ چلایا۔ اور خود کو ڈانٹا۔

''اپنے کام پر دھیان دو رامین بی بی! بریانی خراب ہو گئی تو لاگت، محنت اور ساکھ تینوں ضائع ہوں گی۔''

اپنی الجھنوں، اندیشوں اور پریشانیوں کو آنچل میں سمیٹے وہ کام میں لگی رہی۔ کام ختم ہو گیا تب بھی وہ کچن سے باہر نہیں نکلی۔ زیفی آ کر اس کے قدموں میں لوٹ لگا رہی تھی۔

''چلو، بھاگو یہاں سے، آ رہی ہوں میں۔'' رامین نے اسے وہاں سے نکالا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

ددو فرصت کے عالم میں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ چہرہ سنجیدہ اور غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''حمیرا کو کال کر دی ہے میں نے۔ پرسوں آئیں گی۔'' ددو نے رامین کی سگی خالہ کا نام لیا۔

''خیریت؟''

''ظاہر ہے، رشتے کا معاملہ ہے۔ ان کی موجودگی بھی تو ضروری ہے۔'' ددو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا!'' رامین کا دماغ جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟''

''ملیحہ کے بھائی، بھاوج بلا کر گئے ہیں۔ حمیرا کو لے جاؤں گی۔ اصل میں تو ان کی تسلی ضروری ہے۔''

رامین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ددو کیا کہہ رہی ہیں اور وہ کیا سن رہی ہے۔ اس نے مضطرب ہو کر ایکوریم میں تیرتی مچھلیوں پہ نگاہ کی۔

سارے خوب صورت رنگ یکا یک پھیکے پڑ گئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی بھی شیشے کا ایک ایکوریم بن گئی ہے۔ چاروں طرف سے بند، نکلنے کے تمام راستے مسدود ہیں۔

''کیوں آئے تھے یہ لوگ؟'' رامین نے سوال کیا۔

''اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے۔'' ددو نے بتایا۔

''اور آپ نے فٹافٹ فیصلہ بھی کر لیا؟'' رامین جھنجلائی۔ ''کہاں تو پوتے کی حمایت میں بیان جاری ہو رہے تھے اور اب یہ ایک نیا شوشا؟''

''بتایا تو ہے حمیرا کو لے کر جاؤں گی وہاں، وہ دیکھ بھال لیں۔ میری نظر میں تو اچھے لوگ ہیں برسوں سے جانتی ہوں۔ جب سے ملیحہ کو بیاہ کر لائے تھے۔''

ددو اپنی چہیتی بلی کو پیار سے سہلا رہی تھیں۔

رامین کے گلے میں پھندا سا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن پہ ہاتھ رکھا۔ اپنی کیفیت پہ وہ خود بھی حیران تھی۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' وہ کراہی۔

''جس انسان اور معاملے کو اس نے بہت آسان لیا تھا، وہی زندگی کی سب سے بڑی مشکل بن گیا تھا۔

یہ شانی کا بچہ ویسے تو مجنوں، رانجھا اور فرہاد کو ٹف ٹائم دے رہا تھا۔ اب منہ میں گھنگھنیاں ڈال

کر بیٹھ گیا۔
رامین کو شدید غصہ آ رہا تھا شانی پر۔
"تم چلوگی ہمارے ساتھ؟" دڈو نے سوال کیا۔
"کہاں؟" وہ چونک پڑی۔
"ارے وہیں، ملیحہ کے بھائی کے گھر؟"
"میں کیا کروں گی وہاں جا کر؟"
گھر بار دیکھ لینا، آخر......"
"مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ نہ لڑکے میں نہ گھر بار میں۔" چڑچڑے پن سے کہہ کر وہ، وہاں سے اٹھ ہی گئی۔
ٹفی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ یقیناً بھوکی تھی۔ رامین ہی تینوں کو کھانا ڈالتی تھی۔
"شٹ اپ، وہیں جاؤ کمرے میں، میرے پیچھے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لا رہی ہوں تمہارا کھانا۔" رامین پیچھے مڑ کر غرائی۔ ٹفی بے چاری اس کا جارحانہ رویہ اور لہجہ دیکھ کر سہم گئی، پھر دبک گئی۔
"اس لڑکی کو کیا ہو گیا، کتنی چڑچڑی ہو رہی ہے؟" دڈو نے اندر بیٹھے بیٹھے حیرانی سے سوچا۔
رامین نے بلیوں کو کھانا ڈالا اور ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی۔ منہ پھولا ہوا تھا اور کم بخت دل بھر بھر کے آ رہا تھا۔
"تو یہ جو فلرٹ اور بے وفا قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کسی اور دنیا، کسی اور سیارے کی مخلوق نہیں ہوتے، ہمارے آس پاس ہی کے افراد ہوتے ہیں دوغلے، دورخے، ہم پہچان ہی نہیں پاتے، اور دھوکا کھا جاتے ہیں۔" قنوطیت اور یاسیت کے عالم میں وہ بہت کچھ سوچے جا رہی تھی۔ دکھ اور صدمہ چاروں طرف سے اسے گھیر رہے تھے۔
"تو یہ ذائقے بھی چکھنے تھے زندگی میں؟
محبت کا، جدائی کا۔
شایان نے اندر جھانکا تھا۔
"تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" بولتے بولتے وہ اندر آ گیا۔
"جھک مار رہی ہوں۔"
"مجھے بھی جھک مارنے کا شوق ہے۔" شایان صوفے پر بیٹھ گیا۔ انداز میں شوخی تھی۔
"تو پھر اکیلے بیٹھ کر مارو۔" رامین غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کیا ہو گیا تمہیں؟" شایان بھونچکا رہ گیا۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔" بولتی ہوئی وہ نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

آج کا دن بڑا طویل تھا۔ حمیرا خالہ، دڈو، چچا اور چچی چاروں چچی کے بھائی کے گھر گئے تھے۔ رامین کا آج کوئی الگ سے آرڈر نہیں تھا۔ روٹین کے رول، سموسے بنا بنا کر وہ فریز کر رہی تھی۔
واپسی پر حمیرا خالہ وہیں سے اپنے گھر چلی گئیں اور باقی سب گھر واپس آ گئے۔ رامین بوکھلائی بوکھلائی سی پھر رہی تھی۔
دڈو نے گرین ٹی بنوائی۔ وہ دینے گئی تو انہوں نے رامین کو تشویش سے دیکھا۔
"کیا ہوا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"سر میں درد ہے۔" رامین نے آدھا سچ بولا۔ درد تھا مگر ہلکا ہلکا سا تھا۔
"حمیرا کو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔ وہ تو کہہ رہی ہے کہ بس بسم اللہ کریں۔ میرا بھی یہی خیال ہے، اچھا رشتہ ٹھکرانا بھی کفران نعمت ہے۔"
"تو چچی نہیں مانیں۔" رامین نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں اور پھر کھول کر دڈو کی طرف دیکھا۔
"تم کہو، تمہاری کیا رائے ہے؟"
"میری رائے کی کیا اہمیت ہے بلکہ میری ہی کوئی اہمیت نہیں، تو......" رامین تلخی سے جواب دے رہی تھی مگر بات ادھوری رہ گئی، مانو کی انٹری ہوئی تھی کمرے میں۔

''تمہیں ابو بلا رہے ہیں، بالکل ابھی، فوراً......''

''کیا بات ہے؟'' رامین چونک پڑی۔

''کوئی آرڈر ہے تمہارے لیے، وہ جو حاجی انکل ہیں نا، وہ لائن پر ہیں، جلدی چلو۔'' مانو نے رامین کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اوپر پہنچی تو چچا موبائل کان سے لگائے بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے۔

''یہ لیں حاجی صاحب! بچی آ گئی ہے اب آپ خود بات کرلیں۔'' انہوں نے موبائل رامین کی طرف بڑھایا۔

دوسری طرف حاجی انکل تھے۔ انہیں ویسی ہی مٹن کڑھائی چاہیے تھی جیسی رامین نے چھ ماہ پہلے بنا کر دی تھی۔

دس منٹ بعد جب انہوں نے کال ختم کی تو رامین نے سکون کی سانس لی۔

''ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔'' مانو اسے کمرے میں لے جانے لگی۔ بیڈ روم کے کھلے دروازے سے چچی جان کی آواز آ رہی تھی وہ فون پر لگی ہوئی تھیں۔

''ہاں، بھئی، شانی کے لیے لڑکی فائنل ہو گئی ہے۔''

''ہاں ہاں، بہت اچھی ہے، ہم سب کی مشترکہ پسند ہے پھر''

''میں اوپر جا رہی ہوں'' رامین کا دل یکا یک اچاٹ ہو گیا۔ مانو سے کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''پانچ منٹ تو رکو، میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔'' مانو نے آواز دی۔

''میں جا رہی ہوں، تم آ جانا'' بے دلی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی۔

ہوا سرد تھی، اس نے کاٹن کے سوٹ پہ ہم رنگ دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا لگی تو اسے جھرجھری آ گئی۔ بغلوں میں ہاتھ دے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''سردی اچھی خاصی ہے، تم نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا؟''

شانی کی آواز پہ وہ اچھل پڑی۔ وہ سامنے منڈیر کی آدھی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''یہ لو، یہ جیکٹ پہن لو۔'' شانی نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

رامین کا دماغ گھوم گیا۔

''زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی مہربانی سمیت جا سکتے ہو یہاں سے۔'' وہ غرائی۔

''اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟'' شانی حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تم پوچھ رہے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں تم......''

رامین غصے میں بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ مانو ہانپتی کانپتی اوپر آ رہی تھی۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' شانی کو دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''ڈانٹ سن رہا ہوں۔ لیکن غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' شانی نے بے بسی سے جواب دیا۔

''ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' رامین نے سر جھٹکا اور سرد ہوا کے جھونکے سے کپکپا اٹھی۔

''یہ پہن لو۔'' شانی نے جیکٹ اس کی طرف بڑھائی۔

رامین اسے نظر انداز کر کے مانو کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم کیا دکھا رہی تھیں مجھے؟''

''ہاں!'' مانو نے جلدی سے اپنا موبائل آن کیا۔ اسکرین اسکرول کی اور اس کے آگے کی۔

''یہ دیکھو، میں نے اور مما نے انگیج منٹ

کے لیے سوٹ پسند کیے ہیں۔ تم دیکھو۔ اس میں سے کوئی پسند ہے تمہیں؟"

"کس کی انگیج منٹ؟" رامین کی آواز ہوا کی طرح سرد تھی۔

"تمہاری اور کس کی؟"

"منگنی میری ہے تو جوڑا پسند کرنے کی زحمت تم لوگ کیوں کر رہے ہو؟ یا تمہارے ماموں ممانی نے تمہاری ڈیوٹی لگائی ہے۔"

رامین کا لہجہ اور الفاظ طنز سے بھرپور تھے۔

"ہیں؟ مانو کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ رامین کا یہ انداز اس کے لیے نیا تھا۔

"ایک منٹ۔" شانی نے مداخلت کی "ماموں، ممانی کا کیا ذکر ہے یہاں؟"

"ظاہر ہے، ان کے گھر سے میرا پروپوزل آیا ہے تو۔"

"تو؟"

"تو..... تمہارا سر!" رامین کا رنج کم ہو رہا تھا نہ غصہ۔

"ڈیر سسٹر نیچے جاؤ اور بہت ہی مزے دار کافی بنا کر لاؤ" شانی نے مانو کو حکم دیا۔

"ابھی؟" مانو نے بے یقینی اور بے بسی سے اسے دیکھا اور شانی کے گھورنے پہ نیچے چلی گئی۔

"تو یہ بات ہے۔" شایان نے وہ جیکٹ رامین کی گود میں ڈالی اور دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے۔

رامین نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، جیکٹ نیچے گر گئی۔ اس نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

"مومانی نے تمہارے لیے پروپوزل دیا تھا۔ مگر امی نے منع کر دیا تھا۔" پیچھے سے شانی کی آواز آئی۔ رامین کے قدم بے اختیار تھم گئے۔

"امی نے کہا کہ رامین کو تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا ہے، ہاں اس کی خالہ زاد بہن ہے۔ اسے دیکھ لیں۔ وہ بھی اچھی ہے۔"

شانی کے انکشاف پہ وہ بے اختیار پیچھے مڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں، چہرے پہ جیسے یکا یک ہی ڈھیروں روشنیاں کوند گئی تھیں۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" شانی نے آگے بڑھ کر اس کے قدموں کے پاس زمین پر پڑی اپنی جیکٹ اٹھائی اور جھاڑنے لگا۔

"پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟" رامین کے حواس قابو میں آئے تو ڈپٹ کر بولی۔

"اب تو پیار سے بات کر لو، یا ڈانٹتی ہی رہو گی۔" شانی نے جیکٹ اس کے کاندھوں پر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ویسے جان کر اچھا لگا۔"

"کیا؟"

"کہ تمہارا دل بھی میرے لیے دھڑکتا ہے۔" شانی کا انداز الگ سا تھا۔ رامین کا چہرہ گلابی ہونے لگا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"ٹھہرو تو۔" شانی نے بے اختیار اسے روکا۔

"اب ٹھہرا نہیں جائے گا۔" اپنی سنہری مسکراہٹ کے ساتھ وہ سیڑھیوں کی طرف چلی۔

"مبارک باد تو لیتی جاؤ۔" شانی کی آواز آئی۔

رامین دوسری سیڑھی پہ ٹھہر گئی۔

"بہت پہلے شروع ہونے والی الفت اور تھوڑی دیر بعد شروع ہونے والا نیا سال مبارک ہو۔"

"تمہیں بھی۔" رامین کی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ مستقل ٹھہری ہوئی تھی۔

دسمبر جنوری کی سرد ہوا نے پھر گدگدایا، جو جنوری کے استقبال کے لیے جلدی جلدی اکٹھی ہو رہی تھیں۔

رامین تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

شایان کا دل اور نیا سال، دونوں اپنے اندر ڈھیروں خوشیاں سمیٹے اس کی اور آ رہے تھے۔

اس جنوری کی سردی میں، ہم اور زندگی دونوں مسکرائیں گے رامین کو یقین تھا۔

☆☆

حنا بشریٰ

گماں سرائے

"امی! آپ ناراض ہیں کسی بات پہ......"
رابعہ کے استفسار پہ خالدہ بیگم نے آہستہ سے

سر کو نفی میں جنبش دی اور خاموشی سے تسبیح کے دانے
گرانے لگیں......وہ اسے لاتعلقی اور اجنبیت کا ایسا



مجسمہ نظر آئیں...... جس کا چہرہ احساسات، محبت وشفقت کے تاثرات سے عاری تھا...... اس منظر نے رابعہ میں عجیب سی بے اطمینانی پھیلا دی تھی...... دل سوچ میں پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

رابعہ کی شادی کو چار ماہ ہوئے تھے۔ خالدہ بیگم نے اسے کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں ڈھولکی کے فنکشن میں دیکھا تھا۔ شوخ وچنچل لڑکیوں کے جھرمٹ میں من موہنی سی صورت والی رابعہ انہیں دیگر لڑکیوں سے الگ تھلگ لگی تو دل کو بھا گئی...... انہوں نے رابعہ کو اپنے بڑے بیٹے ثاقب کی دلہن بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔

تقریب کے دوران، انہوں نے رابعہ کی امی کے سامنے اپنی پسندیدگی اور خواہش کا اظہار کیا تو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا معاملہ ہوا تھا۔

ساس، سسر اور دیور۔ مختصر سی فیملی، سلجھے ہوئے لوگ...... رابعہ کو اپنے نصیب پہ خود رشک آیا تھا......

شادی سے پہلے اسے سسرال کے حوالے سے طرح طرح کے اندیشے تھے...... ساس کرخت اور اکھڑ مزاج ہوں گی...... جن کی سارے گھر پہ حکمرانی ہوگی...... مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ سب کی اپنی جگہ اپنی حیثیت تھی۔

خالدہ بیگم روایتی ساس نہ تھیں۔ وہ خوش مزاج وخوش گفتار ہونے کے علاوہ بہت دوستانہ مزاج کی مالک تھیں۔

رابعہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی تھی...... وہ حساب کی ٹیچر تھی...... دل کو اندیشہ تھا کہ شادی کے بعد سسرال والے خصوصاً ساس اسے ملازمت سے منع کردیں گی۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی تھی......

خالدہ بیگم اور دیگر افراد خانہ کی طرف سے ملنے والے اطمینان نے اس کے اندر سکون بھر دیا تھا۔ جس میں شکر ہی شکر شامل تھا...... سسرال والوں نے اسے ملازمت جاری رکھنے کی اجازت بھی بڑی فراخ دلی سے دے دی تھی۔ بلکہ اس کی تنخواہ پہ بھی کسی کی نظر نہ تھی۔ ان سب کی اس فراخ دلی پہ رابعہ ایسی مرعوب ہوئی تھی کہ گھر میں کام کاج کے لیے لگی ماسی کی تنخواہ اپنے ذمے کرلی۔ اس پہ ساس سسر نے منع بھی کیا مگر اس معاملے میں رابعہ نے ایک نہ سنی تھی......

اس عمل کے پیچھے اس کی سوچ یہ تھی کہ اگر وہ ملازمت پیشہ نہ ہوتی تو یہ سب کام، اس کی ذمے داری تھے ہاں البتہ رات کے کھانے کے علاوہ برتن دھونے سے لے کر کچن کے تمام تر کام سمیٹنا اس نے خود پہ جیسے فرض کرلیے تھے تو کسی کو اعتراض کا موقع ہی نہیں ملا تھا...... تمام معاملات متوازن ہوئے...... سسرال امن وچین کا گہوارہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

بظاہر تو سب معاملات ٹھیک نظر آرہے تھے...... مگر رابعہ محسوس کرنے لگی تھی کہ خوش مزاج وخوش گفتار خالدہ بیگم جن سے رابعہ کے تعلقات میں کہیں خرابی نہ تھی...... اچانک سے کسی ان دیکھی اور ناقابل فہم خرابی کا شکار نظر آنے لگے تھے۔

خالدہ بیگم اچانک سے، یوں لاتعلق سی ہوکر الگ تھلگ ہوکر بیٹھ جاتی تھیں کہ جیسے کسی بات پر ناراض ہوں۔ اور اس حالت میں وہ "ہوں"، "ہاں" سے زیادہ جواب نہ دیتیں۔ نہ کسی بات میں دلچسپی ظاہر کرتیں نہ کوئی مشورہ دیتیں...... خاموشی سے اپنے مخصوص تخت پہ بیٹھ کر تسبیح پڑھتی رہتیں۔ ایسی صورت حال رابعہ کے لیے بہت حیرت ناک تھی کہ جیسے اس کی ساس کا گھر اور گھر کے معاملات سے کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا۔

ابتدا میں رابعہ نے اس سارے قصے کو سرسری سا لیا تھا مگر ایک بات جو بار بار ہونے لگے تو پھر اسے نظر انداز کرنا مشکل ہوجاتا ہے...... رابعہ سے بھی خالدہ بیگم کا نہ سمجھ میں آنے والا رویہ برداشت کرنا مشکل ہوگیا تھا...... وہ اکثر ان سے پوچھتی تھی کہ وہ کسی بات پر ناراض تو نہیں ہیں۔ مجھ سے کسی قسم کی

کوئی شکایت تو نہیں...... میں کوئی ایسی غلطی تو نہیں کرتی جس پر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے......

متعدد بار پوچھنے پہ بھی خالدہ بیگم نے ایک بار بھی کسی قسم کی شکایت کا اظہار نہ کیا تھا، جس سے رابعہ ان کی خاموشی ولاتعلقی کی وجہ جان پاتی...... مگر یہ صورت حال بھی مطمئن کرنے والی نہ تھی۔

رابعہ بے حد حساس تھی، کسی کی ناراضی بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی...... وہ اس سوچ کی مالک تھی کہ اگر اس کی ذات سے دوسرے کو اذیت ہو رہی ہے تو وہ شخص اظہار کرے۔ تاکہ اگر وہ غلطی پر ہے تو اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور اگر غلطی نہ ہو تو اپنے عمل کی کم از کم وضاحت تو ضرور کردے...... وہ رشتوں میں کسی قسم کا بگاڑ جو اس کی کسی لاپروائی کی وجہ سے پیدا ہو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

☆☆☆

"کیا ہوا...... کچھ پریشان لگ رہی ہو؟!"

اسکول میں موسم سرما کی تعطیلات ختم ہو گئی تھیں۔ صبح اسکول جانے کے لیے اپنے کپڑے پریس کرتی رابعہ خلاف معمول بہت خاموش تھی ورنہ تو وہ کام کے ساتھ ساتھ ثاقب سے کسی نہ کسی موضوع پہ بات کرتی تھی...... مگر آج وہ کچھ زیادہ ہی خاموش نظر آئی تو ثاقب پوچھے بنا نہ رہ سکا تھا۔

"پتا نہیں ثاقب...... مجھے لگتا ہے کہ امی مجھ سے کسی بات پہ ناراض ہیں......!"

ویسے تو پورے ڈیڑھ ماہ سے رابعہ اپنی ساس کے مبہم رویے پریشان تھی مگر اسکول کی ان دس چھٹیوں میں ان کے رویے نے اسے مزید الجھا کر رکھ دیا تھا۔

ان چھٹیوں کے دوران اس نے بھرپور انداز میں گھر والوں کی خدمت کی تھی۔ وقت پہ ناشتہ، دوپہر اور رات کے کھانے پہ اہتمام، شام کی چائے کے ساتھ لوازمات۔ سب کے مطابق اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ اور دیگر کاموں میں بھی ماسی کے ساتھ لگ کر گھر کو خوب چمکایا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ دل و جان سے کیا تھا مگر ساس کا رویہ بالکل ویسا ہی رہا تھا...... گہری خاموشی اور مبہم سا اجنبی رویہ......

یہ دیکھ کر تو رابعہ کو لگنے لگا تھا کہ اس نے خدمت میں کوئی نہ کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ اور اس کی ساس کو ضرور اس سے کسی بات پہ شکایت تھی اب اسے یقین ہونے لگا تھا......

☆☆☆

"امی تم سے ناراض نہیں ہیں رابعہ......!"

وہ کپڑے پریس کر کے فارغ ہوئی تو ثاقب نے اسے اپنے پاس بیڈ پہ بٹھا کر اس کے ہاتھوں کو محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی ماں کی ذات کے کچھ چھپے ہوئے پہلو، اس انداز میں اس کے سامنے رکھے...... جن سے رابعہ ابھی تک ناواقف تھی۔

☆☆☆

خالدہ بیگم نے اپنے گھر پہ پورے ستائیس سال حکمرانی کی تھی۔ اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کے دلوں

پہ راج کیا تھا......انہوں نے اپنے گھر کی سلطنت کو اس دانش مندی سے اور سلیقے سے چلایا تھا کہ ان کے شوہر اور دونوں بیٹے ان کی سلیقہ مندی کے دیوانے تھے......وہ تینوں ان کے ہاتھ کے کام کے عادی تھے...... انہی کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند کرتے تھے......سودا سلف کی خریداری میں مشاورت خالدہ بیگم سے لازمی ہوتی تھی کھانے کا مینیو ان کی مرضی اور پسند سے بنتا تھا......جس پہ شوہر اور بیٹے انگلیاں چاٹ لیا کرتے تھے......کپڑوں کی دھلائی، استری سے لے کر جوتوں کی پالش تک کے معاملات، خالدہ بیگم کی مرضی و منشا کے مطابق ہوتے تھے......

کسی کو بھی ان کے کسی کام پہ کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی کوئی شکایت......ویسے بھی یہ حقیقت تھی کہ خالدہ بیگم بہت نفیس طبیعت کی مالک تھیں سگھڑ اور سلیقہ مند تھیں......ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا...... سب گھر والے ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ بڑے بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا معاملہ آیا تو وہ بھی بیٹے نے ماں کے سپرد کر دیا......

''امی جان......شادی تو میں آپ کی پسند کی لڑکی سے ہی کروں گا!''

شوہر کی محبت، بیٹوں کا مان ایک عورت کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتا......اور اس اعزاز نے خالدہ بیگم کو اپنی ذات میں ''ملکہ'' بنا دیا تھا۔

جب بہو نے آ کر یہ سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تو خالدہ بیگم کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ شاید انہیں ان کی سلطنت سے، بے دخل کر دیا گیا ہے......اب ان کی جگہ پہ کوئی اور ملکہ براجمان ہو گئی ہے......جس نے تمام معاملات زندگی کو بہتر انداز میں چلاتے ہوئے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے......اور بس کچھ دنوں کی ہی بات تھی گھر کا سارا انتظام رابعہ کے ہاتھ میں ہونا تھا اور خالدہ بیگم کو ایک بے کار پرزے کی حیثیت سے ان کے کمرے تک محدود کر دیا جانا تھا......بس یہی خوف تھا جس کی وجہ سے وہ بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

خالدہ بیگم ایک صلح جو طبیعت کی مالک تھیں......گھر میں کسی قسم کی بدمزگی اور انتشار انہیں بھی پسند نہ رہا تھا۔ گھر کی فضا امن و سکون سے مزین رہے انہوں نے دونوں بیٹوں کی تربیت بھی اسی انداز میں کی تھی۔ کہ دونوں بھائیوں میں بے حد پیار اور احترام تھا۔ اپنی اسی عادت کی وجہ سے وہ بہو سے کسی قسم کی لڑائی یا جھگڑا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا گھر بھی ساس بہو کے روایتی دنگل کے لیے اکھاڑہ بن جائے......محبتیں پس پشت چلی جائیں اور اختلافات بڑھ کر رشتوں کو کاٹ ڈالیں۔ سو وہ رابعہ کے ساتھ کسی بھی بات پہ الجھی نہیں تھیں، مگر اندر کا خوف انہیں چپ لگا دیتا تھا......اور رابعہ کو یہ خاموشی ناراضی کی شکل میں نظر آتی تھی۔

شوہر سے تفصیلی گفتگو کے بعد رابعہ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی......ثاقب سو چکا تھا جب تک رابعہ جاگتی رہی وہ کبھی مثبت اور کبھی منفی انداز میں غور کرتی بالآخر ایک مضبوط حکمت عملی کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

''آج کھانے کا مینیو زبردست ہے رابعہ بھابھی!''

ویک اینڈ پہ وہ سب ہمیشہ کی طرح ایک ساتھ موجود تھے......کھانے میں ویجی ٹیبل پاستا، چکن کارن سوپ، کلب سینڈوچ کے علاوہ میٹھے میں رشین سیلڈ (سلاد) بنائی گئی تھی۔ مگر یہ سب رابعہ نے تیار نہیں کیا تھا......کھانے کے مینیو کے ساتھ ساتھ کھانے کی تیاری میں بھی خالدہ بیگم اس کے ہمراہ رہی تھیں۔

''بھئی آج سب کچھ امی کے مشورے سے تیار ہوا ہے......اور اس کا کریڈٹ بھی انہی کو جاتا ہے!''

کھانا بہت عمدہ بنا تھا......سسر، شوہر اور دیور نے ہر لقمے پہ خوب داد دی تھی......جبکہ ثاقب نے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو جوڑ کر تعریف کرتے ہوئے چکن کارن سوپ سے تیسری بار اپنا پیالہ بھرا تھا۔

رابعہ نے مسکراتے ہوئے اپنی پلیٹ میں رشین سلاد ڈالتے ہوئے تمام تعریفوں کا رخ نہایت فراخ دلی سے ساس کی طرف موڑا تو ایک دم سے خالدہ

بیگم کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

''ارے واہ بھئی بیگم......!'' سلطنت کے بادشاہ نے بھی دل کھول کر اپنی ملکہ کی تعریف کی تھی۔

''امی یو آر گریٹ!'' ثاقب نے اپنے انداز میں ماں کو سراہا تھا۔

اور چھوٹے نے تو باقاعدہ فوجیوں کے انداز میں، ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر ماں کو سلیوٹ پیش کیا تھا......اس منظر کو دیکھ کر تو سب کی ہنسی نکل گئی تھی......کھانا واقعی بہت مزے دار بنا تھا......خالدہ بیگم بھی کھانا بہت دنوں بعد رغبت سے کھا رہی تھیں۔

آج بھی کھانا رابعہ نے ہی بنایا تھا......مگر اس نے مینیو ترتیب دینے میں، ساس سے مدد اس انداز میں مانگی جیسے کہ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا پکایا جائے......وہی اس کی رہنمائی کریں......پہلے کے مشورہ مانگنے سے ساس کا خوف کم ہوا تو کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا تھا......خالدہ بیگم جو کافی دنوں سے خاموشی اور اجنبیت کے خول میں قید تھیں، اب نہایت دوستانہ انداز میں رابعہ کی رہنمائی کرنے لگیں......ان کی باتوں اور انداز سے رابعہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ناراض ملکہ کی ناراضی اب کافور ہو گئی تھی......اور سچ مچ وہی بات نکلی تھی جو ثاقب نے کہی تھی کہ ہر عورت جس گھر میں بیاہ کر آتی ہے اسے اپنے گھر پہ حکمرانی کی خواہش ہوتی ہے۔

رابعہ کے آنے کے بعد، شوہر، اور دونوں بیٹوں کی توجہ بہت حد تک رابعہ کی طرف ہونے لگی تھی......وہ بہت سی باتوں میں خالدہ بیگم کے علاوہ رابعہ سے بھی مشاورت لینے لگے تھے......جس نے خالدہ بیگم کو یہ احساس دلایا تھا کہ ان کی ''حکمرانی'' ان سے چھین لی گئی ہے......اور اس سوچ سے وہ بالکل الگ تھلگ اور گم صم سی ہو کر رہ گئی تھیں......ہر معاملے سے خود کو دور کر دیا تھا......ان کا یہ عمل رابعہ کو ان کی ناراضی کی شکل میں نظر آتا تھا......

''بس اتنی سی بات تھی......!'' دوسری بار پاستا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے ثاقب رازدارانہ انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرایا تو رابعہ بھی مسکرا دی تھی......واقعی اتنی سی تو بات تھی......اگر وہ ساس کی ذات کے پہلو کو منفی انداز میں لے کر چلتی تو اسے لگتا کہ ساس کو کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے......حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے ایسا ہوا بھی تھا......اتنے دنوں سے ذہنی الجھن کا شکار رابعہ پر اس سوچ نے یلغار کی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے کوفت کو پچھاڑ دیا......وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی......اس کی تعلیم کا یہی تقاضا تھا کہ وہ اس معاملے کو دانش مندی سے ہینڈل کرے۔ اور اگر ایسا نہ کرتی تو پھر کیا فائدہ تھا ایسی تعلیم کا......اسے سسرال میں بہت اچھا ''ویلکم'' ملا تھا۔

محبت اور چاہتوں بھرا......اگر ان محبتوں کے بدلے وہ تنگ دلی اور ذہنی کوفت کا مظاہرہ کرتی تو سوائے خرابی کے کچھ ہاتھ نہ آنا تھا......اسے لگتا تھا کہ ساس اس سے حسد کرنے لگی تھیں۔ اور انہوں نے بہو کو اپنا ''حریف'' بنا لیا تھا......ایک عورت ہو کر وہ دوسری عورت کی نفسیات کو نہ سمجھتی۔ تو پھر نتیجہ بگاڑ کی صورت نکلتا تھا......عورت ہونے کے ناتے اس کے دل میں بھی اپنے گھر پر ''حکمرانی'' کی خواہش تھی۔ بالکل جیسے خالدہ بیگم نے اتنے برس اپنے گھر پر کی تھی......مگر اس خواہش کے لیے اسے رشتوں کو دور کرنا منظور نہ تھا۔

بس اب اس نے دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ کھانے سے لے کر گھر کے دیگر امور میں خالدہ بیگم کو پہلے کی طرح متحرک رکھ کر ان کے دل سے خوف و اندیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے کہ بہو نے آ کر ان کی ''حکمرانی'' چھین لی ہے!......وہ اپنی ''سلطنت'' کی ملکہ تھیں اور ہیں......سوچ کا انداز بدلا جائے تو دل خود بخود مسکرانے لگتا ہے......

حساب کی ٹیچر نے سسرال کا پیچیدہ سوال حل کر لیا تھا......سسرال کے معاملات بھی حساب جیسے مشکل مضمون سے کم مشکل نہیں ہوتے......بچوں کے پیپرز چیک کرتی رابعہ کے لبوں پہ اطمینان بھری مسکراہٹ تھی......

☆☆

صوفیہ بٹ

الاحد

مکمل ناول

چوبیسویں اور آخری قسط

"نہیں خولہ...... پلیز نہیں...... تم میری زندگی ہو۔" ضامن مصطفیٰ زیرلب اوٹی میں بے ہوش پڑی خولہ سے مخاطب ہوئے۔ وہ اپنی سانسوں کے عوض اس کی زندگی خرید لیتے اگر قادر ہوتے اور قادر المطلق صرف اللہ کی ذات ہے۔ سب اختیار اسی کے پاس ہیں۔

"میرے اللہ! اسے ٹھیک کردے۔ اسے زندگی دے دے۔" وہ مختارِکل سے دعا مانگنے لگے۔ بے شک وہی سمیع ہے۔

دیکھنے والے کو لگتا تھا کہ وہ بہت حوصلے کے ساتھ کھڑے ہیں، مگر ان کی اندرونی کیفیت یہ تھی کہ ان کو لگ رہا تھا کہ حادثہ ان پہ گزرا ہے۔ ایک گولی ان کی گردن کو چھو کر نکلی ہے، دوسری گولی ان کے بازو میں لگی ہے۔ تیسری گولی ان کی ٹانگ میں لگی ہے۔ وہ بے جان سا ہو کر خود کو گرتا محسوس کر رہے تھے۔

ماما اور بابا کو تیزی سے اپنی جانب آتا پا کر انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ماما رو رہی تھیں۔ بابا بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ گو کہ پروفیسر زید ابصار ایک بہادر انسان تھے مگر اس وقت وہ صرف ایک باپ دکھائی دے رہے تھے۔

"ناں روئیں ماما، بابا پلیز آپ بھی خود کو سنبھالیں۔ خولہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" اپنی حالت بھول کر وہ ماما اور بابا کو دلاسہ دینے لگے۔

"میں نے رات اچھا خواب نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی سے دل پریشان تھا۔ صبح صبح اٹھ کر صدقہ نکالا۔" ماما آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے ضبط کرتے ہوئے سر ہلایا اور ان دونوں کو تسلی دینے لگے۔

☆☆☆

پروفیسر زید ابصار، ثروت زید اور ضامن مصطفیٰ...... یہ تین چہرے ایسے تھے جن سے وہ نظریں چھپاتا پھر رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جو بھی ہوا، اس کی وجہ سے ہوا۔ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو اس کی وجہ سے کیا کچھ نہ بھگتنا پڑا۔ شادی کے نام پہ دھوکہ ملا۔ اور اب ان کی زندگی داؤ پہ لگی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ہے ہی منحوس۔ وہ کبھی بھی کسی کے لیے خوشی کا باعث نہیں بنا تھا۔ امت الاحد، حوراں اور اب ایڈووکیٹ خولہ بنت زید۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو ابھی جینا ہے۔ وہ ایسا کیا کرے کہ اسے اس زندگی اور موت کی حالت سے نکال کر واپس زندگی کی طرف لے آئے۔ اپنی زندگی دے کر اسے بچا سکتا تو شاید پل بھر بھی نہ لگاتا اپنی سانس سانس وار کرنے پہ۔ مگر آپریشن تھیٹر میں پڑی اس لڑکی کو اس کے جیون کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے پھر کس چیز کی ضرورت تھی۔

"دعا کرو ثروت! دعا کرو۔ اسے اس وقت ہمارے آنسوؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔" پروفیسر زید ابصار نے اپنی سسک سسک کر

روتی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"بابا سائیں! اس کے لیے دعا کریں۔" یہ ضامن مصطفیٰ تھے جو موبائل کان سے لگائے بھاری آواز میں کہہ رہے تھے۔

"دعا۔" اس نے زیر لب کہا۔ "میں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کے لیے یہ کر سکتا ہوں...... مگر کیسے؟"

اس نے رام کو بھی ہو کر کبھی پرارتھنا نہیں کی تھی، اس نے عبدالہادی بن کر کبھی دعا نہ کی تھی۔ وہ اس طرح کے عمل سے نا آشنا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ وہ کوئی دہریہ تھا۔ مگر ایسا تھا کہ وہ رام اور امر ہو کر دھرم سے دور رہا اور عبدالہادی بن کر دین کے بارے میں کچھ جانتا نہ تھا، کوشش بھی نہ کی تھی۔ دین دھرم کے متعلق اس کا ذہن خالی سلیٹ جیسا تھا۔ اور اسے اپنی محسن کے لیے دعا کرنی تھی۔۔۔ تو کیا کرے وہ۔



امت الاحد باتیں کیا کرتی تھی اپنے احد کے ساتھ...... کیا وہ بھی ڈائریکٹ ہو کر اس سے بات کرے؟

مولوی عبدالرحیم ہاتھ اٹھا کر اپنے اللہ سے دعا مانگا کرتے تھے۔ کیا وہ بھی ہاتھ پھیلا لے؟

پروفیسر زید ابصار ایک دفعہ کہہ رہے تھے کہ بندہ سب سے زیادہ سجدے میں اپنے رب سے قریب ہوتا ہے۔ کیا وہ زمین پر اپنا سر رکھ دے؟

ان میں سے کون سا فعل ایسا ہوگا جو ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کی زندگی کا ضامن بن جائے؟

اس دن ایک عبدل کی پیشانی نے زمین کو بھی چھوا۔ اس دن ایک عبدل کے ہاتھ بھی پھیلے۔ اس دن ایک عبدل نے ایک احتل کے احد سے باتیں بھی کیں۔

لاریب لاریب۔ ایک احتل کا احد ہے۔ ایک عبدل کا ہادی ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

☆☆☆

"باباسائیں!"

طویل راہداری میں سامنے سے چل کر آتے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت باپ کو دیکھ کر انہیں عجیب سی ڈھارس محسوس ہوئی۔ کئی گھنٹوں سے پل پل ان کے لیے امتحان تھا اذیت تھا۔ بابا اور ماما ان کے ساتھ تھے۔ اقصیٰ اور تیمور بھی آ جا رہے تھے۔ عبدالہادی بھی دور کہیں دور نظریں چراتا نظر آ جاتا تھا۔ اور بھی کئی لوگ آئے اور گئے۔ ان سب کے بیچ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہے تھے۔ وہ بابا اور ماما کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دے رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کوئی ان کا ہاتھ تھام کر انہیں سینے سے لگا کر انہیں تھپکی دے کر تسلی دے کہ ان کو خولہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

اور ان کو حوصلہ دینے والا طویل سفر طے کر کے ابھی پہنچا تھا۔ تیس سال بعد انہیں محسوس ہوا کہ ان کے سامنے کھڑا ہو کر ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ان کو سینے سے لگا کر تسلی دینے والا مصطفیٰ امین نہیں بلکہ ان کا باپ تھا۔ وہ بہت دیر تک ان کے سینے سے لگے رہے تھے۔ اور مصطفیٰ امین انہیں تسلی دیتے رہے تھے۔

اس رات جب انہوں نے خولہ کی صحت خطرے سے باہر آنے کے بعد ماما اور بابا کو زبردستی گھر بھیج دیا تھا اور بینچ پہ وہ باپ بیٹا تنہا رہ گئے تھے تو مصطفیٰ امین نے پھر ان سے پوچھا تھا وہ سوال جو ان کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

ضامن انہیں دھیرے دھیرے ساری بات بتانے لگے۔ امین مصطفیٰ کا دل بڑی مشکل سے سہہ رہا تھا یہ انکشافات۔

"جگدیش مہیشوری کے بارے میں، میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ گائتری دیوی اور رام مہیشوری کا بیٹا ہے۔ جبکہ خولہ کو لگتا ہے کہ جگدیش مہیشوری میرا دوست ہے جسے بچانے کے لیے میں محبت کا ناٹک کیا۔" سب بتا چکنے کے بعد ضامن نے تحمل سا مسکراتے ہوئے کہا اور تھکے ہوئے سے انداز میں سر سیٹ کی پشت کے ساتھ لگا دیا۔

مصطفیٰ امین سوچنے لگے کہ اس رات کے عمل کا رد عمل وہ کب تک دیکھیں گے۔ کیا آخری سانس تک۔

"مگر آپ فکر نہ کریں باباسائیں!" ضامن نے ایک دم سیدھے ہو کر باپ کا ہاتھ تھاما۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہیں اچانک احساس ہوا تھا کہ اس وقت باپ کو بھی اس تسلی کی اشد ضرورت ہے۔ ان کا بیمار دل اب ایسے جھٹکوں کو سہنے کی اتنی قوت نہیں رکھتا۔

انہوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بیٹے کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھا اور زیر لب — "ان شاء اللہ" کہا۔

"میں کروں گا خولہ سے بات۔"

"رہنے ہی دیں بابا! آپ کی بہو الٹے دماغ کی ہے۔ اسے لگے گا اپنی سفارش کروا رہا ہوں میں۔" وہ

ہنسے۔ ”خود ہی ٹھیک کرلوں گا میں اسے۔“

☆☆☆

”دفع ہو جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ جان چھوڑو میری۔ شام کو گھر آؤں تو تمہاری شکل نظر نہ آئے مجھے۔“ سفیان نے برش ڈریسنگ ٹیبل پہ پٹخا۔ موبائل اور موٹر سائیکل کی چابی اٹھا کر کمرے سے نکلنے لگا پھر پلٹا! ”اور ہاں۔ میرے بچوں کو ساتھ لے جانے کی غلطی نہ کرنا۔“ ہاتھ اٹھا کر وارن کرتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا۔ ارم وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

بات یہ ہوئی تھی کہ آج سفیان کو کسی دوست کی شادی میں حیدر آباد جانا تھا، بارات کے ساتھ۔ اس نے چھٹی کی تھی اور تیار ہو رہا تھا جب ارم کی امی کا فون آیا تھا۔ ارم کمرے میں تھی نہیں۔ حبہ نے نانی کی کال اٹھالی تھی اور اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

نانی نے حبہ سے پوچھا تھا۔

”کہاں ہے تمہارا باپ...... پھر تو نہیں کی اس نے تمہاری ماں سے لڑائی؟“

یہ جملہ، یہ انداز اور وہ بھی ایک چھوٹی بچی کے ساتھ۔ سفیان کا خون کھول اٹھا۔ موبائل اٹھا کر کال کاٹی۔ موبائل الماری پہ دے مارا اور کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ ارم کو آواز دی۔ اور اب اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے کر تنتناتا ہوا چلا گیا تھا۔ لڑائیاں تو ہوتی رہتی تھیں مگر ایسی بات آج اس نے پہلی بار کی تھی۔ ایک پل کو تو جی چاہا کہ یوں ہی سب چھوڑ چھاڑ کر نکل جائے۔ اگر سفیان کو اس کی ضرورت نہیں تھی تو وہ کون سا مر رہی تھی اس کے بنا۔

”بچے۔ رکھے بے شک بچے اپنے پاس۔ دو دن کھلائے پلائے سلائے گا، پوٹی صاف کرے گا تو لگ پتا جائے گا۔ لیکن ماہا۔ بخار ہے اسے دو دن سے۔ اس کو لے جاؤں گی۔ ولی۔ وہ تو آتے ہی مجھے نہ دیکھے گا تو رونے لگے گا۔ اور حبہ عروہ۔ نہیں۔ میں کیوں جاؤں اپنے بچے چھوڑ کر۔ لے کر جاؤں گی انہیں۔ پیدا میں نے کیا، تکلیفیں میں نے سہیں، اور حق جتاتا ہے وہ۔ چھین کر دکھائے میرے بچے مجھ سے...... دنیا کی کوئی عدالت میرے بچے مجھ سے چھین نہیں سکتی۔

وہ الماری کی طرف بڑھی اور بچوں کے کپڑے نکالنے لگی۔ لیکن جلدی ہاتھ رک گئے۔

جائے گی کہاں وہ...... امی کے گھر؟

صبح ہی باجی کا فون آیا تھا جو ہفتہ بھر پہلے میکے آئی تھیں۔ بتا رہی تھیں۔

”بھابی کو تو موت پڑی ہوئی ہے ہمارے آنے پہ۔“

اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ نندیں تو پھر نندیں تھیں۔ اب امی ہی بھائی بھابی کو بوجھ لگنے لگی تھیں۔ اوپر سے ان تینوں بہنوں میں سے کوئی میکے چلی جاتی تو ایک دن تو بھابی ہنس کر بات کر لیتی اگلے دن بچوں کی آپس کی لڑائیوں پہ منہ بنا کر جو بیٹھ جاتی تو پھر کمرے سے نہ نکلتی۔ اور بھائی۔ وہ تو سلام دعا کے بعد کوئی بات کرتا ہی نہیں تھا۔

امی کے گھر جا کر بھی اسے سارا خرچہ خود کرنا پڑتا تھا۔ بچوں کے لیے ہر چیز خود منگواتی، بسکٹ، چپس، نوڈلز، ڈائپر۔ سو خرچے تھے بچوں کے ساتھ۔ اور سچی بات تو یہ کہ اس گھر میں اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سب ضرورتیں پوری کیسے ہو گئیں۔ ہمایوں، اسود، بابر بچوں کو لے کر باہر جاتے تو کبھی بچے خالی ہاتھ واپس نہ آتے۔ تایا روز کے روز خرچی دیتے۔ یہاں تو راج کرتے تھے اس کے بچے۔ سب کی آنکھ کا تارا تھے اور خود وہ۔ امی کے گھر بھائی کی بے اعتنائی دیکھتی، بھابی کا موڈ خراب پاتی تو ہفتہ بعد ہی سفیان کو فون کرتی اور واپس اپنے گھر چلی آتی۔ اور اب جو یوں گھر سے نکلتی تو پھر پیچھے رہ کیا جاتا۔

اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر سفیان کے ساتھ جھگڑا ہونے کے بعد وہ سوچتی تھی کہ سب کچھ بھاڑ میں جھونک کر ماں کے گھر چلی جائے۔ اور گھنٹے دو گھنٹے بعد سارے حساب کتاب کر لینے کے بعد ارادہ بدل جاتا اور پھر شام پڑنے تک غصہ بھی اتر چکا ہوتا۔ آج غصہ کم تھا اور دکھ

زیادہ۔ سفیان نے پہلی بار اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔

اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ اور شام تک یہی عالم رہا۔

"کیا ہوا ہے۔ سیفی اتنے غصے میں کیوں نکلا ہے گھر سے؟" رفعت پابی نے پوچھا تھا۔ جواب میں ہمیشہ کی طرح سفیان کی خامیاں گنوانے، اس کے ظلم بیان کرنے کے بجائے وہ چپ رہی تھی بالکل چپ جبکہ آنکھیں میں آنسو اکٹھے ہو گئے تھے جنہیں اس نے نظر بچا کر پونچھا تھا۔

اسے رحیمہ پابی یاد آئی تھیں، بہت یاد آئی تھیں۔

رفعت پابی بھی اس کے اور سفیان کے جھگڑوں سے فکر مند ہوتی تھیں۔ مگر اس کو ہلکی پھلکی سرزنش کر کے معاملہ انہی پر ہی چھوڑ دیتی تھیں۔ رحیمہ پابی کی طرح ثالث کا کردار ادا نہیں کرتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا کہ دوسروں کے معاملات میں پڑنے سے احتراز برتنا چاہیے۔ اپنے حساب سے وہ ٹھیک بھی تھیں۔ ارم کون سا ان کا کہا مان لیتی تھی۔ جہاں تک بات تھی آسیہ پابی کی۔ دیور دیورانی کا جھگڑا ان کو فکر مند نہیں کرتا تھا۔ ان میاں بیوی میں خود کون سی مثالی ہم آہنگی تھی کہ دوسروں کو مشورے دیتیں۔ لڑتے ہیں تو لڑیں۔ مرتے ہیں تو مریں۔

"چچی...... ماہا اٹھ گئی ہے شاید۔" مومنہ نے آواز دی تو وہ جلدی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے ماہا کے لیے بنایا ہوا سیریل لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے سیریل کھلاتی رہی اور اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ ماہا کو تو ماں کے دل کی کیفیت کا اندازہ نہ ہوا۔ عروہ اسکول سے آئی تو بیگ اتارتے ہی ٹھٹکی۔

"کیا ہوا ہے مما؟"

"کچھ نہیں۔" حبہ کو کپڑے پکڑاتے ہوئے اس نے عروہ کو مطمئن کیا جس طرح صبح مومنہ کے پوچھنے پہ اس سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا تھا۔ آج اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ سیفی اس سے کیا کہہ کر گیا ہے ۔ نہ ہی آپی کو فون کر کے ایک ایک بات بتائی تھی۔ اور نہ ہی بچوں پہ چیخی چلائی تھی۔ جس کا بچوں پہ اثر یہ ہوا کہ جب ان کی آپس کی لڑائی پہ بھی ارم نے انہیں تھپڑ نہیں جڑے اور چلائی تک نہیں تو انہیں لگا کہ واقعی مما کی طبیعت صحیح نہیں۔ اس لیے چپ چاپ کپڑے بدل کر کھانا کھانے لگے۔ پھر سو بھی گئے۔

جیسے جیسے شام ہو رہی تھی اس کا دل سکڑ رہا تھا۔ سیفی نے آ کر کہا کہ ابھی تک یہاں کیوں بیٹھی ہے تو کیا کہے گی وہ...... اور جو سب کے سامنے نکل جانے کو کہا تو۔

اسے رحیمہ پابی یاد آئی تھیں، وہ ہوتیں تو معاملے کو سنبھال لیتیں۔ سیفی کو پاس بٹھا کر سمجھاتیں۔ دونوں کی صلح صفائی کرواتیں۔

سفیان گھر آیا تو بچوں کو پیار کیا۔ اور ماہا کو اٹھا کر مومنہ اور گل چہرہ سے دو چار باتیں کر کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

ارم نے غنیمت جانا کہ اس نے سب کے سامنے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خود کمرے میں جانے سے احتراز برت رہی تھی۔ رات کا کھانا سفیان نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ اور کمرے میں جا کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ارم چاہ کر بھی اسے مخاطب نہ کر پائی۔

اگلی شام تک اسے لگ رہا تھا کہ آج سیفی نے اس سے بات نہ کی تو وہ فنا ہو جائے گی۔

کیا کرے وہ؟

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ متفکر سی ادھر سے ادھر چکر لگاتی تھی جب اسے رحیمہ پابی کی باتیں یاد آئیں۔ ان کی نصیحت یاد آئی۔ بچوں کو آواز دیتے ہوئے جلدی سے الماری کی طرف آئی۔

عروہ اور حبہ تو صاف ستھری تھیں۔ البتہ ولی نے کپڑے مٹی سے بھرے ہوئے تھے جانے کہاں قلابازیاں لگاتا آیا تھا۔ اسے اور ماہا کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے۔ اور سفیان کے آنے سے پہلے خود بھی اچھا سا جوڑا پہنا۔ بالوں میں کنگھی کی۔

ہاتھوں اور چہرے پہ لوشن لگا کر ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگائی۔ دس بار بچوں کو نصیحت کی کہ بابا کے آتے ہی ایک دوسرے کی شکایتیں نہیں لگانی ہیں۔ آپس میں جھگڑنا نہیں ہے۔

''ماما آپ کہیں جا رہی ہیں؟'' گھر میں جو بچے ماں کو لپ اسٹک میں دیکھیں گے تو یہی سوال کریں گے ناں اور بار بار کریں گے۔ اگر ماں نے ان کو بھی تیار کیا ہو تو بڑے جوش میں پوچھتے ہیں۔ اور اگر اکیلی تیار ہوئی ہے تو لاکھ وہ انکار کرے، یقین نہیں کرتے۔ ان کو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کہ ماں کہیں اکیلی نہ چلی جائے۔

ارم نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے برآمدے کے وسط میں لگے وال کلاک پہ نظر ڈالی۔ سفیان کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

سفیان آیا۔ معمول کے مطابق بھابیوں بھتیجیوں کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ بچوں کو کچھ وقت دیا پھر اپنا موبائل لے کر بیٹھ گیا۔ ارم کوشش کے باوجود اسے مخاطب نہ کر پائی۔ کھانا لا کر اس کے سامنے رکھا تو اس نے خاموشی کے ساتھ کھا لیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

وقت کیسے بدل جاتا ہے۔ شادی ہوئی تھی تو ساتھ بٹھا کر کھلاتا تھا۔ اگر وہ گھر کے کسی کام میں مصروف ہوتی تھی تو اس کا انتظار کرتا تھا۔ اب تو جیسے ارم کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے ایک سی بات تھی۔

چپکے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے برتن اٹھائے۔ ماہا کے لیے فیڈر بنایا۔ بچوں کو سلایا۔ سفیان اپنے موبائل میں ہی گم رہا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ ولی کو چادر اوڑھا کر وہ سیدھی ہونے لگی تھی جب سیفی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ بس۔ یہ بس تھی۔ سارا ضبط ختم ہوا اور وہ رو دی۔ سفیان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کی ٹھوڑی تھام کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے آنسو صاف کیے۔

''اس جوڑے میں موٹی لگ رہی ہو پر اچھی لگ رہی ہو۔''

وہ ہنس دی۔ مدتوں بعد سیفی نے اس کی تعریف کی تھی۔

''ویسے میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں سچ مچ تم چلی نہ جاؤ۔'' سفیان ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ارم نے شاکی نظروں کے ساتھ اسے دیکھا۔ ''ہاں ناں...... تمہاری ماں کا کیا پتا...... آگ لگانے میں تو وہ ایوارڈ یافتہ ہیں۔''

مشکل تھا مگر ہضم کر گئی تھی ارم ماں کی شان میں یہ گستاخی۔

''دیکھو ارم...... اب رحیمہ پابی نہیں ہیں جو ہماری صلح کروائیں...... سدھر جاؤ۔''

''دیکھیں سیفی...... اب رحیمہ پابی نہیں ہیں جو ہماری صلح کروائیں۔ اس لیے۔'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ مسکرائی۔ سفیان بھی ہنس دیا۔

دونوں کو اس وقت رحیمہ پابی یاد آئی تھیں، بہت یاد آئی تھیں۔ سچ ہے ہر شخص صلح کروانے والا نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''تم جانتی ہو میں نے تمہیں کیوں ضامن مصطفیٰ کے پاس واپس بھیجا تھا، کیوں طلاق کے فیصلے میں تمہارا ساتھ نہیں دیا تھا؟'' پروفیسر زید ابصار کے سوال پہ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں نے تمہاری خاطر کیا تھا یہ فیصلہ۔''

خولہ نے ان نظروں سے ان کی طرف دیکھا جیسے وہ ان کی بات سمجھ نہیں پائی۔

''اس وقت تم اپنے آپ کو غور سے دیکھ لیتیں، اپنی حالت سے اچھی طرح آگاہ ہو جاتیں تو سمجھ جاتیں۔'' بابا جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''تمہاری کچھ کیفیات ان گیارہ دنوں میں مجھ پر بھی عیاں ہو گئی تھیں خولہ۔ تم ہمارے ساتھ بیٹھی ہوتی تھیں مگر تم ہمارے بیچ نہیں ہوتی تھیں۔ تم چاول کی پلیٹ میں خالی چمچہ چلاتی تھیں۔ تم نوالہ توڑ کر منہ تک لے جانا بھول جاتی تھیں۔ ہم آپس

میں بات کرتے تھے، ہنستے تھے، بحث کرتے تھے اور تم خالی نظروں سے ماں باپ کو دیکھتی رہتی تھیں۔ تم پیروں میں چپل پہننا بھول جاتی تھیں۔ تم موبائل کی سیاہ اسکرین کو گھورتی رہتی تھیں۔ گو کہ یہ کیفیات تم پر حاوی نہیں تھیں مگر باپ کی نگاہ سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔" بابا دھیرے دھیرے اسے بتا رہے تھے اور وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ضامن آیا تھا میرے پاس۔ اس نے میری منت کی تھی کہ میں تمہیں اس فیصلے سے روکوں۔ ایک صرف ایک موقع مانگا تھا اس نے مجھ سے...... میں اسے شاید یہ موقع نہ دیتا۔ اگر جو میں تمہاری ایڈووکیٹ زینب سے ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ نہ سن لیتا یا تم سے وہ حرکت سرزد نہ ہوتی۔" بابا نے چند لمحوں کا توقف کیا۔

"کیسی گفتگو...... کیسی حرکت بابا؟" اس سے صبر نہ ہوا تو پوچھ بیٹھی۔ پروفیسر صاحب مسکرا دیے۔

"تم نے جو خلع کی درخواست دائر کی تھی اس سلسلے میں غالباً ایڈووکیٹ زینب نے تمہیں فون کیا تھا اور وہ تمہیں کچھ ہدایات دے رہی ہوگی کہ عدالت میں یہ کہنا وہ کہنا وغیرہ۔ تمہاری گفتگو سے مجھے یہ ہی اندازہ ہوا تھا۔ کیونکہ تم اس سے کہہ رہی تھی کہ تم یہ الزام ضامن مصطفیٰ پر نہیں لگا سکتیں کیونکہ اس نے کبھی تمہارے ساتھ مس بی ہیو نہیں کیا، تمہیں گالی نہیں دی، تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اور تم نے یہ بھی کہا کہ وہ کردار کا ستھرا انسان ہے۔"

خولہ کو یاد آیا کہ واقعی اس کی اس طرح کی گفتگو زینب کے ساتھ ہوئی تھی۔

"تم نہیں جانتیں خولہ! اس وقت تم خود ضامن مصطفیٰ کی وکیل بنی ہوئی تھیں۔ پھر میں کیسے ضامن مصطفیٰ کو ایک موقع نہ دیتا۔"

"اور وہ حرکت......" خولہ نے ذرا سا نظریں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ "وہ کیا تھی بابا؟"

پروفیسر زید الابصار ہنس دیے۔ اور پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔ "میں، تم

اور تمہاری ماما چائے پی رہے تھے۔ گفتگو تو ہم دونوں ہی کر رہے تھے۔ تم تو چپ سی بیٹھی تھیں۔ میری نظریں تم پر ہی تھیں جب تم لاشعوری طور پر بیٹھے بیٹھے میز کی سطح پہ انگلی پھیرنے لگی تھیں۔ میں نے غور کیا تو تم بار بار "ضامن" لکھ رہی تھیں۔

اس کے چہرے پہ ہلکی سی لالی آئی۔ کیسے اس کی کیفیات اس کے باپ پہ عیاں ہوتی رہی تھیں۔

"میں تمہارا ساتھ دیتا۔ تمہاری ماما کو بھی سمجھا لیتا۔ تمہیں واپس نہیں بھیجتا۔ اگر مجھے ایک فیصد بھی یقین ہوتا کہ تم اسے بھول کر دوسری شادی کر لو گی۔ اور تم دنیا کے کسی بھی اور مرد کے ساتھ خوش رہ لو گی۔"

اس کی آنکھوں کی سطح نم سی ہوئی۔

"تم دنیا کے کسی اور مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اسی شخص کو موقع دوں جس کے ساتھ میری بیٹی خوش رہ سکتی ہے۔"

اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔

ماں باپ بھی کیا ہیں۔ جو اولاد کو ان سے زیادہ جانتے ہیں سمجھتے ہیں۔

"ضامن کو معاف کر دو بیٹا۔" بابا نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "وہ اچھا شخص ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا، مجبور ہو کر کیا۔ اور یہ بات تو تم بھی مانو گی خولہ کہ بہادر سے بہادر، طاقتور سے طاقتور شخص بھی زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر مجبور ہو سکتا ہے۔ میں بھی تو مجبور ہوا تھا ناں۔ تم بھی تو مجبور ہوئی تھی ناں۔"

ٹپ ٹپ آنسو بابا کے ہاتھ پہ گرتے رہے۔

"پچھلے چار دن سے اس کی جو حالت ہے۔ اسے دیکھ کر میں یہ ہی جان پایا ہوں کہ اس شخص سے زیادہ کوئی میری بیٹی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہر رنجش ہر گلے ہر شکوے کو مٹا کر اس کے ساتھ نیا سفر شروع کرو بیٹا۔ خوش رہو گی۔"

بابا نے اس کا آنسوؤں سے بھرا چہرہ صاف کیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ وہ سسکتے ہوئے ان کے سینے سے جا

لگی۔

☆☆☆

اس شام بہت عرصہ بعد چوہدری نگر کے اس سرمئی گیٹ والے گھر میں خوشیاں اتری تھیں۔

تاریخ میں پہلی بار ڈرا ڈھنگ سے تیار ہمایوں اور اس کے پہلو میں ارغوانی رنگ کے خوبصورت لباس میں بیٹھی مومنہ۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھنے کی آرزو ان دو لوگوں نے بھی کی تھی جو آج ان کے بیچ نہ تھے۔ اور یہ منظر دیکھنے کی خواہش آسیہ نے بھی نہ کی تھی جو کڑا دل کر کے مومنہ کو انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ سچ ہے۔ اولاد سب منوا لیتی ہے بھئی۔ اور جب اولاد کے ساتھ اس کا باپ بھی کھڑا ہو تو پھر بس کہاں چلتا ہے۔

ورنہ بھی بناتیں اس لڑکی کو بہو...... جس کے پیچھے لگ کر ہمایوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ چھوٹا ہی سہی، الگ گھر بنائے گا۔ جس میں وہ سب شفٹ ہوں گے۔ پھر شادی کرے گا۔ اور چوہدری سلیمان یعقوب نے صاف منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر الگ نہیں رہ سکتے۔ وہ بھلے مومنہ کو لے کر الگ گھر میں رہے۔ اور ہمایوں نے زمین کا وہ حصہ دیکھ لیا تھا جہاں اس نے گھر بنانا تھا۔ وہ مومنہ کے لیے زمینیں نہیں چھوڑ سکتا تھا مگر اس کی جائز خواہش پوری کر سکتا تھا۔ اور وہ پوری کرنے کا اس نے خود سے عہد کیا تھا۔ وہ اچھا بیٹا، اچھا بھائی ہے، اسے اچھا شوہر بھی بننا تھا۔

آسیہ کی جو خواہش عمر بھر پوری نہ ہوئی وہ ان کی بہو کی پوری ہونے جا رہی تھی۔ وہ خوش نہیں تھیں۔ مگر چوہدری سلیمان یعقوب اور بھائیوں کو سمجھ میں آ گئی تھی کچھ فیصلے جذبات سے نہیں تدبر سے لینے چاہییں۔ اسی میں بہتری ہوتی ہے۔ محبت اور عزت بھی باقی رہتی ہے۔ انہوں نے ہمایوں کو الگ گھر بنانے کی اجازت دے دی تھی۔

وقت کے ساتھ کئی تبدیلیاں آ رہی تھیں مگر اسی تقریب میں بیٹھی مہر تاب کو زندگی ٹھہری ہوئی ساکن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کچھ لوگ ایک غلطی پر معتوب ٹھہرا دیے جاتے ہیں۔" اس نے اسود کی طرف دیکھ کر سوچا تھا جو ہمایوں کو گھڑی پہنا رہا تھا۔ اب وہ مہر تاب کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

"اور کچھ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ غلطیوں پہ غلطیاں کر کے بھی کوئی نقصان نہیں اٹھاتے۔ جن کا انجام "اور پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔" والا ہوتا ہے۔" مہر تاب مومنہ کے ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"شاید ان کی غلطیاں قابل معافی ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے کسی کے مرنے کی دعا نہیں مانگی ہوتی۔"

تصویر بننے کے بعد اسود جو اٹھا تو اس کی نظر بھی مہر تاب پر پڑی جو یہاں ہو کر بھی پتا نہیں کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کمزور لگ رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت میں زردیاں گھل گئی تھیں۔ وہ دکھی ہوا۔ وہ کس چیز کی سزا دے رہا تھا اسے۔ وہ کرنا چاہتا تھا اپنے ظرف کو بڑا۔ مگر وہ اطہر کے دو دشمنوں کو بھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔

بددعا تو امی نے بھی امت الاحد کو مرنے کی دی تھی۔ پر وہ ماں تھیں، ان کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ مہر تاب کو چھوڑ سکتا تھا۔ پھر وہ جانتا تھا کہ امی کے دل میں اطہر کے لیے خیر تھی۔ وہ اس سے پیار کرتی تھیں۔ بیٹے کی فکر اور محبت میں ان کے منہ سے برے کلمات نکلے۔ جبکہ پھوپھو فردوس کی نفرت کبھی بھی ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ اسی نفرت کو اس نے مہر تاب کی آنکھوں میں پایا۔ بات یہیں تک رہتی تو شاید وہ بھی مہر تاب کے لیے سوچ لیتا۔ بات بہت بڑی تھی۔ پھوپھو فردوس کی نفرت سے بھی بڑی۔

"اطہر کیوں نہیں آیا ابھی تک؟" ہمایوں اٹھ کر اس کی طرف آیا۔ اور پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟" وہ جھنجلایا۔

ہمایوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا بات ہے اسود! تم آج کل اطہر سے بات

نہیں کرتے۔اس دن باغ میں وہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا رہا اور تم نے مصافحہ تک نہیں کیا اس سے۔اور تمہاری موجودگی میں وہ گھر بھی نہیں آتا۔" جو بات ہمایوں کو کچھ دن سے کھٹک رہی تھی وہ آج زیادہ محسوس ہوئی۔اطہر ان کا کزن تھا، بچپن کے دوست تھا۔ہر موقع کا ساتھ تھا۔آج اس اہم دن پہ اس کی غیر موجودگی بہت محسوس ہو رہی تھی۔

"اسی سے پوچھ لینا۔"

"اس سے کیوں پوچھوں۔تم زیادہ عزیز ہو۔تم بتاؤ گے مجھے۔"

اسود کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ ہمایوں کو اس کی آنکھوں میں نمی محسوس ہونے لگی۔

"بتا دوں گا۔" اسود نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

ہمایوں اس کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتا تھا جب مومنہ نے اسے بلایا۔اس کا سنہری چہرہ دیکھتے ہوئے وہ فی الحال سب بھول گیا۔

☆☆☆

مساجد سے فجر کا بلاوا آ رہا تھا جب پروفیسر زید ابصار ٹوپی سر پہ پہنتے ہوئے دروازے کی طرف آئے۔ایک دم انہیں محسوس ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی ہے۔زید تو اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔پھر کون ہے؟

انہوں نے مڑ کر دیکھا اور حیران ہوئے اور پھر شاد۔

ان کے سامنے عبدالہادی کھڑا تھا۔

"میں۔میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیوں نہیں......آؤ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

ثروت نے بارہا ان سے کہا تھا کہ وہ ہادی کو مسجد ساتھ لے کر جایا کریں۔انہوں نے ایک دو دفعہ عبدالہادی کو چلنے کے لیے کہا مگر وہ ٹال جاتا تھا۔انہوں نے بھی اصرار نہیں کیا۔وہ اس کے اوپر دین کو مسلط نہیں کرنا چاہتے تھے۔البتہ وہ اپنے عمل سے اپنی گفتگو سے بہت سے پیغام دے جاتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ اسے وقت چاہیے۔انہیں یقین تھا کہ اس راہ پہ وہ خود چلے گا اپنی مرضی ومنشا کے ساتھ۔

پچھلے دنوں جب خولہ اسپتال میں تھی۔تب اس نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ دعا کیسے کرے۔

وہ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔انہیں فکر نہیں تھی۔جب رب نے اسے رام سے عبدالہادی بنا دیا تھا تو منزل تک بھی اسی نے پہنچانا تھا۔

☆☆☆

گنگا سے مل کر عبدالہادی نکل کھڑا ہوا۔اسے وشوا ناتھ سے ملنا تھا۔اس کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ حویلی گیا ہوا ہے۔وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔وہیں سے حویلی چل پڑا۔

"عبدالہادی۔" مُرک پتا نہیں کہاں سے نکل کر اس کے سامنے آئی تھی۔

عبدالہادی اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"تم کب آئے؟"

"آج ہی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"واپسی کب ہے؟"

"آج ہی۔"

"اچھا مجھے بھی لے چلنا۔مجھے کراچی جانا ہے۔بھائی کے پاس۔اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اس دن بس کچھ دیر رک کر واپس آنا پڑا۔"

"جی!" وہ حیران ہوا۔مصطفیٰ امین کی بیٹی کو بھلا وہ اپنے ساتھ کیسے لے جا سکتا تھا۔"میں بس سے آیا ہوں۔"

"واپسی گاڑی سے کر لینا۔"

"میرے پاس گاڑی نہیں۔"

"میرے پاس ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"پھر بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔" اس لیے صاف جواب دے کر آگے بڑھا۔اسے وشوا ناتھ سے ملنا تھا۔

"کیوں ڈرائیور آپ صرف اٹل کے بن سکتے ہیں کیا؟" اس کے منہ سے نکلا۔

عبدالہادی کو جھٹکا لگا۔ وہ قدم آگے بڑھا پایا نہ ہی اس کی طرف پلٹ سکا۔ مرک گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

"تمہیں برا لگا اصل کا حوالہ دینا۔"

"نہیں ...... اس کا حوالہ ہی تو اچھا لگتا ہے۔" اس کے چہرے پہ انوکھا سا رنگ آیا۔

"کون اندھا تھا، جسے لگتا تھا کہ تم نے اسے مارا؟" مرک کہے بنا رہ نہ سکی۔

عبدالہادی کے پاس جواب نہ تھا، وہ معذرت کر کے اس کے پاس سے نکلنے لگا۔

"مجھے لے کر جانا۔ بابا سے اجازت میں خود لے لوں گی۔" اب وہ پرانی مرک نہیں تھی جو کبھی ماں کے ذریعے کبھی عباس اور کبھی بھاؤ کے ذریعے اپنی خواہشات بابا سائیں تک پہنچاتی تھی۔ اب وہ ڈاکٹر مرک مصطفیٰ تھی جس پہ اس کا باپ فخر کرتا تھا اور ضامن مصطفیٰ کے بعد وہ ان کی لاڈلی اولاد بن چکی تھی۔

وہ محض سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ حویلی کے ایک ملازم نے رہنمائی کی اور اسے وشواناتھ تک پہنچایا۔ وہ ایک کرسی بن رہا تھا۔ اس کی نظر بہت کمزور ہو چکی تھی۔ وہ دیکھ کر کم اور ہاتھ سے ٹٹول کر کام زیادہ کر رہا تھا۔

"چاچا۔" اس کی آواز نے وشواناتھ کے ہاتھ روکے۔ وہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ پہچان نہیں پایا تو ہاتھوں کا چھجا سا بنایا۔

"چاچا...... میں عبدالہادی...... لالو کوہلی کا بیٹا۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"لالو......" ایک سرد آہ بھری۔ "لالو جو ڈیکرو۔"

عبدالہادی نے بھی ایک آہ بھری۔

وشواناتھ نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پہ پھیرا۔ جانے کیوں عبدالہادی کی آنکھ نم ہوئی۔

"آپ کیسے ہیں؟" عبدالہادی نے پوچھا۔

اس کے سوالوں کے جواب دیتے وشواناتھ پھر کرسی بننے لگا تھا۔ وہ محنت کش لوگ تھے، آخری سانس تک ہاتھ سے کما کر کھانے کی کوشش کرتے تھے۔

جوٹ میں بل آیا تو عبدالہادی اسے سیدھا کر کے دینے لگا۔

"چاچا...... کیوں کرتے ہو اتنی محنت۔ موہن ہے ناں۔ اب آپ آرام کریں۔ وہ دیکھے گا سب۔"

"میری قسمت لالو جیسی کہاں۔ نکما ہے مارا سورا۔ لائق تو لالو کا سورا ہے۔"

وہ ہلکا سا ہنسا۔ اسے لگا کہ وشواناتھ بھی ان کے خاندان کے باقی لوگوں کی طرح اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

"چاچا!" اس نے جھجک کر وشوا کو مخاطب کیا۔

"ہوں......"

"بابا میری باتیں کرتا تھا؟" وہ سوال جو ماں سے کیا کرتا تھا اب حسرت بن کر اوروں کے سامنے بھی ہونے لگا۔

"کون...... لالو...... تیری بات...... نہ کبھی کی تو ناں۔" حد درجہ صاف گوئی بھی اکثر دل دکھا دیتی ہے، وشوا جانتا تو شاید تھوڑا سا جھوٹ بول لیتا۔

عبدالہادی چپ سا وہاں سے اٹھ آیا۔

"مارو ڈیکرو" سننا اس کی وہ حسرت تھی جو کبھی پوری نہ ہونا تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ قدم تیزی سے اٹھاتا ہوا واپسی کی راہ پہ ہوا۔ لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد ہی رفتار میں کمی آئی۔ قدم اٹھانا مشکل ہوا تو پاس والے درخت کو تھام لیا۔ اور کتنی ہی دیر تک کھڑا رہا۔ روتا رہا۔ آستین سے اپنی آنکھیں صاف کرتا رہا۔ حویلی کی کھڑکی سے مرک اسے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

"دروازے پہ کیا لکھا ہے؟"

ضامن مصطفیٰ اس میسج کو پڑھ کر حیران ہوئے۔ خولہ کی طرف سے موصول ہونے والے اس پیغام کو وہ سمجھ نہ پائے تھے۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے ٹائپ کر کے سینڈ

کا بٹن پریس کیا۔
"باہر میرے کمرے کے دروازے پہ کیا لکھا ہے؟"
"کمرہ نمبر ۶۔" وکیل صاحبہ کی بولی سمجھ میں تو انہیں اب بھی نہ آئی تھی بہرحال دروازے پہ جو لکھا تھا وہ ٹائپ کر کے بھیج دیا۔
"اوہ اچھا۔ مجھے لگا کہ دروازے پہ لکھا ہے۔ ضامن مصطفیٰ کا اندر آنا منع ہے۔"
"اوہ۔" ضامن بے ساختہ مسکرا دیئے۔ تھوڑی دیر مسکراتے رہے پھر کرسی سے اٹھ کر اپنا کالر ٹھیک کیا بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بنا دستک دیئے کمرے میں داخل ہو گئے۔
خولہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے ہونٹوں پہ بہت پیاری مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا پھر بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔
ضامن آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے، دونوں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ دونوں کی آنکھیں پرنم تھیں۔ دونوں چپ تھے۔
"بیٹھ جائیں ناں۔"
ضامن مصطفیٰ کی نگاہیں سہنا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔ اس کی پیلاہٹ لیے رخساروں پہ ہلکا سا گلابی پن جھلکا تھا۔
"نہیں ...... میں تو یہیں رہوں گا آپ کے پاس۔" وہ اس کے کچھ اور پاس ہوئے۔
"اتنے دن سے تو دور دور تھے۔" وہ اپنے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔
"اتنے دن سے آپ کا اور میرا خاندان دور ہوتا تو میں قریب ہوتا ناں۔ کبھی بابا کبھی بابا سائیں کبھی ماما کبھی اقصیٰ کبھی مُرک۔"
خولہ مسکرا دی۔ کچھ دیر پھر بہت کچھ کہتی چپ درمیان میں رہی۔
"ضامن۔"
"خولہ! میرا رب جانتا ہے کہ میرے لیے تم کیا ہو؟ تمہارا مقام کیا ہے۔" انہوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ مسکرا دی۔
اسے بے ہوش ہونے سے پہلے کا وہ لمحہ یاد آیا جب اسے ضامن مصطفیٰ کا چہرہ عبدالہادی کا چہرہ لگا تھا۔ وہ چہرہ جس نے اپنی سب سے پیاری ہستی کو کھو دیا تھا۔ اس دن قبرستان اور پھر کورٹ میں ضامن مصطفیٰ کے چہرے پہ بھی ان کو کھو دینے کا خوف نظر آیا تھا۔ اپنی عزیز از جان ہستی کو کھو دینے کا خوف۔
اب کے جو رت نکھری تھی تو ہر دوسوسے کو دھو کر نکھری تھی۔
وہ مسکراتی رہی، آنسو بہتے رہے اور ضامن مصطفیٰ دل کی بات کہتے رہے۔ وہ اس کے قریب اس کے بیڈ پر بیٹھ چکے تھے۔ اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔
"پہلے مجھے لگتا تھا کہ جگدیش مہیشوری آپ کا دوست ہے۔ پھر مجھے لگنے لگا کہ آپ کو جگدیش مہیشوری نے بلیک میل کیا۔"
"نہیں بلیک میل میں محبت کے ہاتھوں ہوتا ہوں۔ میری ماں میری پہلی محبت۔ مشکل میں جس جس نے ان کا ساتھ دیا۔ میں ان کا احسان مند ہو جاتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے جو کر سکتا ہوں، اس کے لیے کر ڈالوں۔"
"نبی بخش کو بھی اس لیے ماما کہتے ہیں۔ اس کی فکر کرتے ہیں۔"
"ہاں ...... وہ اس رات رستم ماما کے ساتھ تھے۔ ان کی کلہاڑی نے میری ماں اور میری طرف کسی کو بری نیت سے بڑھنے کی جرات کرنے نہیں دی تھی۔ بڑا زور آور تھا نبی بخش ماما۔" ضامن مصطفیٰ ماں پہ احسان کرنے والوں کو فراموش نہ کیا کرتے تھے۔ پھر اگر گائتری دیوی کے جڑے ہاتھ دیکھ کر وہ قدم اٹھا گئے تھے تو اب وہ اس بات پہ یقین کر سکتی تھی۔
"آپ اپنی ماں سے بہت محبت کرتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ...... اور بیوی سے بھی بہت محبت کرتا ہوں۔" برجستہ جواب آیا۔ وہ ہنس دی۔

اسپتال میں کسی کو کچھ اچھا نہیں لگتا مگر آج اس وقت اسپتال کے اس کمرے میں بیٹھ کر بھی زندگی بہت حسین لگ رہی تھی۔

اف۔ یہ ہنسی۔

ان کی بنجر ساعتوں پہ جیسے پھواری پڑی۔ وہ بے خود سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ خولہ کی ہنسی مسکراہٹ میں سمٹی۔ خواہ مخواہ بلش کرنے لگی۔

"تم کچھ کہو گی نہیں خولہ!"

"ضامن! چلیں اپنے گھر چلتے ہیں۔"

وہ کہتے ہوئے ان کے سینے سے جا لگی۔ ضامن مصطفیٰ نے مسکرا کے اس کے بالوں پہ اپنے لب رکھے۔

☆☆☆

شیلف میں سے کتاب نکالتے ہوئے اس کو بڑا جھٹکا لگا تھا۔ اس کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ جس کتاب پر اس کے ہاتھ تھے، وہ وہیں چھوڑی اور کالی جلد والی کتاب نکال لی۔

اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں ہوتا تھا۔

پروفیسر زید ابصار کی لائبریری میں یہ کتاب۔

"اوہ یار تم کتاب لینے گئے تھے یا لکھنے؟" زید ایک دم لائبریری میں داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی کتاب واپس شیلف میں رکھی۔

زید نے اسی شیلف کے سامنے آ کر مطلوبہ کتاب نکالی۔

"ویسے یار! بڑی یادداشت ہے پروفیسر صاحب کی۔ خوب یاد ہوتا ہے کس شیلف میں کس قطار میں کس نمبر پہ رکھی ہے کتاب۔ تم کیوں کوما میں چلے گئے ہو۔ آجاؤ۔ بڑی اچھی بحث چھڑی ہے شاگردوں کی پروفیسر صاحب کے ساتھ۔" زید نے لائبریری سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ وہ نہیں گیا۔ ابھی اس کے حواس مختل تھے۔

اسے تو پروفیسر زید ابصار بڑے پکے مسلمان لگتے تھے۔ پھر وہ کتاب۔

شاگردوں کے جانے کے بعد جب پروفیسر صاحب اپنی کتابیں سمیٹ رہے تھے، اس نے پوچھ ہی لیا اس سیاہ جلد والی کتاب کے بارے میں۔ وہ ہنس دیے۔

"تم نے غور نہیں کیا تھا عبدالہادی۔ ورنہ اسی الماری کی دوسری قطار میں تمہیں بھگود گیتا بھی نظر آجاتی۔"

"گیتا؟" وہ جتنا حیران ہو سکتا تھا، اتنا ہوا۔

"ہاں گیتا۔ میرے لیے صرف ایک کتاب۔ اور کچھ نہیں۔ ویسے بائبل کے ساتھ رکھا توریت کا نسخہ تم نے نہیں دیکھا تھا کیا؟"

نہیں۔ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بائبل کو دیکھ کر ہی اتنے شاک میں آگیا کہ کسی اور کتاب پہ پھر نظر پڑی ہی نہیں تھی۔

"آپ نے پڑھی ہیں یہ کتابیں؟"

"ہاں...... ہم ان کتابوں پر ایمان لاتے ہیں ...... تو پڑھ کیوں نہیں سکتے۔"

"میں نے تو سنا ہے مسلمانوں کی کتاب قرآن ہے۔"

"بے شک۔"

"پھر یہ کتابیں پڑھ کر آپ کافر نہیں ہو جائیں گے؟"

"ہر بات پہ کافر قرار دینا تو لوگوں کا شیوہ ہے۔ اللہ رب ہے، عظیم ہے۔ اس کا کلام پڑھوں گا اور کافر ہو جاؤں گا۔ عجیب بات نہیں؟"

"وہ...... میں نے کسی کو بھی کسی اور مذہب کی کتاب پڑھتے دیکھا نہیں ناں کبھی۔"

"ہاں ...... وہ اس لیے کہ ہمارا ماننا ہے کہ ان کتب میں بہت ردوبدل ہو چکا ہے۔ وہ اللہ کا کلام رہی نہیں۔ انسانوں نے اپنے فائدے اور مفاد کے لیے اس میں بہت تحریف کر لی ہے۔ ہم ان کتب کو مکمل کلام اللہ سمجھ کر نہیں پڑھ سکتے۔ میں اس لیے پڑھتا ہوں کیوں کہ میرا ایمان کمزور نہیں۔ اور جو بات

قرآن کے مخالف جائے، اس کو قبول نہیں کرتا۔ میں ان کتب کا مطالعہ صرف اپنی نالج میں اضافے کے لیے کرتا ہوں۔ ایمان میں اضافے کے لیے قرآن میرے لیے کافی ہے۔"

"تو آپ بھی ہوئے ناں کٹر۔ پڑھیں بے شک سب کتابیں، عمل قرآن کے مطابق ہی کرنا ہے۔"

پروفیسر صاحب ہلکا سا ہنس دیے۔

"انسان جس گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ جو مذہب اپنے گھر کا پاتا ہے، جس کے پیروکار اس کے ماں باپ ہوتے ہیں باپ دادا ہوتے ہیں، اسی مذہب کو حق سچ سمجھتا ہے۔ اسی سے محبت کرنے لگتا ہے اسی کو اپناتا ہے۔ دنیا کا باقی ہر مذہب اسے باطل لگتا ہے۔ زیادہ ریشو ان لوگوں کا ہے جو ساری عمر اسی کی پیروی کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں اور اسی پہ مر جاتے ہیں۔" پروفیسر زید ابصار کا لہجہ دھیما اور ملائم تھا۔

"پھر انسان کیا کرے؟" عبدالہادی کو دین دھرم کی بات کم سمجھ میں آتی تھی۔ وہ اس لڑکی امت الاحد کی طرح نہ تھا جس نے "احد احد" کرتے زندگی گزاری اور "احد احد" کرتے اس جہاں سے چلی گئی۔

"انسان کو چاہیے کہ وہ کھوج میں نکلے۔ حق پانے کی کھوج میں۔ اسے اللہ نے عقل سمجھ دی ہے۔ وہ تلاش کرے حق کو۔ ہندو پیدا ہوا تو "رام رام" کرتے مر جائے، کرسچن ہوا تو "یسوع مسیح" کا نام لیتا مر جائے۔ یہ تو بڑی گھاٹے کی بات ہے۔ تم جانتے ہو۔ میں نے ایف ایس سی کے بعد "الہامی کتابوں" کا ایک کورس کیا۔

"کیوں؟ آپ کے لیے تو قرآن ہے ناں؟"

"بالکل ہے۔ اور باقی الہامی کتابیں بھی اللہ ہی کی ہیں جن پہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ اور جس چیز پر ہم ایمان لاتے ہیں، اس کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہیے۔"

عبدالہادی نے سر ہلایا۔

"آپ نے بھگود گیتا بھی پڑھی؟"

"ہاں پڑھی ہے۔"

"میں نے تو لوگوں کو اس سوال پہ کانوں کو ہاتھ لگاتے دیکھا ہے۔"

"میں کانوں کو ہاتھ صرف اپنی بیگم کے تیور دیکھ کر لگاتا ہوں۔" پروفیسر صاحب ہنسے۔ عبدالہادی بے اختیار مسکرایا۔

"آپ بہت مختلف ہیں۔"

"اوہ یار......" پروفیسر صاحب اپنی تعریف پہ بچوں کی طرح شرما جاتے تھے۔

"تو یہ سب کتابیں پڑھ کر آپ کو لگا کہ اللہ ہے اب وہ اکثر سوال پوچھنے لگا تھا۔

"بے شک۔"

"مجھے کیسے ملے گا یہ اللہ؟"

"مل گیا تو قبول کرو گے؟" پروفیسر صاحب نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مل جائے گا۔ تلاش کرو۔"

"کہاں تلاش کروں؟ کس طرح تلاش کروں؟"

"جہاں سے مرضی تلاش کرو۔ جس طرح مرضی تلاش کرو۔ وہ تمہیں ہر جگہ ملے گا۔ ہر طرح سے نظر آئے گا۔" وہ پروفیسر صاحب کی بات کو کسی طرح سے نہیں سمجھ پایا تھا مگر پتا نہیں کیوں دل تیزی کے ساتھ دھڑکا تھا اور بازوؤں کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ سنسناہٹ سی ہوئی تھی پورے جسم میں۔

☆☆☆

اتنا چپ...... اتنا چپ تو وہ کبھی رہا نہیں تھا۔

"ہمایوں!" اسود نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ہمایوں بولا کچھ نہیں۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ اسود کو لگا کہ اس نے اپنی آنکھیں صاف کی ہیں۔ اسود کو بھی اتنی ہی تکلیف ہوئی تھی جب اسے معلوم ہوا تھا۔

"مجھے لگتا تھا کہ جگدیش مہیشوری نے تمہیں

تکلیف دینے کو جھوٹ بولا کہ اس رات اسے چوہدری نگر سے کوئی کال آئی تھی۔" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ اسود نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا کہ کاش ایسا ہی ہوتا۔

"اس رات میں جاگ رہا تھا۔ تم سے بات کر کے پوڑھی کی طرف آیا تو پھوپھو فردوس کے ویہڑے پہ نظر پڑی تھی۔ اسے دیکھا تھا۔ اسے جاگتے دیکھا تھا اور کچھ دیر پہلے چھت پہ بھی۔" جملہ مکمل کرنا ہمایوں سے مشکل ہوا۔

ان دونوں سے کچھ دور درخت کی اوٹ میں کھڑے شخص کے لیے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہوا۔ وہ ڈھیلے قدم اٹھاتا اپنے گھر کی جانب بڑھا۔ وہ ایک ہارا ہوا شخص تھا۔ آج ایک اور نظر سے گر گیا تھا۔

وہ چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ میر واہ آگئی۔ میر واہ خشک تھی بالکل اس کے دل کی طرح۔

اگر اسے پتا ہوتا کہ اس رات کیا ہو جانا ہے، وہ کبھی امتل کے بھائی کو کال نہیں کرتا۔ وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو بس امتل کو چاہتا تھا۔ وہ تو بس اسے اسود کی ہوتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ یک طرفہ محبت میں چوہدری اسود حیدر بھی مبتلا ہوا تھا مگر وہ ہیرو تھا۔ یک طرفہ محبت میں اطہر علی بھی مبتلا ہوا تھا مگر وہ ایک ولن تھا۔ اس کی ماں کی نفرت اور اس کی بہن کی جلن نے امتل کو ویسا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا اس کی محبت نے دے دیا۔

وہ غلط سوچ رہا تھا۔ جب انسان ایسی گھٹیا حرکت کرتا ہے تو نقصان وہ خود کو پہنچاتا ہے۔ گھاٹے کا سودا وہ اپنے لیے کرتا ہے۔

دوسری طرف اسود ہمایوں سے کہہ رہا تھا۔

"میں مہر کو اپنا بھی لوں تو اسے خوش نہیں رکھ پاؤں گا۔ کیونکہ پھوپھو اس کی ماں اور اطہر اس کا بھائی ہے۔ یہ رشتے ختم نہیں ہو سکتے اور میں ان کا چہرہ دیکھ کر مہر کو جانے انجانے میں سزا دیا کروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کی کسی اور اچھے بندے سے شادی ہو جائے۔ تو کچھ عرصہ بعد بھول جائے گی مجھے۔"

"اور تم...... تم نے اپنے لیے کیا سوچا ہے؟" ہمایوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے کیا سوچنا ہے۔ پہلے کیا زندگی ویسی چلی جیسا سوچا تھا۔" اس کے لہجے کا حزن ہمایوں کو تکلیف دیتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ دکھ بھی کم ہونے والا نہیں۔ وقت کے ساتھ اتنا ضرور ہوگا کہ اسود بھی نارمل زندگی کی طرف آجائے گا۔ شادی بھی کرے گا۔ بچے بھی ہوں گے۔ امیت الاحد ان سب کی زندگی میں ہمیشہ رہنے والی تھی۔ ایک پُرنم مسکراہٹ بن کر۔ لیکن مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا تو پھر جینے والے کو ان سب کی طرف لوٹنا ہوتا ہے جو حیات کے تقاضے ہیں۔ اسود کو بھی لوٹنا ہو گا۔

ایمان نے تو اسود جیسے بندے کا ساتھ ٹھکرا کر خسارا لے لیا۔

ایک امتل تھی، بت پرست گھر میں پیدا ہوئی مگر ہدایت پا گئی۔ ایک امتل ہے، توحید پرست گھر میں پیدا ہوئی مگر بھٹک گئی۔ آدم زاد ایسے ہی ہیں کچھ۔ ناسمجھ میں آنے والی انوکھی مخلوق۔

☆☆☆

"جہاں سے مرضی تلاش کرو۔ جس طرح مرضی تلاش کرو۔ وہ تمہیں ہر جگہ ملے گا۔ ہر طرح سے نظر آئے گا۔"

پروفیسر زید ابصار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

وہ گھنٹہ بھر سے ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔ پھر ایک دم رکا۔ آسمان کی طرف نگاہ کی پھر جھکالی۔

"ساری عمر باپ کی محبت کے لیے ترستا رہا۔ "مارو ڈیکرو" سننے کے لیے کان ترس گئے۔ بابا مر گیا لیکن یہ لفظ نہ بولے۔ میں جانتا ہوں، اب یہ تو ممکن نہیں کہ کبھی وہ مجھے "مارو ڈیکرو" بولے۔ یہ تو تیرے لیے بھی ممکن نہیں۔ جو لڑکی میرے لیے سب کچھ تھی، اس کے منہ سے بھی "عبدالہادی" نہیں سن سکتا۔ اس کا کبھی ہاتھ نہیں تھام سکتا۔ یہ ممکن نہیں۔ یہ تو تیرے

لیے بھی ممکن نہیں۔ بس تو ہے۔ اے اللہ اگر تو ہے۔ تو میرے دل کو قرار دے۔ قرار دے۔ جس دن مجھے سکون مل گیا۔ میں مان جاؤں گا کہ تو ہے۔ اور تو ہی سب کچھ ہے۔"

وہ اسی طرح اللہ سے بات کر رہا تھا جس طرح امت الاحد کیا کرتی تھی۔ وہ اسی طرح اللہ سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا زمین پر۔

☆☆☆

وہ گھر سے نکلا تو مولوی عبدالرحیم اور عبدالواحد سے ملنے کے لیے تھا لیکن رستے میں پروفیسر زید ابصار کا فون آ گیا۔ ان کے ایک اسٹوڈنٹ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور خون کی فوری ضرورت تھی۔ انہوں نے عبدالہادی سے اس کا بلڈ گروپ پوچھ کر فوراً اسے اسپتال پہنچنے کو کہا تھا۔ اس نے وہیں سے رکشہ والے کو مڑنے کا کہا۔ کچھ دور جا کر گاڑیوں کی قطار ملی۔

"احتجاج چل رہا ہے۔ بھائی اس طرف روڈ بلاک ہے۔ آپ دوسرا رستہ لے لیں۔" پاس سے گزرتے موٹر سائیکل سوار نے باقیوں کو بھی مطلع کیا۔

رکشہ ڈرائیور بڑبڑاتے ہوئے رخ موڑنے لگا۔ عبدالہادی کو بھی پریشانی ہوئی۔ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچنا تھا۔ گلیوں میں سے ہو کر ایک لمبا رستہ لے کر جب وہ اسپتال پہنچا تو پروفیسر صاحب کی کال آئی کہ خون کا انتظام ہو گیا ہے، وہ بھلے واپس آ جائے۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس کا آنا بے کار گیا۔

وہ اسپتال کے خارجی راستے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے وہ...... وہ لفظ سنے، جو اس کی روح نکال گئے ہوں جیسے۔ وہ اپنے قدموں پہ ساکت جو ہوا، تو ہل نہیں پایا۔

"مارو ڈیکرو!"

زمین سے آواز آئی تھی یا آسمان سے۔

"مارو ڈیکرو!" کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پھر کہا تھا۔ آواز تو زمین سے ہی آئی تھی۔ وہ پلٹ نہیں سکا تھا۔ کندھے پہ ہاتھ رکھنے والا ہی سامنے آیا۔

"کیا ہے یار! کان وان صاف نہیں کیے کبھی۔ رکشے سے تیری صورت دیکھتے ہی پکارا۔ پھر اتر کر تیرے پیچھے بھاگا۔ تم سنتے نہیں۔" سامنے والا بولتا ہوا خاصا پرجوش نظر آتا تھا۔ پھر وہ کہیں پیچھے دیکھ کر چلایا تھا۔

"رستم خاناں...... مارو ڈیکرو۔"

رستم خاناں بھی بھاگتا ہوا آیا اور ساکت کھڑے عبدالہادی کا ہاتھ خود تھام کر مصافحہ کیا۔

"واللہ...... لالو ٹھیک کہتی تی یہ تو لالو سے بوت ڈیرنٹ اے۔ (لالو ٹھیک کہتا تھا۔ یہ تو اس سے بہت مختلف ہے۔)"

"ہاں...... پر ہے تو لالو کا ڈیکرو ناں۔" پھر وہ عبدالہادی سے مخاطب ہوا۔ "جب لالو تجھے مارو ڈیکرو کہتا تھا تو یہ رستم خاناں بڑا ہنستا تھا۔"

عبدالہادی کو سانس جیسے آ نہیں رہا تھا۔

"کدھر تھے تم...... تیرے ابا کا افسوس کرنے گوٹھ گئے، نظر نہیں آئے۔"

"پر تیرا پوٹو دیکی (پھر تمہاری فوٹو دیکھی) موبائل میں۔ تو نے اپنا منگیتر ماردی۔" رستم خاناں اپنی انکوائری شروع کرنے والا تھا جب نیاز علی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چپ کروایا۔ اور اپنا تعارف کروانے کا خیال آیا۔

وہ آڑھتی تھا اور جب لالو سبزیاں لے کر منڈی آتا تھا، تو اس سے ملاقات ہوئی اور پھر دوستی۔ یہ وہ بندہ تھا جس سے لالو دل کی ہر بات کرتا تھا۔ گوٹھ میں وہ اپنا دل کسی کے سامنے کھول کر رکھ نہیں سکتا تھا۔ ذرا بھی بات نکلتی تو سائیں صبغت اللہ کی طرف سے بڑی پکڑ ہوتی۔ گوٹھ میں وہ کسی کے سامنے بیٹے کی بات بھی نہیں کرتا تھا، اس کی انا اسے اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کبھی گنگا کے ساتھ بھی رامو کی بات کر سکے۔ نیاز علی وہ شخص تھا، جس کے ساتھ وہ رامو کی باتیں بھی کرتا تھا۔

"جب اس نے تجھے ہاتھ جوڑ کر گھر سے نکالا تو

اگلے روز میرے پاس آکر بڑبڑا رویا۔ میں نے کہا۔ رونا ہی تھا تو نکالا کیوں؟ کہنے لگا۔ نہیں نکالتا تو ایک دن وڈیرے اس کی جان لے لیتے۔"

عبدالہادی کا دل چاہا وہ اپنا سینہ پکڑ کر ایک چیخ مارے اور پھر بلند آواز میں رو دے۔

"ویسے اس کو تیری بہادری پہ بڑا فخر بھی تھا۔ کہتا تھا۔ دیکھنا نیاز علی۔ جو کام میں نہیں کر پایا، مارو ڈیکرو کرے گا۔ میں تو اپنی کنوار کو نہیں بچا پایا تھا، وہ ہم سب کو بچالے گا، سائیں کی غلامی سے آزاد کروا لے گا۔"

لاریب لاریب لاریب ...... اللہ ہے، بے شک ہے۔

اس نے آنکھیں بیچ کر کھولیں۔

"چاچا! آپ مجھے اپنا ایڈریس دیں۔ میں آپ سے ملنے آؤں گا۔"

اس نے کہا۔ وہ نیاز علی سے بہت سی باتیں سننا چاہتا تھا، وہ باتیں جو عمر بھر کی حسرت تھیں۔ لیکن اس وقت وہ کسی اور سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

ان سے پتا لینے کے بعد ان سے اجازت چاہی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا دوسرے احاطے میں آگیا اور لمبے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر ایک دم سجدے میں گر پڑا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"مارو ڈیکرو۔" یہ دو لفظ سننے کے لیے وہ ساری زندگی ترسا۔ باپ دنیا سے گیا تو سمجھ گیا کہ اب یہ خواہش حسرت رہ جائے گی۔ اور آج یہ حسرت پوری ہوئی تو کیسے۔

لاریب...... لاریب...... لاریب۔

بے شک امت الاحد کا احد ہے۔ بے شک عبدالہادی کا ہادی ہے۔ جس کے لیے سب ممکن ہے۔

☆☆☆

پروفیسر زید البصار اندر داخل ہوئے تو وہ بخار میں پھنک رہا تھا، کپکپی اس کے جسم پہ طاری تھی۔

"لاریب...... لاریب...... بے شک تو ہے۔

بے شک۔"

پروفیسر صاحب نے پیار سے اس کے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کو سامنے پا کر بہت دیر انہیں دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ کل سے نیم بے ہوشی کی حالت میں جو خود کلامی کر رہا تھا پروفیسر صاحب جان گئے تھے کہ یہ رونا عام نہیں۔ یہ رونا خاص ہے۔ انہوں نے اسے رونے دیا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں نے اللہ کو پا لیا۔" آخر وہ بولنے کے قابل ہوا۔

پروفیسر صاحب ہلکا سا مسکرائے اور اس کے مزید بولنے کے منتظر ہوئے۔

"اس دن میں تو مولوی عبدالرحیم اور عبدالواحد سے ملنے گھر سے نکلا تھا۔ آپ کے اسٹوڈنٹ کا ایکسیڈنٹ، خون کی ضرورت، مجھے آپ کا وہاں بھیجنا، رستہ بلاک ہونا، میرا لیٹ پہنچنا، خون کا انتظام کہیں اور سے ہو جانا تو سب بہانہ بنے قدرت کی طرف سے۔ اصل میں مجھے اس لمحے وہاں اس اسپتال کے خارجی دروازے پہ پہنچنا تھا جہاں نیاز علی کا رکشہ میرے پاس سے گزرتا اور وہ مجھے دیکھ لیتا۔ اور پھر۔ پھر مجھے پتا چلتا کہ اللہ ہے۔ جس سے میں نے قرار مانگا تھا۔ اس نے مجھے قرار دیا وہ بھی انہی لفظوں کے ساتھ جس کے لیے میں ساری عمر ترسا۔ "مارو ڈیکرو۔ مارو ڈیکرو۔" مجھے لگتا تھا کہ اب یہ ناممکن ہے کہ میں یہ لفظ سنوں مگر اللہ نے سنوا دیے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے۔ اللہ کو جہاں مرضی جیسے مرضی تلاش کرو، وہ مل جاتا ہے۔"

پروفیسر صاحب نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ انہیں اس چہرے پہ پیار آیا۔ انہیں یقین سا ہوا کہ اس چہرے کو جنت کی ہوا چھوئے گی۔

انہوں نے زیر لب "ان شاء اللہ" کہتے ہوئے جھک کر اس چہرے کو چوم لیا۔

☆☆☆

''میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ نزل زہرا بھری جوانی میں چلی گئی۔ اس کی بہو کو بھی نہ کچھ ہو جائے۔'' مامی نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار پہناتے ہوئے اپنے سنہری خدشے کا اظہار کیا۔ خولہ مسکرا دی۔ اور غلام نبی سے گلدستہ وصول کیا۔

''ادی! یہ شبنم ہے میری گھر والی۔ اب سے یہ کرے گی سب کام آپ کے۔'' غلام نبی بھی مامی کو ستا کر ہی لطف لیتا تھا۔

''اس کو کیا پتا...... پرہیزی کھانے کیسے بنتے ہیں۔ نوشی بنائے گی۔''

''پرہیزی کھانے ......اچھا...... ہاسپٹل میں تو پیزا اور لوڈڈ فرائز چل رہے تھے۔'' ضامن نے اسے صوفے پہ بٹھاتے ہوئے چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

مامی کو اچھی تو نہیں لگی یہ ہنستی مسکراتی جوڑی اور اچھی لگنی بھی نہیں تھی جب تک کہ نوشی کا اچھی سی جگہ رشتہ نہ ہو جاتا۔ جبکہ نوشی ماں سے زیادہ عقلمند تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ضامن مصطفیٰ کی زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ اب اپنے باس کی طرف مائل رہتی تھی۔

''پرہیزی کھانا بھی میں بناؤں گی اور خیال بھی میں کروں گی۔'' مُرک جوس لیے لیونگ میں داخل ہوئی اور اعلان کیا۔

''مُرک! تم واپس چلی جاؤ۔ میں ہوں اپنی بیوی کا خیال رکھنے کو۔'' ضامن نے اس بڈی کو گھورا جو جب سے آئی تھی، خولہ کے پاس سے نہیں ہٹ رہی تھی۔

مامی کو دھچکا سا لگا۔ ضامن کا بہن کے ساتھ بات کرتے ہوئے لب ولہجہ بدلا ہوا تھا۔

''ایسے نہیں جانے والی میں۔ میں تو سوچ رہی ہوں۔ ہاؤس جاب یہیں رہ کر کروں۔''

''غلام نبی نیچے والا کمرہ تیار ہے؟'' ضامن نے اس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ غلام نبی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ضامن پھر بھی خود کمرہ دیکھنے گئے۔ جب تک خولہ خود سے چلنے نہیں لگتی، انہیں نیچے والے بیڈروم میں ٹھہرنا تھا۔ اطمینان کر لینے کے بعد جب لیونگ میں واپس آئے تو خولہ کو مسکراتے ہوئے پایا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ عباس کا میسج ہے۔''

''آ رہا ہے وہ؟'' ضامن نے مسکرا کر پوچھا۔

''تمہیں ان لوگوں سے اتنی محبت کیوں ہونے لگی ضامن۔ بھول گئے کیا۔''

''کچھ نہیں بھولا مامی......'' ضامن نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے کاٹی۔ ''لیکن یہ سمجھ میں آ گیا ہے کہ ہر انسان کو دوسرا موقع ملنا چاہیے اپنی غلطی کو سدھارنے کا۔ اللہ کتنے مواقع دیتا ہے مامی۔ ہمیشہ راہ کھلی رکھتا ہے۔ ہم انسان دوسرا موقع دینے کا ظرف بھی نہیں رکھتے اکثر۔ اور پھر مرک اور عباس تو معصوم ہیں۔ تب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔''

مُرک کی آنکھیں نم ہوئیں۔ گو کہ بھاؤ اب اس کے ساتھ سختی سے بات نہیں کرتے تھے۔ کبھی مسکرا بھی دیتے تھے مگر آج پہلی دفعہ ایسی بات کی کہ دوری مٹتی سی محسوس ہوئی۔

''اف بھابھی! گر ہی نہ جاؤں میں بھاؤ کے منہ سے پھول جھڑتے سن کر۔ اپنے ہینڈسم کلائنٹ سے کہیں۔ آ کر مجھے تھام لے۔'' اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے خولہ کے کان کے پاس سرگوشی کی تو خولہ کو ہنسی آ گئی۔

مامی پھر زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکی تھیں۔

☆☆☆

''تم میری محسن ہو امت الاحد!'' اظہار محبت بہت ہو چکا گونگا، آدھا ادھورا، مردہ جیسا بھی۔ آج یوم تشکر تھا۔

''تم سے محبت نہ ہوتی تو عبدالہادی بھی نہ ہوتا، کوئی امر ہوتا کوئی رام ہوتا۔ وہ ہوتا بھی پھر کیا ہوتا۔''

چھوٹی سی قبر پہ کلی کلی گرتی رہی۔ قبر مہکتی رہی۔ یہاں بیٹھ کر اس پل اس دن عبدالہادی کو سمجھ میں آیا کہ کسی کے جیتے جی اسے بتا دیا جائے کہ وہ ہمارے لیے کیا ہے، کسی کے جیتے جی محبت کو مٹھی میں قید کر کے

نفرت کو پھونک مار کر اڑا دیا جائے تو زندگی تو بھلے اتنی ہی پائے گا، جتنے سانس اس کے لکھے ہوئے مگر صحیح معنوں میں اس زندگی کو جی جائے گا۔

زندگی نے بہت سبق پڑھا دیے تھے۔ بہت سے سوالوں کے جواب دے دیے تھے۔ اور اس سارے مرحلے میں وہ رام کوہلی سے عبدالہادی ہو گیا تھا۔ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

دور بیٹھے گورکن نے کورے کاغذ پہ "محبت" لکھا۔ اور اس کے ذہن میں جیتے کردار کاغذ پہ سانس لینے لگے۔

بننا تو وہ چاہتا تھا گیت کار مگر بن گیا گورکن۔ وہ نہ جانتا تھا کہ آگے قسمت میں کہانی کار بننا لکھا ہے قاری کہتے تھے کہ اس کی کہانیاں اکثر قبرستان سے کیوں شروع ہوتی ہیں۔ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اصل کہانی تو شروع ہی موت سے ہوتی ہے۔

☆☆☆

"اسے چھوڑ دو پردیپ۔"

ایڈووکیٹ مہیش کے چلے جانے کے بعد لاجونتی نے مسکراتے ہوئے سامنے پڑے کاغذات کو اٹھایا اور پنکھا سا بنا کر چہرے پہ ہوا کی۔ پھر ہنس دی۔ ہنستے ہنستے ایک نمبر ڈائل کیا۔ اور کہا۔

"لاجو۔"

"کہاناں پردیپ! چھوڑ دو اسے۔ وہ بھی اپنی مرضی سے سانس لے۔ بہت لے لیے زندگی نے امتحان اس سے۔"

دوسری طرف پردیپ نے گہری سانس لی۔

"وہ مسئلہ نہیں کرے گی؟"

"اسے کبھی مہشوریوں کی دولت جائیداد میں دلچسپی نہیں رہی۔ اور ویسے بھی ابھی بہت عرصہ اس کا دھیان اس طرف جائے گا نہیں۔ اور جب تک وہ وہ کچھ جان پائے گی، ہم سب کچھ بیچ کر ملک سے باہر جا چکے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے، اسے چھوڑنے میں اتنی جلدی نہ کریں۔" پردیپ کو ابھی بھی اس کی طرف سے ڈر تھا۔ وہ مہیشوریوں کی وارث تھی۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔ خود ہی تو بتا رہے تھے کہ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید شمشان گھاٹ پہنچ گئی ہے۔ پنڈت نے منہ کھول دیا کہ اس رات درگا کی ڈیڈ باڈی وہاں نہیں لائی گئی تھی۔ بلکہ بھاری رقم کے عوض اس سے ایک دوسری لڑکی کی راکھ حاصل کی گئی تھی۔ بھلے راکھ سے ڈی این اے ٹیسٹ ممکن نہیں پھر بھی ڈر تو ہے ناں۔ اس وکیل کے قدم اب رکنے والے تھوڑی ہیں۔ وہ جان گئی کہ درگا زندہ ہے تو پاتال سے بھی اسے نکال لائے گی۔ پھر ہماری خرد برد پہ بھی اس کی نظر جائے گی۔"

"ہوں......" پردیپ نے سر ہلایا۔ پہلے اسے ڈر تھا کہ جگدیش مہیشوری یہ راز کھلنے پہ اسے مار ہی ڈالے گا۔ اب اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ ایک وکیل پہ سب کے سامنے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پڑا رہنے والا تھا اب بہت عرصہ تک جیل میں۔

"درگا مل بھی گئی تو وہ پوری کہانی جانے بنا چین نہیں لے گی۔ تم جانتی ہو۔ کتنے لوگ انوالو کرنے پڑے تھے۔ ڈاکٹرز، پوسٹ مارٹم ٹیم، پولیس کے چند بندے۔ کسی ایک نے بھی منہ کھول دیا تو۔" اس نے سب خدشات اس کے سامنے رکھے۔

"فکر نہیں کرو۔ وہ ہم تک پہنچی بھی تو ہمیں ایک لڑکی کی جان بچانے پہ ہیرو سمجھے گی۔" لاجونتی اطمینان سے بولی۔ وہ جانتی تھی کہ خولہ اس کے کمرے میں کیا دیکھ کر چونکی تھی۔ یہ بات اس کے حق میں جانے والی تھی۔ ویسے بھی یہ سچ تھا کہ اس نے درگا کی جان بچائی تھی۔ بعد میں حالات اس کے مطابق ہوتے گئے، یہ اس کی قسمت تھی۔ جگدیش جکڑتا چلا گیا۔ اس سے جان چھوٹتی نظر آئی تو اس کے ذہن نے پلان بنانے شروع کر دیے۔

وہ اس انتظار میں تھی کہ جگدیش جیل جائے اور وہ سب سنبھال لے۔ وہ درگا کو کبھی بھی آزاد کرنے کا نہیں سوچتی تھی۔ کیونکہ درگا زندہ ہے، یہ سامنے آنے کے بعد جگدیش پھر جیل سے باہر ہوتا۔ لیکن یہاں

بھی حالات پلٹ گئے۔ جگدیش نے ایڈووکیٹ خولہ بنت زید پہ قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اب جب بھی وہ باہر آتا تو لاجونتی اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکی ہوتی۔ پاور آف اٹارنی ملنے کے بعد وہ سب بیچ کر ملک سے باہر چلے جانے کا ارادہ رکھتی تھی، جہاں نہ کبھی جگدیش اس تک پہنچ پاتا نہ ہی پردیپ۔

ہاں...... پردیپ بھی...... لالچی کمینہ مرد۔

اسے اپنی زندگی میں اب کوئی مرد نہیں چاہیے تھا۔ مستقل تو بالکل بھی نہیں۔ وہ آزادی چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے درگا کو بھی آزاد کر دیا تھا۔ گائتری دیوی کے لیے مہیشوری پیلس چھوڑ دیا تھا اس نے۔ اب اتنی بھی ظالم نہیں تھی وہ۔ اس کا ارادہ تو بچہ بھی گائتری دیوی کی جھولی میں ڈال دینے کا تھا مگر وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کی راہ سے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

''اسود!''

یہ آواز...... یہ آواز چوہدری اسود حیدر سماعت کھو کر بھی سن سکتا تھا۔ یہ آواز چوہدری اسود حیدر یادداشت چلی بھی جائے، تو پہچان سکتا تھا۔

''اسود!'' وہ رو دی تھی۔ ''میں اس رات پہنچ نہیں پائی تھی تمہارے پاس۔ اب آجاؤں؟''

اس کی گویائی گئے کئی صدیاں بیت گئیں جیسے۔

''بہت دیر ہو گئی اسود؟'' وہ مایوس سی پوچھ رہی تھی۔ وہ ایک دم ہوش میں آیا۔

''کہاں ہو تم؟''

''پتا نہیں۔ بس گاڑی مجھے یہاں چھوڑ گئی۔''

''جس کے فون سے بات کر رہی ہو، اسے بولو کہ مجھے لائیو لوکیشن بھیجے۔ میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔'' اس کے دماغ نے جیسے ایک دم کام کرنا شروع کیا تھا۔

جیسے ہی لوکیشن ملی وہ گھر سے نکلا۔ اس کے حواس ابھی پوری طرح قابو میں نہ تھے۔ وہ چلا چلا کر خوشی سے سب کو بتانا بھی چاہ رہا تھا کہ اجتل زندہ ہے لیکن گم صم تھا۔ بائیک گھر میں کھڑی تھی لیکن وہ پیدل ہی نکل پڑا تھا۔ اس کا دل کبھی تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگتا اور کبھی ڈوب سا جانے لگتا۔ پھر وہ نیچے زمین پہ بیٹھ گیا۔ اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

وہ بے یقین بھی تھا۔ یہ معجزہ کیسے؟

''واقعی وہ اجتل تھی؟''

وہ سوچ میں پڑتا۔

''یہ آواز اجتل کے علاوہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

جب وہ سیم نالے کے قریب پہنچا تو ایک دم پلٹا اور واپس چل دیا۔ اس کے قدم پھوپھو فردوس کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

زمین اپنے مدار میں گھوم رہی تھی۔

دن اور رات اپنے وقت پہ آتے جاتے۔

وہی چوبیس گھنٹے، وہی ہفتے کے سات دن، وہی سال کے بارہ مہینے۔

کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا لیکن سب کچھ بدل گیا تھا۔ جب عبدالہادی رکوع میں جھکا۔

امت الاحد کے قدم وہیں تھم گئے۔

ایک فرضی کردار ''عبدالہادی'' جس کو وہ پہروں سوچا کرتی تھی، جس کے لیے اپنے احد سے دعائیں مانگا کرتی تھی، وہ مجسم حقیقت بنا زمین کے سینے پہ پیشانی سجا رہا تھا۔

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھ سے آنسو گرا۔

دھرتی کا چکر، امبر کا رنگ، لمحوں کا کھیل سب کچھ بدل گیا۔ جب عبدالہادی سجدے میں گیا۔

وہ اسے دیکھتی رہی۔ مسکراتی رہی۔ روتی رہی۔

عبدالہادی جائے نماز اٹھاتے ہوئے جو پلٹا تو اسے سامنے پایا، جنت میں جس کے ساتھ کی دعا ابھی مانگی تھی۔ وہ تو دنیا میں سامنے تھی۔ وہ ساکت ضرور ہوا مگر بے یقین نہیں۔ اس نے اس اللہ کو پایا تھا، جس کے لیے سب ممکن تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

دونوں قدم قدم ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔

تمہاری چپ اور ہمارا لہجہ
کبھی ملیں گے تو بات ہوگی
ہماری آنکھیں، تمہارا چہرہ
کبھی ملیں گے تو بات ہوگی

دونوں کی آنکھ میں آنسو تھے، لیکن دونوں ایک دوسرے کو خوب دیکھ سکتے تھے۔

محبتیں جب تم لکھا کرو گے
ہمارا ناموں میں نام ہوگا
ہمارے لفظوں سے بات بن کر
ملو گے، جب تم کلام ہوگا

"عبدالہادی!" آنسو موتیوں کی لڑی بن کر چہرے پہ لڑھکتے چلے گئے۔

اس کی زندگی کی دوسری بڑی حسرت اس کے کان میں چہچہائی۔

"لاریب ...... لاریب ...... لاریب ...... اللہ ہے۔" عبدالہادی نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔

"مجھے زید نے بتایا کہ عبدالہادی کے مہمان آئے ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھوں تو سہی کون ہے۔" ثروت ہاتھ میں ٹرے لیے اندر داخل ہوئیں تو دونوں چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

ٹرے میں تین گلاس تھے جن میں جوس تھا۔ انہوں نے ایک گلاس اتل کو دیا، ایک عبدالہادی کو اور تیسرے گلاس کے لیے ادھر اُدھر دیکھا۔ اتل کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے کمرے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ بھاگ کر باہر آئی۔

اسود جا چکا تھا۔

☆☆☆

"کھانا کھا لو میری بچی!"

سوکھے پتے اس کے پاؤں کے نیچے آ کر چرمرائے۔

"غصہ ہو۔ دیکھو اب تو وہاں جیو بھی نہیں ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا ناں۔ میں نے توڑ دیا۔"

اتل آہستہ سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"پھر بھی تم کھا نہیں رہیں۔ پہلے بھی ستاتی تھیں، اب بھی ستاتی ہو ممی کو۔"

اس نے چہرہ اٹھا کر لاجونتی کی طرف دیکھا۔

"سمجھتی ہیں، یہ بکری ان کی بیٹی ہے۔" وہ ہنسی اور ماں بیٹی کو ایک دوسرے کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔

اتل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے ممی کی طرف دیکھا جو اس بکری کے جسم پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ان کی موجودگی کو جیسے انہوں نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

"ممی!" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں آہستہ سے انہیں پکارا۔ ان کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ لیکن انہوں نے چہرہ نہیں موڑا۔

"ممی!" اس نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

گائتری دیوی نے چہرہ موڑا۔ اسے دیکھا۔ اور دیکھتی رہیں۔ پھر بکری کی طرف منہ کر کے ہنسنے لگیں۔ انہیں درگا یونہی ہر طرف نظر آتی رہتی تھی۔ پہلے پہل وہ اس کی طرف لپکا کرتی تھیں، اب نہیں۔ انہیں پتا تھا کہ وہ ان کا وہم ہے۔ اب ان کی درگا دوسرا جنم لے چکی تھی۔

"دیکھو...... کھاؤ گی نہیں تو مر جاؤ گی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ مرنے کے بعد اگلے جنم میں پھر میری درگا بن کر آؤ گی۔ بالکل ایسی۔ ایسی والی درگا۔" انہوں نے اتل کی طرف اشارہ کیا۔

اتل سے سسکی روکنی مشکل ہوئی۔

"ہاں ...... ایسی درگا بن کر آنا۔ پھر میں کبھی تمہیں نند لال کے گھر نہیں لے کر جاؤں گی۔ پھر تم کبھی کھو نہیں سکتیں۔ میں اور تمہارے ڈیڈی تمہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ ہر وقت اپنی نظر کے سامنے۔"

اتل پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ایک ماں اللہ کے پاس جا چکی تھی اور ایک اس کو سامنے پا کر بھی ممتا نچھاور کر رہی تھی ایک بکری پہ۔

"جگدیش پتا نہیں کہاں چلا گیا؟ اور تم کھا نہیں رہیں۔" وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ انہیں تو اپنا وہ بیٹا بھی بہت یاد آتا تھا۔ جو کچھ پل کے لیے ہی سہی، چوبیس گھنٹے میں شکل تو دکھاتا تھا۔ موبائل میں کم ہی سہی، ساتھ بیٹھ کر کھانا تو کھاتا تھا، آتے جاتے ہی سہی،

بات تو کرتا تھا۔ وہ بیٹا۔ جو پیٹتا تھا، ان کو پاگل کہتا تھا، ان کو دھکا دیتا تھا، جو ان کی بیٹی کا قاتل تھا۔ یاد آتا تھا۔ اور یاد آنے کے لیے یہ وجہ ہی کافی تھی کہ وہ ان کا بیٹا تھا۔

"ممی مجھے پہچانیں پلیز ...... مجھے اپنے گلے سے لگائیں۔" اس نے روتے روتے ان کے کندھے پہ سر رکھا اور ان کو اپنی بانہوں میں لیا۔ گائتری دیوی کو ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ آنکھوں میں کوئی تاثر سا جاگا۔

"مجھے پیار کریں پلیز...... پلیز......" اس نے اب اسی طرح روتے روتے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ انہوں نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کوئی شبیہ، کوئی خیال نہیں تھی۔ وہ تو شاید سچ میں ان کی بیٹی تھی۔

"تم آگئیں درگا۔ کہاں کھو جاتی ہو۔ چوہدری نگر والے لے گئے تھے کیا؟ تم ان کو نہر سے ملی تھیں؟" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولتی رہیں۔ وہ روتی رہی۔

☆☆☆

"آپ کے کپڑے استری کر کے، ناڑا ڈال کر رکھ دیے ہیں۔ خبریں سن کر اٹھیں اور تبدیل کر لیں۔" رفعت جہاں نے ہاتھوں پہ لوشن لگاتے ہوئے مچھر دانی میں لیٹے چوہدری صاب کو مخاطب کر کے کہا۔ ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک اور نئے لان کے سوٹ میں چوہدرانی جی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

"فردوس کو یہیں بلا لو۔" مچھر دانی میں جا کر واپس نکلنا چوہدری صاب کو آج بھی اوکھا ہی لگتا تھا۔

"لو...... یہ کیا بات ہوئی۔ ہم لڑکے والے ہیں جانا تو ہمیں ہی ہوگا۔" رفعت جہاں نے چادر اوڑھتے ہوئے ان کے آئیڈیے کو رد کیا۔

"اچھے خاصے بہن بھائی ہوتے ہیں، بچوں کے رشتے کرتے ہی لڑکے والے لڑکی والے بن جاتے ہیں۔" چوہدری صاب کے اعتراضات بھی وہی تھے۔

مومنہ نے کولر میں پانی ڈالتے ہوئے بھائی کو غور سے دیکھا پھر ہمایوں کی طرف جو اسی کی طرح بے چین سا تھا۔ وہ آسیہ کے پاس چلی آئی۔ جو الماری سے چادر نکال رہی تھیں۔

"آپ کو یہ سب ٹھیک لگ رہا ہے؟"

"کیا؟"

"بھائی اور مہر......" وہ متذبذب سی تھی۔

"اسود نے خود کہا ہے تو ٹھیک ہی ہے ناں۔" چادر اوڑھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ مومنہ کی نظر ان کے ہاتھ پہ گئی۔

"یہ کٹ کیسے لگا؟"

"پتا نہیں...... کون سی نئی بات ہے۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"آپ اپنا خیال نہیں رکھتیں چاچی! مجھے یاد ہے۔ بچپن میں مجھے آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت لگتے تھے۔" مومنہ نے سنی پلاسٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر لگاتے ہوئے کہا۔

آسیہ خاموش رہیں۔ مومنہ کمرے سے نکلی تو ان کی نظریں اس کے پیچھے تک گئیں۔

یہ لڑکی ان کو کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ ہمایوں کے لیے تو بالکل بھی نہیں۔ اس کو دیکھ کر ملکوں کی آسیہ یاد آتی تھی۔ اس سے جلن بھی محسوس ہوتی تھی۔ مگر وہ ان کا خیال رکھنے لگی تھی۔ ہر بات میں ان کی رائے لینے لگی تھی۔ ان کو اہمیت دینے لگی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ دکھاوا نہیں۔ دکھاوا ہوتا تو منگنی سے پہلے ہوتا۔ منگنی کے بعد کیا ضرورت تھی اسے یہ سب کرنے کی۔

مومنہ کے بارے میں ان کی سوچ مکمل اور یکدم نہیں مگر آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہی تھی۔

اور کمرے سے باہر نکلتی مومنہ کو ان کے لفظ پھر سے چوٹ پہنچا رہے تھے۔ وہ سپہر پھر سے ڈس رہی تھی مگر اس نے سر جھٹک کر اس سپہر کو دماغ سے جھٹکا۔ اس نے ہمایوں سے شادی کرنی تھی تو پھر اس کی ماں کو بھی عزت دینی تھی۔ طے تو یہی کیا تھا۔ اب عمل آسیہ چاچی کے رویے پہ منحصر کرتا تھا۔ وہ اچھا

چلیں گی تو سب اچھا رہے گا۔نہیں تو۔

جی ہاں...... مومنہ حیدر اب اتنی بھی سیدھی نہیں ہوئی تھی۔

سلیمان چاچو کے گھر آتے ہی امی ابو اور آسیہ چاچی پھوپھو فردوس کی طرف چلے گئے تو اس نے ہمایوں کو اشارہ کیا۔اس نے فٹ سے اسود کی گردن بازو میں جکڑی۔

"یہ کیا چکر ہے؟"

"کیا؟" اسود نے بمشکل گردن چھڑوائی۔

"تو بھی جانتا ہے اسود۔ہمیں کیا وخت پڑا ہوا ہے۔یہ مہر کے ساتھ شادی۔ہم میں سے کسی کو سمجھ میں نہیں آئی۔" ارم نے ماما کو تھپکتے ہوئے گھورا۔

"اوہ چاچی۔آپ سب ہی تو چاہتے تھے کہ میں شادی کر لوں۔وہ فاطمہ بھی ہر وقت جان کھاتی تھی۔اب کر رہا ہوں تو کیا مسئلہ ہے۔مہر پسند نہیں کیا آپ کو؟"

"سوال مہر کا نہیں، سوال کیا ہے، تو بھی جانتا ہے۔سیدھی طرح سے بتاتا کیوں نہیں۔" سفیان نے ایک لگائی اس کی پشت پہ۔

"میں احتل کے ساتھ اس لیے شادی نہیں کر رہا کہ وہ عبدالہادی کو پسند کرتی ہے۔" وہ سیدھا اس موضوع پہ آیا جس نے آج شام سے سب کے پیٹ اور سر میں درد کر رکھا تھا۔

"کیا؟" ارم کی چیخ سب سے بلند تھی۔جبکہ ہمایوں ایک گہرا سانس لے کر ٹھنڈا ہو کر یا شاید پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا تھا۔سفیان کو دھچکا لگا تھا اور مومنہ چپ سی رہ گئی۔اس کے اندر بھی عبدالہادی کے لیے جنگ چل رہی تھی مگر اسود بھائی تھا تو ووٹ اسی کی طرف جاتا تھا۔

"ہاں...... اور آپ ہی بتائیں۔احتل کے لیے زیادہ بہتر ساتھی کون ہوگا۔میں۔اسود...... جو حالات سے نظریں چرا کر باہر بھاگ گیا، وہاں ایک اور لڑکی کے ساتھ شادی کا سوچ بھی لیا۔۔۔یا عبدالہادی، جس نے اس کے لیے دھرم چھوڑا، قید کاٹی، اور کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔"

صحن میں خاموشی سی چھا گئی۔اداسی بھری خاموشی۔یعنی اب اس گھر میں رحیمہ احمد اور چوہدری احمد یعقوب کی بیٹی، ان سب کی احتل بہو بن کر آنے والی نہیں تھی۔

"تو کتنا عظیم ہے ناں میرے یار۔میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔" ہمایوں نے ایک دم بانہیں اس کی طرف بڑھا کر چپکنے کی کوشش کی۔اور اس کے گلے سے لگ گیا۔چند لمحے دونوں نے اس درد پہ قابو پانے میں لگائے، جو دل میں کہیں اٹھ رہا تھا۔پھر نم آنکھیں لیے، مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

دیوار کے دوسری پار صحن میں اسود اور مہرتاب کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔اور سر پہ دوپٹہ اوڑھے، مدھم سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے، کپوں میں چائے انڈیلتی مہرتاب کو وہ سرمئی سی شام یاد آ رہی تھی۔جس شام اسود اس سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ وہ واپس آتے ہی اپنا رشتہ بھیجے گا۔اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

"شکریہ اسود۔" اس کی انگلیوں نے ٹائپ کیا اور پیغام دیوار پار پہنچا۔جہاں اسود سب کو مطمئن کرنے کے بعد گھر سے باہر نکل آیا تھا۔اس وقت کچھ گہری سانسیں لینے کے لیے، دل کے درد کو ہوا کے دوش پہ رخصت کرنے کے لیے کچھ وقت کے لیے تنہائی درکار تھی۔

مہرتاب کا میسج پڑھنے کے بعد وہ ہلکا سا مسکرایا۔

اسے وہ سرمئی شام یاد آئی جس شام اس نے صدیوں بعد احتل کی آواز سنی تھی۔اور وہ اس سے ملنے کے لیے جاتے جاتے لوٹ آیا تھا۔اسے کچھ دیکھنا تھا، کچھ جانچنا تھا۔

وہ پھوپھو کو سلام کر کے ان سے پوچھ کر سیدھا مہرتاب کے کمرے میں آ گیا تھا۔مہرتاب تو اسے دیکھ کر جیسے بے ہوش ہونے کو آ گئی تھی۔پھر خود پر قابو پا کر ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ پلنگ پہ رکھ کر وہ اٹھ کھڑی

ہوئی۔ وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"مہر۔"

آہ...... مہر تاب نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کتنے عرصے بعد اس نے یوں اسے پکارا تھا۔

"مہر......" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "مہر...... احتل زندہ ہے۔" وہ جیسے خوشی کے ساتھ رو دینے کو تھا۔

"کیا؟"

اس وقت...... اس وقت مہر تاب کو پتا نہیں تھا کہ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سچ بتاؤ اسود...... مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم سچ کہہ رہے ہوناں اسود۔" وہ پوچھ رہی تھی اور چوہدری اسود حیدر فیصلہ لے رہا تھا۔

"اللہ تیرا شکر۔" مہر تاب نے بے اختیار شکر ادا کیا۔ آج ایک بڑے بوجھ سے آزاد ہوگئی تھی وہ۔

اور اس کے اسی جملے پہ چوہدری اسود حیدر نے فیصلہ لے لیا۔

"میں احتل سے ملنے جا رہا ہوں۔ واپس آتے ہی امی ابو کو بھیجوں گا ہماری شادی کی بات کرنے۔" وہ کھل کر مسکرایا تھا اور ابھی بھی اس کا میسج پڑھ کر مسکرا دیا تھا۔

اس شام وہ احتل کے حیات ہونے کی خبر پہ اس کا پہلا رد عمل دیکھنے گیا تھا۔ اگر وہ یہ جان کر پریشان ہوا تھی تو وہ کبھی اس سے شادی نہیں کرتا۔ لیکن اس کی خوشی دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ وہ پھوپھو فردوس کی بیٹی، اطہر کی بہن ہو کر بھی ان جیسی نہیں۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کا ساتھ پا کر خوش رہ سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ احتل جب کبھی چوہدری نگر کے بڑے سارے گھر کی بیٹی بن کر آیا کرے گی، مہر تاب کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا کرے گی۔

"شکریہ تمہارا مہر۔" اس نے مسکرا کر ٹائپ کیا اور پیغام بھیج کر گہری سانس لی۔ اب وہ کافی پرسکون تھا۔ وہ مہر تاب کے ساتھ ایک اچھی زندگی شروع کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔

وہ احتل سے محبت کرتا تھا لیکن اس کو زندہ اپنے سامنے دیکھ کر بھی ایک لمحے کے لیے نہیں سوچا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ جب وہ اسے دیکھتے ہی اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو تمہارا نمبر ہی یاد ہے اسود۔ مجھے تو تمہیں کال کرنے کی عادت ہی ہے اسود۔ جب ان لوگوں نے مجھے چھوڑا تو کسی سے ایک کال کے لیے فون مانگتے ہوئے مجھے پتا تھا کہ مجھے تمہیں ہی کال کرنی ہے۔"

اس اہمیت پہ بھی اس نے کوئی خوش فہمی نہیں پالی۔ اس کے سر کو ہلکے سے تھپکتے ہوئے، اسے پرسکون کرتے ہوئے یہ ادراک تھا کہ وہ عبدالہادی کی امانت ہے۔ وہ عبدالہادی جو اس کے لیے عام سا انسان تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ وہ تو بہت ہی خاص ہے۔ بہت ہی پیارا ہے۔ احتل کو ڈیزرو کرتا ہے۔

اس نے تسلیم کیا تھا اور کھلے دل سے کیا تھا۔ ہاں اور اس کی خواہش پوری نہیں ہوسکی تو کیا۔ اس کے لیے یہ خوشی کافی تھی کہ احتل زندہ ہے۔ ان سب کے بیچ ہے۔

☆☆☆

اس کے بیڈروم تک جاتی راہداری پھولوں سے سجی تھی۔ ضامن مصطفیٰ کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر آتی خولہ مسکرا دی۔ آج وہ اسپتال سے آنے کے بعد پہلی بار اپنے بیڈروم جا رہی تھی۔

"مرحبا۔" ضامن نے مسکراتے ہوئے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور ویلکم کرتے ہوئے اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ہلکا سا ہنسی۔

سکون ضامن مصطفیٰ کے اندر تک اترا۔

خولہ کو لگا، وہ بہت عرصے بعد اپنے کمرے میں آئی ہے۔ نیچے ضامن، مرک، غلام نبی اور اس کی بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے، مگر سکون اپنے بیڈروم میں آکر ہی ملا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے

چاروں طرف دیکھا اور سامنے کی دیوار پہ نظر پڑتے ہی جھٹکا سا لگا۔

"یہ...... یہ......" خولہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"میری مسز ہیں یہ۔" ضامن نے مسکرا کر کہا۔

"ضامن!" خولہ نے منہ بسورا۔ "یہ بھی تصویر ہے کوئی لگانے والی۔ پلیز ہٹائیں اسے یہاں سے۔"

"یہ تو نہیں ہٹ سکتی۔"

"ملین ڈالر تصویر ہے ناں یہ جو ہٹ نہیں سکتی۔ میرے بال دیکھیں۔ مریضوں والے کپڑے دیکھیں منہ بھی دھلا ہوا نہیں۔" وہ بالکل خوش نہ تھی۔

وہ اسپتال کی تصویر تھی جس میں وہ بے ساختہ ہنس رہی تھی۔

ہر طرف مہندی کی رات کی تصویریں۔۔۔اور ان کے بیچ یہ اسپتال کے بیڈ پہ مریضوں والے حلیے والی تصویر۔

"ملین ڈالر سے کہیں زیادہ۔ اس کی قیمت صرف ضامن مصطفیٰ جانتا ہے مسز۔"

ان کے لیے یہ تصویر واقعی بہت قیمتی تھی، انمول تھی۔ کیونکہ وہ ہنس رہی تھی۔ مہندی کی رات کے بعد وہ پہلی بار ہنس رہی تھی، ان کے ساتھ پہ خوش تھی۔

"آپ بھی ناں ضامن!" وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"کیا ضامن! جملہ پورا کرو ناں۔"

"میں دیکھوں۔ رنگون کریپر کہاں تک پہنچی؟" وہ شرارت سے ہنستی ہوئی مڑنے لگی۔ ضامن نے اس کا ہاتھ تھام کر قریب کیا۔

"رنگ بدلنے والے لوگ پسند نہیں۔ رنگ بدلنے والے پھول پسند ہیں۔"

"رنگ بدلنے والے لوگ بھی پسند ہیں۔ شرط یہ ہے کہ رنگ محبت کے ہوں، خلوص کے ہوں۔" خولہ نے ان کے چہرے کو دوسرے ہاتھ سے چھوا۔ پھر ایڑی اٹھا کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

سرور سا ضامن مصطفیٰ کے اندر اترا۔ بہت سے لمحے اس کیف کو محسوس کرتے گزرے۔ انہوں نے ان لمحوں کے امر ہو جانے کی خواہش کی۔ تب ہی خولہ کا فون بجا۔

"آہ...... کبھی مُرک، کبھی سسر جی......" وہ اسکرین پہ نظر ڈالتے ہوئے کراہے۔ خولہ نے ہنستے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ثروت چاہتی ہے کہ عبدالہادی کی بارات ہم لے کر جائیں۔ اور زید کو بڑا اعتراض ہے اس پہ۔ کہتا ہے کہ اس کی شادی کا تو نہیں سوچا بھی ہم نے۔"

خولہ ہنس دی اور اسپیکر آن کرتے ہوئے ضامن کو ماما کی خواہش کے بارے میں بتایا۔

عبدالہادی اسی ہفتے اس گھر میں شفٹ ہو گیا تھا، جو اس نے کرائے پہ لیا تھا۔ ثروت کو اس سے اتنی انسیت ہو گئی تھی کہ اس کی شادی کرنا اپنی ذمہ داری سمجھ لی تھی۔

"صحیح ہے بھئی۔ ہماری زندگی کو اوپر نیچے الٹانے پلٹانے کے بعد اب دولہا بننے جا رہا ہے۔ وکیل بھی ہم۔ باراتی بھی ہم۔"

سب ہنس دیے۔ پروگرام طے کرنے کے بعد کال ختم ہوئی تو ضامن پھر حیرت کا اظہار کرنے لگے۔

"سمجھ میں نہیں آیا کہ اصل کہاں تھی اب تک، اور قید میں تھی تو اسے چھوڑ کیوں دیا گیا؟"

"میں سمجھ گئی ہوں شاید۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ اور اس چیز کے بارے میں ضامن کو بتانے لگی جو مشوری پیلس میں لاجونتی کے کمرے میں دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

☆☆☆

"مومنہ! تم نے جو کمیٹی ڈالی تھی، اس میں سے میرا حصہ کتنا ہے؟"

"ہمایوں...... بتا چکی ہوں میں۔ وہ کمیٹی میں نے اپنے گھر کے لیے ڈالی ہے۔" وہ چلائی۔

"گھر تو میں بناؤں گا ناں۔"

"تم پہ رہی تو بن چکا گھر۔ اور ہو گئی ہماری شادی۔"

"بھئی اصل کی ہو رہی ہے شادی، اس کے بعد

اسود کی ہو رہی ہے شادی۔ تو ہماری بھی ہو ہی جائے گی ناں۔"

امتل آم کی گٹھلی کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ہنسی۔

"مومنہ...... میں تو سوچا کرتی تھی کہ تمہاری کیپٹن عامر کے ساتھ شادی ہو چکی ہوگی۔"

"تم جیسی۔ تم جیسی ہی ہوتی ہیں عورتیں جو ہنستے کھیلتے جوڑوں کے بیچ فساد کرواتی ہیں۔" ہمایوں نے اس کے آگے سے آم کی پلیٹ ہٹائی۔

"عورت کس کو کہا؟" وہ پلیٹ جھپٹتے ہوئے چلائی۔

"امتل باجی! میں نے آپ کا بدلہ لے لیا۔" بابر نے سامنے آکر اسٹائل میں گھوم کر کہا۔

"اوئے...... میری منگنی کا سوٹ۔" ہمایوں اسے پکڑنے کو آگے آیا۔

"دیکھیں۔ میں بھائی جتنا لمبا ہو گیا ہوں۔" اس کے قد سے قد ملا کر اس نے اترا کر بتایا تو ہمایوں کو اس پہ پیار آیا۔ بہت عرصہ بعد بابر کھل کر ہنس رہا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد جو چڑچڑا پن اس کے اندر آ گیا تھا، امتل کو دیکھ کر وہ غائب سا ہو گیا تھا۔

اور سچ پوچھو تو گھر کے ہر فرد کو لگ رہا تھا، رحیمہ احمد کے جانے کے بعد پہلی دفعہ زندگی پھر سے رنگ بھری ہوئی ہے۔ گھر میں رونق سی اتر آئی تھی کل شام سے۔

"آ جا اکٹھے چائے پیتے ہیں۔" مومنہ نے چارپائی پہ چڑھ کر دوسری طرف مہرتاب کو مخاطب کیا۔

"وہ اسود......"

"چل اب شرمانے کی ضرورت نہیں، میرے بھائی نے کون سی تجھے نظر لگا دینی ہے۔"

"چل جلدی آ......" کہہ کر اس نے رخ موڑا تو بابر پہ نظر پڑی۔ وہ چلائی۔

"تمہارا کون سا نکاح ہو رہا ہے، جو میرے

منیجر کا اکلوتا صاف شفاف کرتا ہیں پہن کر گھوم رہے ہو۔"

"میری پارٹی ہے پرسوں۔ چیک کر رہا ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اچھا لگ رہا ہوں؟" اسی سے سوال کیا۔

"چاچی...... بابر کو سمجھالیں......اوہ ہو۔ ابھی تو لوگ کمرے میں بیٹھ کر کوئی ضروری کام کر رہے تھے۔" پڑوس سے کسی کے آنے کا اشارہ ملا تو باہر نکل آئے۔" بابر کی شکایت لگاتے لگاتے اسود پہ نظر پڑی تو اسے چھیڑنے لگی۔

"کام کر کر کے تھک گیا ہوں۔ چائے مجھے بھی پینی ہے۔" اسود نے مسکراتے ہوئے کہا اور امتل کے سامنے والی کرسی پہ آ بیٹھا۔

امتل نے اسے دیکھا۔ وہ مطمئن نظر آ رہا تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کل شام کا بس کا منظر نگاہ میں آ ٹھہرا۔ جب وہ اس کے ساتھ چوہدری نگر آ رہی تھی۔

"تم اس دن عبدالہادی کے پاس مجھے چھوڑ کر چپ چاپ واپس چلے گئے اسود؟" ماتلی کے پکوڑے کھاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"کیونکہ تم دونوں کے درمیان میری ضرورت نہیں تھی۔" جوس کے ڈبے میں اسٹرا لگا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"اسود......" اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ کہیں کوئی گلٹ تھا اس کے اندر۔ اس حادثے سے پہلے اس کی اور اسود کی شادی ہونے والی تھی۔ اور اب عبدالہادی کے علاوہ کسی اور کو سوچ نہیں سکتی تھی۔

"عزیزی امتل۔ ماں کی خواہش اور میری چاہ سے آگے نظر آئی مجھے عبدالہادی کی محبت۔ اور...... تمہاری بھی۔" وہ چپ سی رہ گئی۔

"تم پاگل ہو...... پہلے بتا دیتیں۔"

"بتایا تھا ہمایوں کو۔" وہ مجرمانہ سے انداز میں بولی تھی۔

"ہمایوں بھی کمینہ ہے۔ مجھے نہیں بتایا۔ خیر تب بتا بھی دیتا تو شاید میرے لیے اس حقیقت کو

تسلیم کرنا مشکل ہوتا۔ وہ میرے اپنے دل ودماغ میں بنی ہوئی ایک لو اسٹوری تھی، جس میں تم قلعے میں قید ایک شہزادی تھیں اور میں اس قید سے تمہیں آزاد کروانے والا ایک شہزادہ۔ جس کہانی میں کوئی تیسرا تھا بھی تو وہ ایک ظالم دیو تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب کہانی بدل گئی ہے۔ مزید کردار شامل ہو گئے ہیں۔"

"مثلاً؟" اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مثلاً...... شہزادی مہر۔" وہ ہنسا۔

وہ بھی ایک بڑے بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے ہنس دی تھی۔

"آجا...... بیٹھ جا...... پہلے تو تُو کبھی میرے بھائی کے سامنے آتی نہیں ناں۔" مومنہ کی آواز پہ وہ چونک کر بس کے منظر سے باہر نکلی۔

مومنہ کھینچ کر مہرتاب کو لا رہی تھی اور وہ شرمائی لجائی سی لگ رہی تھی۔ یہ اس مہرتاب سے مختلف تھی جو اس نے پچھلی بار چوہدری نگر میں دیکھی تھی۔ کل شام اس سے بہت اچھے سے ملی تھی۔ ملی تو فردوس پھوپھو بھی خوش دلی کے ساتھ تھیں۔ لیکن گلے لگاتے ہوئے کہنا نہیں بھولی تھیں۔

"جب سے پیدا ہوئی ہو، کبھی کھو جاتی ہو، کبھی مر جاتی ہو، کبھی زندہ ہو جاتی ہو، تیری سمجھ نہیں آئی۔"

وہ ہنس دی تھی۔

"مہر! پھوپھو فردوس کو بھی لے آتیں۔ میرے یار کو اپنی ساس کی بڑی یاد آرہی تھی۔" ہمایوں کو سکون کب تھا بھلا۔ اسود اسے گھور کر رہ گیا۔ پہلے وہ ہمایوں کے ساتھ مل کر یاسر کو تنگ کرتے تھے، اب یہ دونوں اس کو ستاتے تھے۔

"اچھے لگ رہے ہو دونوں ساتھ۔" امتل نے کھلے دل سے تعریف کی۔ اسود نے ہنس کر شکریہ ادا کیا۔ مہرتاب کو اس کی ہنسی اندر تک شاد کر گئی۔ بڑے اچھے ماحول میں چائے پی گئی۔ پھر اسود اوطاق پہ چکر لگانے کا کہہ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ ہمایوں اس کے پیچھے آیا تھا۔

"تو لے لیا امتحان؟" اس کے کندھے پہ بازو رکھتے ہوئے پوچھا

"کس کا؟"

"مہر کا اور اپنا کہ امتل کی موجودگی میں تم دونوں اکٹھے کیسا فیل کرتے ہو۔"

اسود اسے دیکھ کر رہ گیا۔ لاپرواہ نظر آنے والا ہمایوں، واقعی اسے سمجھتا تھا۔

"مہر کا تو پہلے لے چکا تھا۔ اب اپنا امتحان لے رہا تھا ہمایوں۔ کہ امتل کی موجودگی میں، میں مہر کے ساتھ کیسا محسوس کرتا ہوں۔"

"پھر؟"

"میں کمفرٹیبل ہوں۔ لگتا ہے اچھی گزر جائے گی۔"

"ان شاء اللہ۔ اور اطہر؟ معاف کر دے یار اسے۔ وہ نادم ہے۔"

"ہاں...... یار...... اس کی غلطی بھولنے کی کوشش تو کرتا ہوں۔ بس سامنے آتا ہے تو اچھا نہیں لگتا وہ۔"

"دیکھ تیرا سالا ہے۔"

"بکواس بند کر۔"

اس کے کندھے پہ بازو رکھے ہمایوں بولتا گیا اور ان کے قدم اوطاق کی طرف بڑھتے گئے۔

☆☆☆

فاطمہ جو اچانک سے بیٹی کے ساتھ آگئی تو خوشی کی ایک لہر سب میں دوڑ گئی۔ رباب ان سب کے ورغلانے پہ شوہر کو چھوڑ کر ساتھ ہی آگئی تھی۔ بچوں کو کبھی نانی کبھی دادی اور کبھی گل چہرہ کے سپرد کر کے پڑی رہتی فاطمہ کے ساتھ پلنگ پہ۔ شاہانہ حدیقہ بھی آگئی تھیں۔ سلیمانہ آ نہیں سکتی تھی، اس لیے فاطمہ والے رونے دھونے کے ڈرامے اب اس نے لگا رکھے تھے۔ مہرتاب آتی تو اس رونق میں شامل ہونے کے لیے تھی مگر چھپ چھپ کر

اسود کو دیکھتی رہتی۔ چوری پکڑے جانے پہ جھینپ جاتی۔

انجمن ایک کام کرنے کے بعد پرات لے کر ٹپے گانے بیٹھ جاتی۔ ساتھ بچے بڑے بھی شروع ہو جاتے۔

"تامی! تابو کو مشورہ کیوں نہیں دیا۔ اجتماعی شادی ہو جاتی۔ چھ فرض ساتھ ادا ہو جاتے۔ خرچہ بھی کم ہوتا۔" ہمایوں آتے جاتے مشورے دیتا۔

"فاطمہ! پتا نہیں پھر تم آسکو کہ نہیں۔ کہو بزرگوں سے کہ تمہارے ہوتے ہوتے ہمارے ہاتھ پیلے کردیں۔" وہ فاطمہ کو جذباتی کرنے کی کوشش کرتا پھر گل چہرہ کی پونی کھینچتا۔

"گل تم بتاتی کیوں نہیں ہوابو کو کہ تین مہینے بعد تمہارا بورڈ کا ایگزام ہے۔ تم توجہ سے پڑھ نہیں سکتیں اگر گھر میں شادی ہوئی۔ ابھی کر دیں تمہارے بھائی کی شادی۔"

پھر اسود کے پیچھے پڑ جاتا۔

"پھوپھا صادق ملیریا سے تو بچ گئے۔ اب چھینکیں لگ گئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا بے چارے سروائیو کر پائیں۔ بولو۔ بیٹی کا فرض ادا کردیں جیتے جی۔"

اس کی دہائیاں سن سب رہے تھے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ اس کی اور اسود کی شادی فصل اترنے پہ قرار پائی تھی۔

"یار...... بندے کو زمین دار بھی نہیں ہونا چاہیے۔" زندگی میں پہلی بار اپنے زمین دار ہونے پہ اعتراض ہوا تھا اسے۔ مومنہ ہنس کر چڑانے لگی تھی۔

"بنو...... بنو زمین دار۔"

"مومنہ تمہاری کمیٹی کب نکلے گی؟" اسے آخری امید نظر آتی تو مومنہ کے پیچھے پڑ جاتا۔

"اس کمیٹی سے میری داج (جہیز) کی رضائیاں بنیں گی۔ رفعت پابی نے کیا ہے وعدہ۔" انجمن بیچ میں کہیں سے ٹپک پڑتی۔

"امی! میری ٹیبی پہ کس کس کی نظر ہے۔" وہ چلاتی۔

"امی! کس دن رکھ دیا اثنل باجی کا نکاح۔ میرا میچ ہے۔" بابر کے اپنے مسئلے تھے۔

چوہدری نگر کے اس بڑے سے گھر میں چہکار مچ گئی تھی۔ یہ وہ گھر وہ ماحول تھا، جس کے لیے وہ ترستی تھی۔

سب کچھ تھا۔ ماں نہیں تھیں، بابا نہیں تھے۔ اسے گوری بھی یاد آتی تھی۔

وہ ایک دم سے بہت اداس ہو جاتی۔ کبھی رو پڑتی۔ پھر لڑکیاں اور ہمایوں اس کو اس اداسی سے باہر نکالتے۔

چوہدری صاب اور دونوں بھائی اس کی شادی کے لیے اسی طرح انتظامات کروا رہے تھے جیسے ان کے پائی صاب اور پابی حیات ہوتے، تو کرتے۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔

"تمہاری ممی، بھابی اور کتنے لوگ ہوں گے اثنل۔ چوہدری صاب پوچھ رہے تھے۔ کہہ کر گئے ہیں کہ ان کے رہنے کا بہترین انتظام ہونا چاہیے۔ کہو تو اسود شہر میں ہوٹل میں کمرے بک کروا دے؟" مہندی کی شام رفعت جہاں پوچھ رہی تھیں۔

"صرف ممی ہوں گی۔ بھابی ان کو چھوڑ کر واپس چلی جائیں گی۔ ممی میرے ساتھ اسی، ماں کے کمرے میں رہیں گی۔ آپ کو اعتراض تو نہیں تامی؟"

"نہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہوگا۔ بس یہ خیال تھا کہ یہاں نہ اے سی ہے، نہ ہی اٹیچڈ باتھ۔ بجلی بھی کبھی آتی ہے کبھی جاتی۔ خیر وہ تو ہمایوں نے جنریٹر کا انتظام کردیا ہے۔ باقی......"

"تامی! ممی اب ان آسائشوں سے بے نیاز ہوگئی ہیں۔" وہ دکھ سے بولی۔ اسے اپنی وہ ممی یاد آئیں، جو شدید گرمی میں ایک بکری کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ اور کبھی جگدیش کو ڈھونڈنے گلیوں میں

نکل جاتی تھیں۔

یاد تو اسے اپنا بھاؤ بھی آتا تھا۔

"اتنی بری لگتی تھی میں آپ کو؟" جب جیل اس سے ملنے گئی تو پوچھا تھا۔ جگدیش مہیشوری چپ رہا تھا۔ جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ بہت کمزور ہو گیا تھا۔

"چوہدری نگر میں ہو رہی ہے میری شادی۔ فرض تو آپ کا تھا کہ مجھے رخصت کرتے۔ لیکن پہلے گھر سے بھاگنا پڑا، اور اب مہیشوری پیلس میں کوئی ہے نہیں جو دعاؤں کے سنگ مجھے رخصت کرے۔ ممی کو پہلے ایک بکری میں بیٹی نظر آتی تھی، اب بیٹی سامنے ہے تو بیٹا نظر آتا ہے ہر طرف گلیوں میں بازاروں میں اسے تلاش کرنے نکل پڑتی ہیں۔"

جگدیش نے یکدم سر اٹھایا تھا۔ آنکھ نم ہوئی تھی۔ سامنے کھڑی بہن دھندلی سی دکھائی دی تھی۔

"بھاؤ...... ہم اچھی اولاد نہیں ہیں۔ ممی ہمیشہ ہمیں تلاش ہی کرتی رہیں۔" وہ روتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگی۔

"میں ان کے سامنے ہوتا تھا، تب بھی ممی ڈیڈی کو کبھی نظر نہیں آتا تھا۔ انہیں صرف تمہاری تلاش تھی، تمہاری پرواہ تھی تم سے پیار تھا۔" وہ پیچھے سے چلایا تھا۔

امتل کے قدم رکے تھے۔

"تم ہماری زندگی سے جا کر واپس کیوں چلی آتی ہو؟"

"کیوں کہ زندگی اور موت پہ آپ کا اختیار نہیں۔" اس نے مڑ کر جواب دیا تھا۔

"مجھے ایک دفعہ باہر آنے دو۔ پھر دیکھنا میرے اختیار میں کیا ہے۔ سبق نہ سکھا دیا ایک ایک کو تو۔ میرا نام بھی۔" وہ پیچھے کہیں چلا رہا تھا، اور وہ بھاری قدموں کے ساتھ دور جا رہی تھی۔

"کیوں اتنی اداس بیٹھی ہے ہماری امتل؟" فاطمہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔

وہ کب کمرے میں آئی تھی، پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"ہائے...... کتنا سکون ہے ماں کے کمرے میں۔" وہ ان کے پلنگ پہ بیٹھ کر گہرا سانس بھر کر بولی تو امتل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ویسے امتل۔ تمہیں اس اسپتال سے کون نکال کر لے گیا تھا، تمہاری جان کس نے بچائی تھی۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" فاطمہ وہی سوال کر رہی تھی، جو کم و بیش ہر ایک نے کیا تھا اور جس کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس نے بہت سوچا تھا مگر جواب تھا کہ ملتا نہ تھا۔ اور پھر جواب ملا بھی تو کب۔ اسی شام۔

"نکاح تک رک جاتیں بھابی؟" لاجونتی گائتری دیوی کو چھوڑ کر واپس جانے لگی تو اس نے لاجونتی سے کہا تھا۔

"میری فلائٹ ہے آج رات۔ نہیں رک سکتی۔"

"واپس کب آئیں گی؟"

"پتا نہیں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ ممی کا بھی۔ اور اپنے ہیرو کا بھی۔" اس کا گال کے ساتھ گال ملا کر پیار کرتے ہوئے تاکید کی اور پھر آواز سرگوشی سی بن گئی۔

"سکینہ نے تمہیں سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس کے اکرم کے لیے دعا کرنا۔"

امت الاحد کے جسم کو جھٹکا لگا۔ لاجونتی نے اس سے الگ ہو کر ممی کے پیر چھوئے اور پھر ان کے بالوں پہ بوسہ دے کر سب کو ہاتھ ہلا کر نکل گئی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور امتل اس کے نگاہ سے اوجھل ہو جانے تک ہل نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

اس نے ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ مطمئن نہیں ہوئی تو بالوں میں انگلیاں چلا کر اس نے انہیں ٹھیک کیا۔ دوپٹہ اوڑھتے ہوئے خود کو دیکھ کر مسکرائی۔

اچھی لگ رہی تھی وہ۔ بہت عرصے بعد دل

پہ سے تیار ہوئی تھی۔ سرمئی رنگ کا کامدار جوڑا جس کی قمیص لمبی اور ٹراؤزر کے پائینچے کھلے تھے، اس پہ جچ بھی بہت رہا تھا۔

وردہ کی کال آئی تو دھیان خود سے ہٹا اور موبائل کان سے لگائے ٹیرس پہ آ گئی۔

رات روشن تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے موسم خوشگوار تھا۔

خولہ نے موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے سامنے کے منظر پہ نگاہ ڈالی۔ عباس اور بابا لان کے ایک گوشے میں باربی کیو میں مصروف تھے۔ عباس سلاخ میں بوٹیاں لگاتے ہوئے پتا نہیں بابا کو کون کون سی کہانیاں سنا رہا تھا۔ ماما، اقصیٰ، مُرک اور بابا سائیں کرسیوں پہ بیٹھے ماما کی باتیں سن رہے تھے یعنی کہ ان کی بیٹیوں کی تعریفیں سن رہے تھے۔ عابد رستم ماما کی وہیل چیئر تھامے ان سے کوئی بات کر رہا تھا۔ غلام نبی کولڈ ڈرنکس اور نان میز پہ سجا رہا تھا اس کی گھر والی ساتھ دے رہی تھی۔ اقصیٰ کے دونوں بچے لان میں دوڑ بھاگ رہے تھے عبدالہادی ابھی ابھی گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔

وردہ کی کال ختم ہو چکی تھی مگر وہ وہیں کھڑی ان سب کو دیکھتی رہی۔

منظر خوبصورت تھا۔ اور حسین تب ہوا جب تیمور کے ساتھ باتیں کرتے ضامن اب بابا کے پاس جا کھڑے ہوئے تھے۔

وہ مسکرا دی۔

دو مرد...... جو اس کی محبت تھے۔ وہ ایک ساتھ کھڑے تھے۔

بابا اور ماما پہلی بار اس کے گھر آئے تھے۔ وہ خوش تھی بہت خوش تھی۔ خوش ہونے کے لیے اب بہت سی وجوہات تھیں۔

موبائل وائبریٹ ہوا۔ وہ چونکی۔ اسکرین پہ نظر ڈالی۔ ضامن کا نام چمک رہا تھا۔

"پاس بھی آؤ گی یا بس دور دور سے دیکھ کر نظر لگاؤ گی۔"

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے ضامن کی طرف دیکھا۔ وہ بابا سے کوئی بات کرتے ہوئے دیکھ اسے ہی رہے تھے۔ وہ متبسم ہوتی ہوئی کمرے میں آئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کی نظر سامنے لگی اسپتال والی تصویر پہ پڑی تو ہنس دی۔

"ضامن بھی ناں......" آئینے میں خود پہ نظر ڈالتے ہوئے وہ ہنسی۔

موبائل پھر سے وائبریٹ ہوا۔

"آ رہی ہو یا میں آؤں؟"

وہ جلدی سے بیڈروم سے باہر نکلی۔ اور اپنے پیاروں کے بیچ جا بیٹھی۔

آسمان پہ کمان کی صورت ٹھہرے چاند نے اس منظر کو مسکرا کر دیکھا اور بادلوں کی اوٹ میں ہو گیا۔

"بھابی۔ آپ کے ہینڈسم کلائنٹ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ؟" مرک نے تکہ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے آہ بھری تو وہ ہنس دی اور عبدالہادی کی طرف آئی۔

"تو دولہا کی تیاری کہاں تک پہنچی؟"

"کل جا رہا ہوں اماں کو لینے کوٹھ۔" وہ جھینپ کر بتانے لگا۔

"عبدالہادی۔ تمہیں اور اجل کو ایک ساتھ دیکھنے کے لیے سب سے زیادہ ایکسائٹڈ میں ہوں شاید۔"

"آپ کو اور ضامن مصطفیٰ کو ساتھ دیکھ کر بھی اچھا لگتا ہے مجھے۔" عبدالہادی نے دل کی بات بتائی۔

خولہ مسکرا دی۔ اسی وقت اس کا فون وائبریٹ ہوا۔

"لاجونتی ائیر پورٹ پہ دیکھی گئی ہے۔"

احمد کا میسج پڑھ کر وہ مسکرا دی۔ پھر اس کی انگلیوں نے کچھ ٹائپ کیا۔ پیغام وہاں سے کچھ کلومیٹر دور جہاز کے ٹیک آف ہونے کا انتظار کرتی لاجونتی تک پہنچا۔

"اجل نے بتایا کہ قید میں فرمائش کرنے پہ

اس تک آب زم زم بھی پہنچ جاتا تھا۔"
لاجونتی زور سے ہنس دی۔
"یہ وکیل بھی ناں ...... مجھے پتا تھا۔ میرے کمرے میں پڑی یہ بوتل اسے تہہ تک پہنچائے گی ضرور۔"
"جاؤ ...... انجوائے کرو۔ واپس آؤ گی تو مہیشوریوں کے بیچے گئے اثاثوں کا احتساب ہوگا۔"
اگلا پیغام ملا۔
"آہ۔" لاجونتی کراہ کر رہ گئی۔ "جگدیش ٹھیک کہتا تھا۔ یہ وکیل جان نہیں چھوڑتی۔"

☆☆☆

ماہ کامل اپنی چاندنی اس چھوٹے سے آنگن پہ بکھیر رہا تھا۔ دونوں جانب دیوار کے ساتھ چھوٹے بڑے گملے رکھے تھے اور زیادہ تر گملوں میں موتیا کی سفید کلیاں چمک رہی تھیں، جن کی خوشبو سے سارا آنگن مہک رہا تھا۔
دائیں دیوار کے ساتھ ایک تخت رکھا تھا۔ تخت پوش سفید رنگ کا تھا۔ جس پہ مختلف رنگوں کے پھول کاڑھے گئے تھے۔ یہ تخت پوش اس پیٹی سے نکلا تھا جس میں ایک ماں نے اپنی بیٹی کے لیے بہت سی چیزیں بنا کر رکھی ہوئی تھیں۔
کمرے سے اناری رنگ کا لباس پہنے ایک لڑکی نکلی۔ اس کے سیاہ بال اس کی کمر پہ بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گنگناتے ہوئے ایک کلی توڑی۔ ایک ہاتھ پیچھے سے آیا۔ پہلے اس کے ہاتھ کو تھاما۔ پھر سرکتا ہوا انگلیوں تک آیا۔ اور اس کے ہاتھ سے وہ کلی لے لی۔ وہ مسکرائی۔ اب پیچھے کھڑا اس کا شوہر اس کے بالوں میں وہ کلی لگا رہا تھا۔
"میں احد سے ایسا گھر مانگا کرتی تھی۔"
"اور ......" اس کے شوہر نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ اس کے گیلے بالوں کی مہک کو اپنے اندر اتارا۔
"اور تمہارا ساتھ مانگا کرتی تھی۔"
"اور ......"
فضا میں سرگوشیاں بکھرتی رہیں۔ خوشبو گھلتی رہی۔ فضا نغمے سناتی رہی۔ ایک اعتل اور ایک عبدل کے دل کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوتی رہیں۔

☆☆☆

"تم کہانی کار ہو ناں؟" اس وجیہہ لڑکے نے پوچھا جو اکثر اس چھوٹی قبر پر موتیا کی کلیاں بکھیرنے آیا کرتا تھا۔ کبھی آنسو بہاتا، کبھی اس قبر کے خاک سے باتیں کرتا۔ آج اس کے ساتھ ایک مہندی لگے ہاتھوں والی دلہن سی دکھتی لڑکی بھی تھی۔
"بننا تو گیت کار چاہتا تھا صاحب! حالات نے گورکن بنا دیا۔ پھر یہاں کہانیاں ملنے لگیں تو کہانی کار بن گیا۔"
"ہماری کہانی جانتے ہو؟" آج پہلی بار وہ اتنی باتیں کر رہا تھا۔
"وہ جو قبر ہے ناں۔" حسین مرد نے اس قبر کی طرف اشارہ کیا جو گورکن کے لیے معمہ بنی رہتی تھی۔ "وہ اس کی تھی۔" اس نے ساتھ کھڑی اپنی دلہن کی طرف اشارہ کیا۔
گورکن کو جھٹکا لگا تھا۔
وہ خوب صورت جوڑا اپنی کہانی سنا کر قبرستان سے نکل گیا تو کہانی کار کا قلم چلنے لگا اور لفظ کاغذ پہ بکھرنے لگے۔
"وہ کویتا تھی۔ اس کا انتم سنسکار کر کے جل میں بہا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی مٹھی بھر راکھ ایک قبر میں دفن تھی۔ لوگ آتے اور اس کو اعتل کی قبر سمجھ کر اس کے لیے دعا مانگتے۔ اس کی مغفرت کی دعا۔ ایک صنم پرست کی ایسی کون سی نیکی تھی جو کسی بھی کارن سہی، پرائے مسلمانوں کے قبرستان میں لے آئی۔ ایسی کون سی نیکی تھی جو بخشش کی دعا بن رہی تھی۔ میں سناتا ہوں آپ کو کویتا کی کہانی۔ جو گاؤں میں آنے والے ہر پیاسے کو پانی پلایا کرتی تھی۔ ایک صبح اس نے دہلیز پہ ایک کوڑھی کو دیکھا جو"
کہانی کار کا قلم روانی کے ساتھ چلتا گیا۔ ایک اور کہانی صفحہ قرطاس پہ بکھرتی رہی۔

☆☆

سمیرا حمید

پردیس

اجالا گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی ایک شادی کی تقریب میں برطانیہ سے اس کے دور کے رشتے دار آتے ہیں۔ آنٹی اپنے بیٹے شہریار کے لیے اسے پسند کرلیتی ہیں۔ اس کا رشتہ مانگتی ہیں۔ گاؤں میں سب اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ اجالا بیاہ کر امریکا چلی جائے گی۔

شادی کے بعد امریکہ آکر اجالا پر انکشاف ہوتا ہے کہ شہریار پہلے بھی ایک شادی کرچکا تھا۔ گاؤں میں آنٹی کے کیے سارے دعوے جھوٹے تھے، امریکا میں وہ اور ان کے سارے بچے نوکری کرکے گزارا کرتے ہیں جبکہ اجالا کو نوکری کرکے نہ صرف اپنا بلکہ شہریار کا بوجھ بھی اٹھانا ہے۔ شہریار یکسر مختلف انسان ہے۔ جس میں اخلاقی برائیاں ہیں پر اب وہ بری طرح ان کے چنگل میں پھنس چکی تھی جس سے فرار مشکل تھی۔

ادھر گاؤں میں سب آنٹی کے دکھائے سہانے سپنوں کو سچ سمجھتے ہیں۔ شہریار اسے شراب کی فیکٹری میں ملازمت دلواتا ہے اور اس کے لیے اس کے خوب صورت لمبے بال کٹوا دیتا ہے۔ شراب کی فیکٹری میں اجالا کے لیے مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اسے جاب چھوڑنا پڑتی ہے۔

اجالا کی دونوں نندوں کا رویہ اس سے اچھا ہے آنٹی کے رویے کے باعث عینی ان سے دور جاب کرنے پر مجبور ہے۔ سارہ یونی ورسٹی میں عورتوں کی آزادی کے لیے بڑھ چڑھ کر بولتی ہے۔ اجالا ایک ڈاکٹر کے گھر میں الماس کے ساتھ کام کرتی ہے جس کی دوسری کم عمر بیوی روشن پر اس کی ساس نندیں تشدد کرتی رہتی ہیں۔ اجالا روشن کو اس چنگل سے نکالنے کے لیے سارہ کی مدد لیتی ہے تاکہ روشن پاکستان اپنی بیمار ماں کے پاس لوٹ جائے وہ کامیاب ہوجاتی ہے اس سلسلے میں پاکستانی قونصل خانہ ان کی مدد کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کو سخت سزا ملنے کا امکان ہے لیکن وہ حیلے بہانے کرکے روشن سے ملتے ہیں اور اسے بہلا پھسلا کر قائل کرلیتے ہیں عدالتی کارروائیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

ساتویں قسط

اس تصویر کو لینے والی، کھڑکی سے باہر کود کر دیوار کی اوٹ میں چھپ کر اپنی سانسیں درست کر رہی ہے۔ اس کا سینہ پھٹ جانے کو ہے۔ چہرہ جیسے آگ میں جھلس رہا تھا۔

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ٹھیک اسی لمحے اس پر آشکار ہوا کہ ماں کا ہاتھ سینے کی طرف کیوں اٹھتا ہے۔ درد کی ایک تیز لہر تھی جو اس کے دل سے نکلی تھی۔ ہر شے اس کے آگے گھوم کر رہ گئی۔ اس نے سر کو دیوار کے ساتھ ٹکا لیا۔ گہرے سانس اندر اتارنے لگی۔ اس کے پورے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ دیوار کا سہارا لیے لیے گھسٹتے ہوئے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ خشک پتے اس کے پیروں تلے چرمرا گئے۔

یہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

مکمل ناول



رخصتی سے پہلے اچانک لڑکی کو ایسا احساس آلیتا ہے کہ وہ پلٹ کر اپنے گھر کی چوکھٹ تھام لیتی ہے۔ ساری شادی کی تیاری وہ بڑی خوشی خوشی کرتی ہے، لیکن جب عین رخصتی کا لمحہ آتا ہے تو اس کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہوگا۔

یہ گھر اب پرایا ہو جائے گا۔ یہ حقیقت جب سر پر آکر کھڑی ہوتی ہے تو وہ ایک آخری کوشش میں گھر کی دہلیز کی طرف لپکتی ہے، چوکھٹ سے لپٹ جاتی ہے۔ باپ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ ماں کے سینے سے جا لگتی ہے کہ مجھے یہیں اپنے پاس رکھ لو...... رخصت ہونے کے اس تردد سے بچالو......

وہ گھر کے کونے سے لگ کر، گھر کی چوکھٹ تھامے بیٹھی تھی۔

رخصتی خوشی خوشی آسان نہیں تھی تو کھڑکی سے کود کر کیسے آسان ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ گال تر ہو گئے۔ سینے میں سانس گھٹنے لگا۔

ماں سے نہیں لیکن ماں کے اس گھر سے لپٹ چکی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے خود کو ہوش دلانا چاہا۔ آستین سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ وہ جذباتی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اپنا سانس درست کیا۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ پتے پھر سے بڑی شدت سے چرمرائے تھے۔ تیزی سے وہ دیواروں کے سائے میں چھپتی، یارڈ سے نکل کر درختوں کی اوٹ میں ہو کر کھسکنے لگی۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اسے خود کو بڑی ہمت سے گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔ وہ زمین پر نہیں چل رہی تھی، وہ گہری کھائیوں میں گرتی پڑتی رینگ رہی تھی۔

کہیں نہ کہیں وہ جانتی تھی کہ اس پر یہ وقت آئے گا۔ وہ اس مرحلے کو کئی بار ذہن میں فلم کی طرح چلا چکی تھی۔ لیکن اب جب وہ اس مقام سے گزر رہی تھی تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ بہت خوف ناک مرحلہ ہے۔ یہ تکلیف دہ راستہ ہے۔

گھر کو دروازے سے چھوڑا جائے تو پیچھے وہ کھلا ملتا ہے۔ گھر کو کھڑکی سے کود کر چھوڑا جائے، تو پیچھے ہر کھڑکی، دروازہ بند ملتا ہے۔

گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے زندگی بچانے کے لیے ہی کیوں نہ چھوڑا جائے۔ جان سے عزیز ہر شے کو قربان کر کے پھلانگنا پڑتا ہے۔

موت آسان ہے...... لیکن شاید زندگی نہیں......

قطار در قطار درختوں کے پیچھے سے گزرتے ہوئے، ایک کھڑکی سے اسے اپنے دونوں بھائی دکھائی دیے۔ ان کی بہن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس سے بے نیاز وہ اپنے کھیل میں مگن تھے۔ وہ ان کے منہ چومتی تھی، انہیں تنگ کرتی تھی، انہیں مارتی تھی، اور ان کی تصویریں بناتی تھی۔ وہ اس کے دل کا ایک حصہ تھے۔

اس کی ماں مہمانوں کی تواضع کر رہی تھی۔ یہ عورت اس پر کیا کچھ نہیں پڑھ کر پھونکتی رہتی تھی۔ اس ماں میں اس کی زندگی دھڑکتی تھی۔

باپ مہمانوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ساری عقل سلا کر، ہر نظریہ بھلا کر باپ سے محبت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس انسان کی جان توڑ محنت کا احترام کرتی تھی۔ اپنی موٹی سی فائل میں اس نے پاپا پر ایک تفصیلی تحریر لکھی تھی کہ کیسے ایک چھوٹے سے گاؤں کا انسان، اتنے بڑے ملک میں ایک اسٹور اور گھر کا مالک بن گیا تھا۔ اس نے اپنی ہڈیوں کا چورا کیا تھا تب کہیں جا کر اپنے گاؤں کا نصیب بدل پایا تھا۔

نصیب...... وہ اپنی بیٹی کے لیے بھی اپنی مرضی کا نصیب لکھنا چاہتا تھا۔

دور سے دکھائی دینے والا یہ منظر اس کے لیے گھر کا آخری منظر تھا۔ وہ جانتی تھی، جو قدم وہ اٹھا رہی ہے یہ قدم اس پر زمین تو کشادہ کر دے گا لیکن گھر کا راستہ تنگ کر دے گا۔ اسے گھر واپسی کی اجازت نہیں ملے گی۔ وہ دوبارہ یہ دہلیز پار نہیں کر سکے گی۔ سائبان تیاگ دینا مشکل ہے۔ فیصلے کی

زندگی کی صلیب اپنے کندھے پر رکھ کر جینا بھی آسان نہیں۔ اس صلیب کو اٹھائے اٹھائے پھرنا مقدر ہوجاتا ہے۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اس نے بھاگ کر سڑک پار کی۔ وہ بری طرح سے ڈری ہوئی تھی۔ وہ بالغ تھی، بہادر تھی، لیکن اس وقت ہر چیز ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ کہہ دینا اور کر دکھانا، دو الگ چیزیں ہیں۔ اس کے پاس صرف ایک جذباتی سہارا تھا، ماں۔ وہ سہارا اس سے چھن چکا تھا۔ اس لمحے اس نے خود کو بے انتہا تنہا پایا۔ اس تنہائی میں اس کے سارے خواب دھندلا گئے۔ ہر چیز کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی۔

سڑک پار کر کے، دور درختوں کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے سوچا کہ اسے واپس گھر لوٹ جانا چاہیے۔ صرف چند منٹوں میں اس پر اتنا بوجھ آچکا تھا کہ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

ضروری سامان سے بھرا بیگ اس کی کمر توڑ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ماں جیسی زندگی جی لے گی۔ اپنی کتابیں جلا دے گی۔ کیمرہ پھینک دے گی۔ وہ جرنلسٹ نہیں بنے گی۔ وہ سر جھکا لے گی، اور ہمیشہ کے لیے خاموشی اپنا لے گی۔ غلامی کی زندگی جینا اتنا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ اسے بس اپنا دماغ سلانا ہوگا۔ وہ جس ماں کی بیٹی تھی، اس جیسا بننا کتنا مشکل ہوگا؟

ماں بیٹی نصیب کے ایک سے چوکھٹے میں جڑ جائیں گی۔ اس نے واپس گھر کی طرف قدم بڑھا دیے کہ وہ کھڑکی سے اندر کود جائے، اور سرخ جوڑا پہن لے۔ بس اتنی سی بات ہے اور زندگی واپس، زندگی ہوجائے گی۔ آزادی نہیں ہوگی، سختی ہو گی، سب کچھ تکلیف دہ ہوگا لیکن سب ٹھیک بھی ہو جائے گا۔

لڑکیاں سب ٹھیک کر لیتی ہیں......

وہ خود ٹھیک نہیں رہتیں لیکن خاندان جوڑ دیتی ہیں......

خود ٹوٹ جاتی ہیں...... روایتیں نہیں توڑتیں......

رات دن ذلیل ہوتی ہیں لیکن عزت کی پگڑیاں سر سے گرنے نہیں دیتیں۔

☆☆☆

وہ چار قدم گھر کی طرف بڑھی اور رک گئی۔ وہ شدید جذباتی بحران سے گزر رہی تھی۔ فیصلہ کرنے نہ کرنے کی حالت میں تھی۔ بے بسی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار رہی تھی۔ قریب سے ایک گاڑی زن سے گزری تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ خود کو جھنجھوڑا، اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر سے دور ہوتی چلی گئی۔

رات کا اندھیرا اس کے ارادے کی ڈگمگاہٹ کا گواہ تھا۔ بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی زندگی کی گھڑیاں گنیں۔ اسے خوف تھا کہ پیچھے سے آکر کوئی اس کی گردن دبوچ لے گا۔ اپنا سر وہ ہڈ میں چھپا چکی تھی۔ جس وقت اس نے اپنی فرینڈ کے گھر کی بیل دی، اس وقت بھی وہ اسی خوف میں تھی۔ گھنٹی کی آواز بڑی بھیانک لگی۔

"مشعل! تم...... اس وقت......"

فرینڈ کے چہرے پر چھائی حیرت دیکھ کر اس نے جانا کہ پناہ ڈھونڈتے پھرنا آسان نہیں ہوتا۔ صرف اپنے گھر کے دروازے پر دستک دینا آسان ہے۔ صرف اسی گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو کوئی سوال نہیں ہوتا کہ تم اس وقت...... پناہ کی بھیک ایسی بھیک ہے جو سوال سے پہلے ہی بے مول کر دیتی ہے۔ فوراً انسان کی حیثیت گر جاتی ہے۔ وہ آپ سے تم اور تم سے تو ہوجاتا ہے۔

وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس کی فرینڈ نے لپک کر اسے تھام لیا کہ وہ گر جانے کو تھی۔ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ گھر سے نکلی ہوئی لڑکی پھر کہاں کہاں گری، کتنا خوار ہوئی۔ اس پر کیسے آسمان گرا، زمین کتنی تنگ ہوئی۔ گھر لڑکیوں

ہیں۔
صرف ایک رات اپنی فرینڈ کے گھر گزارنے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ اس کی زندگی ٹھیک ہو جائے۔ وہ نئی دنیا میں بھی، لیکن پرانی دنیا کو ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی پرانی دنیا تباہ نہیں کر سکتی تھی۔ رات بھر وہ روتی سسکتی رہی تھی۔
"مشعل......" ماں نے سختی سے کہا۔ یہ ماں کا انداز نہیں تھا۔
"میری بات غور سے سنو...... دوبارہ کبھی گھر نہ آنا...... وعدہ کرو مجھ سے...... کبھی یہاں نہیں آؤ گی......"
ماں کے لہجے کی سختی نے اس کی ہڈیاں تک سرد کر دی تھیں۔
"آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔" وہ رو دینے کو ہو گئی۔
ماں کی طرف خاموشی چھا گئی۔
"ماما...... میرے ساتھ یہ نہ کریں...... پلیز ماما......"
"تم نے کہا تھا، تم اسٹیٹس چھوڑ دو گی...... چھوڑ دو...... ملک سے باہر جانا چاہتی ہو...... چلی جاؤ...... ہم سب تمہارے لیے مر چکے ہیں مشعل! تمہارا کوئی خاندان نہیں ہے۔"
"اور میری ماں......" اسے شدید تکلیف پہنچی تھی۔
"جو کہا ہے، وہ کرو......"
"آپ کی ان باتوں کا کیا مطلب ہے...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما......" اس کی لرزتی ہوئی التجا۔
"یہی تمہارے فیصلے کی قیمت ہے......"
ماں نے بڑے ضبط سے کہا۔ نمی میں اس عورت کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ غیر محسوس اس نے ہچکی لی۔
"آپ دونوں نے کبھی میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہر طرح سے سمجھانے کی

کے سائبان نہ ہیں تو زمین کا کوئی کونا سائبان نہیں بنتا۔
ساری عمر اسے کسی فرینڈ کے گھر میں سلیپ اوور کی اجازت نہیں ملی تھی۔ آج وہ ایک فرینڈ کے گھر میں، اس کے بستر میں، اس کے رات کے لباس میں تھی۔ کونے کی میز پر اس کا بیگ رکھا تھا۔ اس کی فرینڈ اس کے لیے گرما گرم کافی لائی تھی، جسے پینے کی کوشش میں وہ اپنے کپڑوں پر گرا چکی تھی۔ فرینڈ نے اسے پرسکون رہنے کے لیے کہا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"تم نے بہت اچھا کیا وہاں سے نکل آئیں...... اب سو جاؤ......" اس نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
"ماما کو تو کچھ نہیں ہوگا......" وہ اپنی فرینڈ سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔
"تم کہو تو میں پولیس کو فون کروں......"
"نہ...... نہیں...... سب ٹھیک ہے...... ایسا نہ کرنا پلیز......"
اتنی سی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی کمزور ہے۔ وہ خود کو ٹھیک سے نہیں جانتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت گر کر ٹوٹ جائے گی۔ فرینڈ کے کمرے میں وہ رات اس نے جاگ کر گزاری تھی۔ اس کا گھر سے نکل آنا، اس کی ماں پر بھاری رہا ہوگا۔ کٹہرے میں ماں کھڑی ہوئی ہوگی۔ ساری تکلیف وہ اٹھائے گی۔ وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھ جائے گی، لیکن ماں وہیں کی وہیں رہے گی۔ وہ باپ کے لیے مر چکی ہو گی۔ اور ماں اس کے پیچھے مر جائے گی۔ اس عورت کی تکلیف کو کبھی مرہم میسر نہیں آئے گا۔

☆☆☆

اگلے دن اس نے کالج سے ماں کو فون کیا تھا۔
"میری بات سنو مشعل! دوبارہ کبھی گھر واپس نہ آنا......" ماں کا لہجہ سخت تھا۔
"آپ پاپا کو سمجھانے کی کوشش کریں...... ہماری زندگیاں واپس ٹھیک ہو سکتی

کوشش کی لیکن۔"

"تمہاری بات سمجھنے کی ہماری حیثیت ہوتی تو یہ سب نہ ہو چکا ہوتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم بھی کچھ سمجھ نہیں سکیں۔ میں تین بچوں کی ماں ہوں...... اپنا آپ میں بہت پہلے ختم کر چکی تھی۔ میں تمہارے لیے زندہ بھی مشعل! اپنی ماں کو اور تکلیف نہ دینا، واپس کبھی گھر نہ آنا۔"

واپس کبھی گھر نہ آنا۔ ماں کی طرف سے ملے اس حکم نے مشعل کے دل کے ٹکڑے کر دیے۔ وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فون بوتھ کے قریب سے گزرنے والے اسٹوڈنٹس حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دور کھڑی اس کی فرینڈز اسے اس حالت میں دیکھ نہیں سکیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا۔ ماں خاموشی سے اس کا رونا سنتی رہیں۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" بے طرح روتے ہوئے اس نے ماں سے پوچھا۔

"میرے چاہنے نہ چاہنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا میری بیٹی! تم سمجھ دار ہوتیں تو پہلے اپنی ماں کی حیثیت سمجھتیں۔"

"آپ پاپا سے بات کریں...... میں ان کی بھی بیٹی ہوں...... باپ ہیں وہ میرے......"

خاموشی کا سرد لمحہ ٹھہر رہا۔

"اس سے پہلے ان کا تعلق ان لکیروں سے ہے جو ان کے بزرگ پتھروں پر کھینچ چکے ہیں۔ وہ ادھیڑ کر اپنی کھالیں تو بدل سکتے ہیں لیکن روایتیں نہیں......"

"میں نہیں مانتی یہ سب...... پاپا مان جائیں گے...... سمجھ جائیں گے۔"

ایسا لگا گل کے سینے میں درد کی تیز لہر اٹھی۔ وہ اپنی آہ دبا کر رہ گئی۔

"مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا...... اپنا خیال رکھو...... یہ جگہ چھوڑ دو۔"

"ماما! ایسے نہ کہیں پلیز...... مجھے اتنا تنہا نہ کریں......"

"کسی سے بھی شادی نہ کرنا...... کبھی بھی...... اپنی ماں پر یہ رحم ضرور کرنا۔" ماں نے فون بند کر دیا۔

یہی اس کے فیصلے کی قیمت تھی۔ وہ اس قیمت کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس کی تکلیف سے اب واقف ہوئی تھی۔ گھر چھوڑ دینا، شہر چھوڑ دینا، مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن خاندان چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ گوشت سے ہڈی جدا کرنا، جسم سے جان نکال لیتا ہے۔ خون جوش مارتا ہے۔ یہی خون آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔

اس نے اس نکاح سے جان چھڑانے کے لیے کھڑکی کا راستہ اپنایا تھا۔ اب ہر چیز سے اس کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ مرنے والے کا تعلق پیچھے والوں سے جڑا رہتا ہے۔ وہ اس کے نام سے ختم درود کرواتے ہیں، لوگوں کو جوڑ کر اس کی باتیں کرتے ہیں۔ گلے لگ کر روتے ہیں۔ لیکن ایسے گھر سے نکل جانے پر، پیچھے باتیں ہوتی ہیں، انگلیاں اٹھتی ہیں، چھپ کر رو دیا جاتا ہے۔ اور نئی سے نئی افواہ سر اٹھاتی ہے۔

☆☆☆

اس کے فرینڈز سرکل میں یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ اس نے کن حالات میں گھر چھوڑا ہے۔ وہ اسے پولیس سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں تاکہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن وہ اس حد تک نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ زبردستی کی اس شادی سے بچنا چاہتی تھی، بچ گئی۔ اسے مزید کوئی فساد نہیں چاہیے تھا۔ وہ اپنے خاندان کو پبلک کورٹ کے کٹہرے میں نہیں لانا چاہتی تھی۔

اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پرسکون زندگی پیچھے رہ گئی تھی۔ ہر شے انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے کلاسز لیتی رہی۔ اس نے اپنی فرینڈز کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں، کسی سے بھی کوئی بات نہ کریں۔ کالج میں کسی اور کو نہ بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جو بھی تھا وہ اپنے

ماں باپ سے محبت کرتی تھی۔ اپنے گھر کی عزت کا خیال رکھتی تھی۔ باپ سے لاکھ اختلافات سہی، لیکن ان کی قدر کرتی تھی۔

اس کی کئی فرینڈز نے اسے گھر میں رکھنے کی آفر کی تھی، لیکن وہ جس فرینڈ کے گھر رات رکی تھی، وہاں تین دن رک کر اپنے لیے رہائش کا انتظام کرلیا تھا۔ اس کے پاس سیونگ تھی۔ وہ تین لڑکیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرنے لگی تھی۔ وہ اس کی کالج فیلوز تھیں۔ وہ مشعل کو تو جانتی تھیں، لیکن یہ نہیں کہ اسی شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی وہ یہاں کیوں رہ رہی ہے۔ مشعل نے انہیں یہی بتایا تھا کہ اسے دیسی ماحول سے کچھ پرائیویسی چاہیے، وہ یکسوئی سے پڑھنا چاہتی ہے، جس کے لیے کچھ عرصہ گھر سے دور رہنا چاہتی ہے۔ اسے جاب تلاش کرنی تھی۔ وہ پیسوں کو سوچ سمجھ کر خرچ کر رہی تھی۔ اب وہ بات نہیں رہی تھی کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ بھی خرید لیا۔ وہ عیاشی ماں باپ کے سر پر کی تھی۔ عیاشیاں ساری ماں باپ کے سر پر ہی کی جاتی ہیں۔ اپنی فرینڈز میں وہ سب سے زیادہ کھلے ہاتھ کی تھی۔ لنچ ڈنر بڑے آرام سے کروا دیتی تھی۔

وہ ماں کی بات میں چھپے پیغام کو سمجھ چکی تھی۔ اسے شکاگو سے چلے جانا تھا۔ جو قدم اس نے اٹھالیا تھا، اس کے بعد اگلے سارے قدم اسے سوچ سمجھ کر اٹھانے تھے۔ ورنہ کوئی بھی قدم اسے کھائی میں اُتار سکتا تھا۔ اب اسے خود کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا تھا۔ ہر چیز پر نظر رکھنی تھی۔ اس کی پوری زندگی اس کے کندھوں پر آپڑی تھی۔

ایک ہفتے کے انتشار کے بعد اس کی زندگی معمول پر واپس آگئی۔ وہ صبح اٹھتی، اپنا کمرا صاف کرتی، اپنے لیے ناشتہ بناتی، تیار ہوتی اور کالج آجاتی۔ فرق یہ تھا کہ اب لپک کر پیچھے ماں نہیں آتی تھی۔ کھڑکی سے دیکھ کر ہاتھ نہیں ہلاتی تھی۔ وہ سر پر حجاب نہیں پہنتی تھی، زبردستی کا یہ تردد اس نے اُتار پھینکا تھا۔ کالج سے وہ اپنی جاب پر چلی جاتی۔ رات گئے تک کام کرتی۔ وہیں کچھ کھا لیتی تھی۔ گھر فون کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بیل ہوتی رہتی تھی کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ فون اُٹھ جاتا تھا تو سائیڈ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ایک بار اسے اپنے بھائی کی آواز سنائی دی۔

"ماما کو فون دو...... جلدی کرو......" اس نے عجلت میں کہا۔

"ماما بیمار ہیں...... سو رہی ہیں۔"

"فون ماما کے پاس لے جاؤ......"

فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ٹھک فون بند ہو گیا۔ شاید ماں پر پابندی تھی کہ وہ اس سے بات نہ کرے۔ یا ماں نے یہ پابندی خود پر لگالی تھی۔ ایک بار اسے محسوس ہوا کہ فون پاپا نے اٹھایا ہے۔ اس کے اندر تک خوف کی لہر اتر گئی۔ وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

اپنے فائدے میں اس نے گل کا نقصان کردیا تھا۔

اصل چکی میں وہ پس رہی تھی۔

☆☆☆

مشعل کے گھر سے جانے کے تیسرے دن وہ سب گھر گئی تھیں۔ انہیں وہاں جا کر صورت حال کا اندازہ ہوا تھا۔ گھر کی حالت گل کی حالت سے زیادہ پریشان کن تھی۔ ہر شے نے ویرانی سمیٹ لی تھی۔ سوگ اوڑھ لیا تھا۔ دونوں بیٹے اسکول میں تھے۔ مشعل کے پاپا اسٹور جا چکے تھے۔ گل اکیلی گھر میں تھیں۔ الماس کو دیکھتے ہی وہ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تین دنوں میں گل کا سارا خون نچڑ گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا پنجر لگنے لگی تھیں۔

اس دن وہ سب خاموشی سے کام کرتی رہیں۔ نیتو گردن موڑ موڑ کر روتی ہوئی گل کی طرف دیکھتی رہی۔ الماس نے تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کی لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ گل کو کچھ کھلانے کی کوشش بھی کارگر نہیں رہی۔

اجالا نے بڑی دردمندی سے بلکتی تڑپتی ماں کی

طرف دیکھا۔ ہر روح سکون پالے گی، ایک ماں کی روح در در بھٹکتی رہے گی۔ وہ اپنا سکون کہاں سے لائے گی۔ جگر کا ٹکڑا نظروں سے دور تھا۔

کچن کے سامنے مشعل راکنگ چیئر پر بیٹھی جھول رہی ہوتی تھی۔ وہ چیئر اب وہاں موجود نہیں تھی۔ اجالا نے اس کا کمرا صاف کیا۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ اس کی کتابیں، اس کا بستر، میز کرسی، میگزین، دیواروں پر لگے پوسٹرز، ہر چیز۔ لیکن انہیں استعمال کرنے والی جا چکی تھی۔

روتے ہوئے گل نے مختصراً تین دن کا احوال بتایا تھا۔ تین دن کی مشقت نے گل کی پیشانی پر گہری لکیریں کھینچ دی تھیں۔

"اس نے یہ انتہائی قدم اٹھانا تھا گل! تم لوگوں کو سمجھ داری سے کام لینا چاہیے تھا۔" الماس نے نرمی سے کہا تھا۔

"میرا کیا ہے...... ادھر سے بھی خالی ہاتھ رہتی ہوں اور ادھر سے بھی...... دو بچے گھر ہیں...... ایک بچی گھر سے باہر ہے...... بتاؤ کس جگر کے ٹکڑے کے پیچھے بھاگوں...... کس کے لیے کیا فیصلہ لوں...... ہاتھ میں کچھ نہیں ہے...... ہے کیا میرے پاس۔"

"آپ دونوں مشعل کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے......"

"میں سمجھ چکی تھی الماس...... میں بہت پہلے سمجھ چکی تھی لیکن میری سمجھ سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے صبر کرلیا، برداشت کرلیا، یہ اولاد نہیں کرسکتی۔ جس لڑکے کو اس کے ساتھ نکاح کے لیے بلایا ہے، وہ میرے دل پر نہیں چڑھا تو مشعل کے کیسے چڑھتا۔ گاؤں میں ایک بچے کا باپ ہے۔ دوسرے بچے کی پیدائش میں بیوی مر گئی۔ اس کی بیوی کی حالت ایسی تھی کہ کیس بڑے سرجن کو دیکھنا تھا۔ لڑکے نے انکار کر دیا۔ سارا کلینک عورت کی چیخوں سے گونجتا رہا۔ فرش اس کے خون سے بھر گیا تھا۔ وہ مر گئی۔ اسے وہ مری ہوئی بیوی منظور تھی لیکن سرجن سے اس کا علاج نہیں۔ یہ سب جان کر میں اپنے جگر کا ٹکڑا دیتی؟...... خاندان، برداری اور ان کے فیصلے...... مجھے بتاؤ میرے ہاتھ کہاں کھلے ہیں جو میں مشعل کو آزاد فیصلے کی رعایت دے دیتی...... تین دن سے اس کی صورت نہیں دیکھی الماس! مجھ جیسی مائیں مر کیوں نہیں جاتیں...... ہمیں بانجھ ہونا چاہیے...... ہمیں اولاد نہیں ملنی چاہیے...... مشعل کہتی ہے میں کمزور ماں ہوں...... بزدل ہوں...... وہ ٹھیک کہتی ہے...... پر میں کہاں سے بہادری لاؤں...... میں کس قیمت پر کس سے ہاتھ دھولوں...... ہر فیصلے پر میں خالی ہاتھ رہوں گی......"

ان میں سے کسی کے پاس تسلی کا کوئی لفظ نہیں تھا۔ ان کے گھر کے معاملے میں کیا بولتے۔ ان کی روایتوں میں کس روایت کو مثال کے طور پر پکڑ کر لاتے کہ مشعل واپس آجاتی۔

"اب تم کیا چاہتی ہو...... کیا کرنا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوسکتا...... ایسے ہی جینا ہے......"

"مشعل کے پاپا نے کیا کہا؟...... غصے میں ہیں؟"

☆☆☆

بیس پچیس منٹ بعد گل اس کے کمرے کی طرف آئی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔ انہوں نے دستک دی۔ دروازہ نہیں کھلا۔ پھر آواز دی، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر کی خاموشی ان کے دل سے آلپٹی۔ انہوں نے جھرجھری لی۔ ذرا زور ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ جس بات کا دھڑکا تھا، وہ کام ہو چکا ہے۔ انہوں نے مشعل کو پکارا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں آواز مردوں تک جائے۔ وہ ہاتھ سے دروازہ بجاتی رہیں۔ لیکن اندر کی خاموشی کسی شور میں نہیں بدلی۔ ان پر لرزہ طاری ہونے لگا تھا۔ انہونی کے سائے انہیں بھوت بنا رہے تھے۔ ہر چیز کو بھلا کر انہیں مشعل کی فکر ہونے لگی تھی۔ بیٹی جذباتی تھی۔ بیٹی کم عقل تھی۔ وہ رہ نہیں

پائیں اور زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارنے لگیں۔ مشعل کو پکارنے لگیں۔

"مشعل......دروازہ کھولو......اپنی ماں کے ساتھ یہ نہ کرنا......"

گھر میں جتنے لوگ تھے وہ ان کی آواز پر لپک کر بھاگے آئے۔ مشعل کے پاپا نے اپنی بیوی اور مشعل کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہوا......؟؟" سوال میں بڑی سختی تھی۔

"اس نے خود کو ختم کرلیا ہے......وہ مرچکی ہے......"

گل ہذیانی انداز میں چلانے لگیں۔

بختیار خان نے گل پر طیش بھری نظر ڈالی، اور جلدی سے بڑھ کر دروازے پر دھکا دیا۔ دوسرے زوردار دھکے میں دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں بیڈ پر جھلمل نکاح کا جوڑا رکھا تھا اور کھڑکی کھلی تھی۔ گل لپک کر واش روم تک گئیں۔ وہ خالی تھا۔ کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ گل نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ سمجھی تھیں کہ ان کی بیٹی نے اپنے ساتھ کچھ کرلیا ہے۔ وہ نقاہت سے بیڈ پر گر گئی۔ اب جو ہو سو ہو۔ ان کی بیٹی سلامت تھی۔ اس لمحے میں گل نے جانا کہ وہ ہر روایت، ہر قانون کا گلا گھونٹ سکتی ہیں، ایک اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنے کے لیے۔ مشعل کے انکل تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکے لیکن بختیار نے آواز دے کر روک لیا۔

"آپ سب لوگ کھانا کھا کر جائیں گے...... گل کھانا لگاؤ......"

بیٹی کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی گل نے کمرے میں کھڑے دراز قد، مضبوط جسامت کے مالک اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا کھانا لگاؤ۔ اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ آواز جو سرد تر تھی۔ وہ کہہ کر پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہر مرد پلٹ گیا۔

اور ہر طرف خاموشی پھیل گئی......بہت خاموشی......

اتنی کہ باہر سرسراتے پتوں کی آواز اندر تک سنائی دینے لگی۔

گھر میں تین خواتین اور سات مرد تھے۔ یہ مرد واپس جاکر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ مشعل کے دونوں بھائیوں کا کھیل رک گیا۔ وہ اس عجیب سی خاموشی سے پہلی بار واقف ہوئے تھے۔ وہ اس کے دباؤ سے دبک کر رہ گئے۔

وہ کبھی اپنے باپ اور کبھی چچا کی طرف دیکھتے تھے، جیسے پوچھنا چاہتے ہوں کہ گرم گھر میں اتنی سرد لہر کہاں سے آرہی ہے۔ یہ لہر جو ہڈیوں میں خون جما رہی ہے۔

تینوں خواتین خاموشی سے میز پر کھانا لگانے لگیں۔ گل کے ہاتھ لرزتے رہے، چیزیں گرتی رہیں۔ ان کی جیٹھانی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ انہوں نے سر ہلادیا جیسے اسی حکم کے انتظار میں تھیں اور کچن کاؤنٹر سے کرسی گھسیٹ کر اس پر گر گئیں۔ وہ پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

"خود کو سنبھالو گل......"

ان کی جیٹھانی نے ان کے سر کا دوپٹہ درست کرتے ہوئے ہمدردی سے کہا تھا۔ پانی کا گلاس ان کے آگے رکھا کہ پی لو۔ اس نے گلاس تھام لیا۔ پینے کی کوشش کی لیکن پانی چھلک گیا۔ اس کا لرزہ بڑھ چکا تھا۔

کھانا شروع ہوا۔ سب نے کھانا کھایا۔ اتنا ہی جتنا نکاح کے بعد کھایا جاتا۔ ان کے ہاتھ سے کھانے کے نوالے بھی گرتے رہے۔ بختیار نے انہیں ایک بار کڑی نظروں سے دیکھا تھا۔ دوبارہ ان کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں گری تھی۔ وہ نوالے بنا بنا کر منہ میں رکھتی رہیں۔ انہیں پانی کے ساتھ اندر اتارتی رہیں۔ دنیا کی ہر شے اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ آپس میں دست و گریباں تھی۔ وہ اس خاموش طوفان میں، مشعل کو ڈھونڈ کر، اس کا ہاتھ پکڑ کر، کہیں

دور لے جانے کی تڑپ میں تھیں۔

کھانے کے بعد قہوہ پیا گیا۔ قہوے کی چسکیوں کی سرسراہٹ بھی آتی رہی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی رہی۔ اس کی جیٹھانی کچن سمیٹ رہی تھیں۔ برتن ڈش واشر میں لگا رہی تھیں۔ چھوٹے دیور کی بیوی کی کلائی کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ وہ دردمندی سے ان کے قریب آئی۔

"گل بھابھی! کمرے میں جا کر لیٹ جائیں......"

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ کمر کو دیوار کے ساتھ ایسے جوڑ لیا جیسے دیوار کے اندر پیوست ہو جانا چاہتی ہوں۔۔ اسے اپنے گاؤں کی کچھ لڑکیاں یاد آ رہی تھیں۔ گاؤں میں اڑی افواہوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ دل و دماغ سنسنا رہے تھے۔ ہر طرف شور تھا۔ اس کا دل تھا نشست گاہ میں جائیں، اور ان کے پیروں میں اپنی چادر بچھا دے۔ اپنے سینے سے ممتا نکال کر ان کے قدموں میں رکھ دے۔

"میری مشعل...... اسے کچھ نہ کہنا......"

ایک ایک کے پیروں میں اپنا سر رکھ کر کہے۔

☆☆☆

ممتا سے بھرا دل وہ الماس کے سامنے کھول کر بیٹھی تھیں۔ اجالا سے ٹھیک سے کام نہیں ہو سکا تھا۔ اسے لانڈری کیے کپڑے استری کرنے تھے۔ انہیں ان کی جگہ پر رکھنا تھا۔ لیکن کوئی کپڑا ٹھیک سے استری نہیں ہو سکا۔ وہ تہ نہیں لگا سکی۔ انہیں الماریوں میں نہیں رکھ سکی۔

ان پانچوں میں سے کسی ایک سے بھی کوئی کام مکمل نہ ہو سکا۔ یارڈ خشک پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مشعل کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی درختوں کے جھنڈ دیکھتی رہی۔ خوابوں سے بھرا کمرا خالی تھا۔ اندر خزاں تھی اور باہر بھی۔ ہر شے سرد تھی۔

"وقت بدل چکا ہے...... کوشش تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ ہم بھی بدل جاتے لیکن اب دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ مشعل سے فون پر بات کر لیا کرو۔"

"اس کا فون آتا ہے، میں اٹھاتی نہیں...... مجھے ڈر لگتا ہے الماس!"

"کیسا ڈر......"

"اس کے پاپا...... یہ سب لوگ...... یہ بہت سخت ہیں الماس!" اس نے شدت سے الماس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

الماس نے ہنس کر ٹشو سے گل کے گال صاف کیے۔

"اب تم وہم کر رہی ہو...... یہ امریکا ہے...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"امریکا اور اس کے قانون کو یہ کیا سمجھتے ہیں...... اپنی زمین کے قانون کی عبادت کرتے ہیں۔" تلخی سے کہا۔

"بہتر ہے تم مشعل سے جا کر مل آؤ...... اسے کچھ سمجھ دو...... خاندان کے کسی اور بڑے سے بات کرو کہ اس معاملے کو دیکھیں۔"

"ہمارے حق میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے الماس!"

"روایتوں کے اتنے ہی پکے تھے تو واپس لوٹ جاتے، کیوں رہتے رہے ہو یہاں۔"

"یہاں کا کمایا پیسہ حلال ہے لیکن یہاں کی آزادی حرام ہے۔"

"میں بھی پرانے خیالات کی عورت ہوں لیکن وقت کے ساتھ بدلنا پڑا۔ یہاں رہنے کا فیصلہ میرا تھا، اس کی قیمت میں اپنی اولاد سے کیوں لوں۔ پہلے انہیں پر دیتے ہیں، پھر ان سے کہتے ہیں اپنے پر کاٹ لو۔ یہ تو ظلم ہوا......"

"مشعل بھی یہی کہتی تھی۔"

"اللہ اسے زندگی دے...... پریشان نہ ہو...... دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں! اب وہ اس گھر میں نہیں آ سکتی...... میں اسے نہیں آنے دوں گی...... تم اس سے مل سکتی ہو الماس؟" لجاجت سے کہا۔

الماس نے اجالا کی طرف دیکھا۔

''ہاں گل...... کیوں نہیں...... بیٹی ہے وہ میری......''

''اس سے ملو اور کہو کہ کبھی گھر نہ آئے...... یہاں سے چلی جائے...... جتنی جلدی ہو سکتا ہے، یہاں سے دُور ہو جائے۔''

گل کی آواز میں ایسا کچھ تھا کہ اجالا کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ وہ معاملہ نہیں تھا جو ان کے قریب کے گاؤں میں ہوا تھا کہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہاں کسی کے ساتھ نکل جانا، بھاگ جانا کہلاتا ہے۔ مشعل گھر چھوڑ کر گئی تھی، کسی کے ساتھ نہیں گئی تھی۔

وہ اپنی زندگی کی بہتری کے لیے نکلی تھی۔ یہاں اٹھارہ سال کا ہونے پر بچے خود مختار کر دیے جاتے ہیں۔ مرضی ہے ماں باپ کے ساتھ رہیں، مرضی ہے چلے جائیں۔ بالغ ہوتے ہی انہیں ان کی زندگی کا مکمل اختیار سونپ دیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی، حقیقت میں ان کی ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر فیصلہ ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔

اجالا پاکستان میں سنتی آئی تھی کہ گورے پتھر دل ہوتے ہیں، اٹھارہ سال کا ہوتے ہی بچوں کو نکال باہر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ بچوں کو پر دیتے ہیں اور اڑنے کی آزادی بھی۔ وہ انہیں اپنے ساتھ باندھ کر نہیں رکھتے۔ انہیں اپنے فیصلوں کی قید میں نہیں رکھتے۔ خاندانی روایتوں کا شکار نہیں بناتے۔ جذباتی دھمکیاں نہیں دیتے۔

سارہ کہتی ہے دیسی لوگوں کو اس بات پر بڑا فخر ہوتا ہے کہ اٹھارہ کیا، اٹھائیس سال کا ہونے پر بھی وہ بچوں کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دیسی لوگ ان بیڑیوں کو نہیں دیکھتے جو وہ اولاد کو غلاموں کی طرح پہنا کر رکھتے ہیں۔ سینے سے لگا کر رکھنے کی بھاری قیمت لیتے ہیں یہ دیسی ماں باپ۔ جہاں بچوں کی مرضی نہیں ہوتی وہاں شادی کر دیتے ہیں۔ ذات پات، برادری کی شرطیں لگاتے ہیں۔ انہیں سوچنے تک کی آزادی نہیں دیتے۔ یہ تو قربانی کے بکرے والی صورت حال ہے۔ کھلائیں گے، پلائیں گے، اچھی سے اچھی جگہ بڑھائیں گے، اور پھر قربان گاہ لے جا کر کھڑا کر دیں گے۔

دیسی لوگ عجیب چیزوں پر فخر کرتے ہیں۔

☆☆☆

وہ اور الماس مشعل سے ملنے آئی تھیں۔ صرف ماں ہی نہیں وہ بھی مرجھائی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے فیصلے کی اذیت جھیل رہی تھیں۔ الماس اس کی کچھ ضروری چیزیں لائی تھیں۔ گل نے بھیجی تھیں۔ پیسے بھی بھیجے تھے۔ چیزوں سے بھرا بیگ دیکھ کر مشعل کتنا اداس ہو گئی تھی۔ آنکھیں فوراً لبالب ہو گئیں۔

''ماما ٹھیک ہیں......''

''نہیں......'' الماس نے سچ بولنا مناسب سمجھا۔

مشعل نے تکلیف دہ سانس کھینچا۔ ''وہ اپنی میڈیسن لے رہی ہیں؟''

''مشعل! تم سمجھ دار بچی ہو...... معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرو۔ تمہاری ماں بہت تکلیف میں ہے۔''

مشعل نے بے بسی سے الماس کی دیکھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا...... بیس سال میں نے معاملہ سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ میں نے ہر وہ طریقہ آزما لیا جس سے ہم سب کی زندگیاں آسان ہو سکتیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے بہت تکلیف اٹھائی لیکن میں یہ شادی والی تکلیف نہیں اٹھا سکتی...... مجھ سے یہ نہیں ہو گا...... میں شاید خود کو ختم کر لوں......''

الماس اس بچی کی تکلیف سمجھ رہی تھی۔

''تم اپنے پاپا سے بات کرنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں...... الماس آپا! اس سے یہ مت کہیں......'' اجالا نے فوراً الماس کو ٹوک دیا۔

"تم اپنے پاپا سے نہ ملنا...... گل باجی نے سختی سے منع کیا ہے...... وہ کہہ رہی تھیں کہ تم کسی صورت گھر نہ آنا۔ کوئی ملنا چاہے تو انکار کر دینا...... وہ تمہارے لیے بہت ڈری ہوئی ہیں۔"

"وہ اس دن سے ڈری ہوئی ہیں جس دن میں پیدا ہوئی تھی۔"

"پھر اس مسئلے کو کیسے حل کرنا ہے؟" الماس نے بے چارگی سے پوچھا۔

مشعل تلخی سے ہنس کر رہ گئی۔ "اس مسئلے کو ہم عورتیں حل نہیں کر سکتیں۔"

دُور سامنے اس کی میز پر وہ رجسٹر کھلا پڑا تھا جسے وہ جرنلسٹ بننے کے لیے بنا رہی تھی۔ کیمرہ بھی قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ کچھ اخباروں کے تراشے تھے۔ کچھ کتابیں کھلی ہوئی تھیں۔ اجالا کا دل چاہا کہ وہ اس رجسٹر تک جائے اور اسے کھول کر دیکھے۔ دیکھے اور اس رات کی روداد جانے۔

جس رات وہ کھڑکی سے باہر کود گئی تھی۔ کیا اس نے کھڑکی سے کودنے سے پہلے بھی تصویر لی تھی؟ یا ماں کی کوئی تصویر بنائی تھی؟ نہ جانے کیوں لیکن اجالا کا دل چاہا کہ وہ مشعل سے پوچھے کہ اب بھی وہ پھولوں کی، بچوں کی، جھولوں کی تصویریں لے گی؟ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔

"تمہیں زندگی نے اتنا ڈرا دیا ہے...... بتاؤ یہ ڈر کیسے نکالو گی...... بتاؤ کیا اب بھی تم جاں باز جرنلسٹ بنو گی؟"

جاں باز جرنلسٹ نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ زندگی کی سچائی گھٹنوں کے بل گرا دیتی ہے۔ یہ زمین پر ناک سے لکیریں نکلواتی ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی تلخی کم نہیں کرتی۔ زندگی کی سچائی، موت کی کڑواہٹ سے زیادہ کڑوی ہو جاتی ہے۔ اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے شکاگو کی اونچی بلڈنگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ شہر جگمگ کر رہا تھا۔ خوابوں کی دنیا، رات میں بھی جاگ رہی تھی۔ یہ دنیا ستارہ ستارہ تھی۔ اور اس کے بالکل الٹ، خوابوں کی تعبیر کا جو کھم اٹھانے والی، بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

مشعل...... اس کی نیند کے خواب تک خوف ناک ہو چکے تھے۔

الماس نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک بار آ کر اس کا گھر صاف کر جایا کرے گی لیکن اس نے ہنس کر انکار کر دیا۔ جاتے ہوئے اجالا نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے اس کے ہاتھوں کو سرد پایا۔ وہ ایک چھوٹی سی بچی ہی تو تھی، جو زندگی جینا چاہتی تھی۔ اپنے مقاصد سچ کر دکھانا چاہتی تھی۔ وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھی جسے زندہ قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ انکار کر چکی تھی، لیکن اس انکار کو اہمیت نہیں دی گئی۔ انکار کو بغاوت قرار دے دیا گیا، اور اسے باغی۔

بھگوڑا باغی......

اجالا کو اس پر ترس آیا۔ اجالا کو رونا بھی آیا۔ روشن کے بعد اس کا خیال تھا کہ اب کوئی اور اس کے دل کو ایسے تکلیف سے ہم کنار نہیں کر سکے گا لیکن مشعل نے کر دیا تھا۔ اس نے جانا کہ ہر انسان کی زندگی مشکل ہے لیکن مشعل جیسی لڑکیوں کی زیادہ مشکل ہے۔ وہ ایسے پل صراط پر زندگی گزارتی ہیں جہاں، فیصلے کا ایک قدم انہیں بہت نیچے گرا دیتا ہے۔ انہیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ زندگی جینا انہیں بڑا بھاری پڑتا ہے۔ یہ باغی کہلائی جاتی ہیں۔ اور اس لقب کی قیمت ساری عمر چکاتی ہیں۔

☆☆☆

وہ ایک بوجھل دن تھا۔ بلکہ آنے والے سب ہی دن بوجھل تھے۔ موسم کی شدت بڑھ رہی تھی۔ کسی کے لیے یہ سہانے خوابوں جیسا موسم تھا۔ گرم بستر، گرم کافی، اور خواب ناک کہانیاں پڑھنے کا۔ کسی کے لیے یہ تیز کٹیلی سرد ہواؤں کا موسم تھا۔ زخموں کو ادھیڑ دینے والا۔ یادوں کو کھرچ دینے والا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ، ایک ہی موسم کو کئی مزاجوں میں ڈھال دیتے ہیں۔ کل کا دکھ، آج کا سکھ بھی نگل جاتا ہے۔

ہمیشہ سرد رہنے والا شگاگو، سرد تر ہو چکا تھا۔ کھانوں کا مزاج بدل گیا۔ ریسٹورنٹس میں رش بڑھ گیا۔ ہالیڈے سیزن کی آمد آمد تھی۔ ہر چیز پر سیل لگنے لگی تھی۔ عینی ان تینوں کو حلال تھائی سوپ کے لیے لائی تھی۔ آنٹی بھی ساتھ تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایک میز پر وہ چاروں ایک ہی وقت میں ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ آنٹی عینی کا لحاظ کرتی تھیں۔ اب تو وہ سارہ کا بھی بہت خیال کرتی تھیں، بس ایک اجالا اور ان کا ہی سلسلہ گرم سرد رہتا تھا۔ عینی نے کیمرے سے تصویر بناتے ہوئے اجالا کو اسمائل کہا تو ایک دم اس کا دل دھڑک گیا۔ اسے مشعل یاد آئی۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب پہلی بار اس نے اس کی تصویر لی تھی۔

"تم اچھی خاصی فوٹو جینک ہو...... میری بڑی بہن لگ رہی ہو۔"

ایک چیز جو اسے سارہ اور مشعل دونوں میں پسند تھی، وہ تھی، ان کا زندگی کی اہمیت کو سمجھنا۔ اور شاید سارا جھگڑا یہیں سے شروع ہو جاتا تھا۔ جو سرے سے زندگی کو ہی نہیں سمجھتے تھے، وہ ان کے گلے میں پٹے ڈالنا چاہتے تھے۔ سارہ اور مشعل جیسے لوگ، دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں۔ دوسروں کی زندگیوں میں بھی بہتری لانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے ارادوں پر قدغن لگا دی جاتی ہے۔

مشعل نے روشن کے بارے میں ہر چیز نوٹ کر لی تھی۔ پوری رپورٹ تیار کی تھی۔ نیتو کے گاؤں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اس کے خاندان کے بارے میں سوال کرتی رہی تھی۔ جن جن لوگوں کی زہریلے پانی نے جان لے لی تھی، ان لوگوں کے بارے میں اپنی فائل میں تفصیل لکھی تھی۔ یہ دنیا کے لیے مسیحا بننے والے لوگ اتنا جوکھم کیوں اٹھاتے ہیں۔ جبکہ دنیا انہیں جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔

عینی ان دنوں ذرا خوش رہتی تھی۔ اس کی سگریٹ نوشی بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ چہرہ دمکنے لگا تھا۔ کھلے کھلے رنگ پہنتی تھی۔ آنٹی ایک بار دبے لفظوں میں اس سے شادی کا کہہ چکی تھیں۔ آنٹی کی بات پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر سائے نہیں لہرائے تھے۔ اس نے ہونٹ نہیں کاٹے تھے۔

"ایک شادی تم نے گھر کے جہنم سے نکلنے کے لیے کی تھی۔ دوسری شادی اپنے دکھ کے جہنم سے نکلنے کے لیے کر لینی چاہیے۔"

یہ سارہ کہتی تھی۔

ایک بار انسان کے ہاتھ سے کوئی نعمت چھن جائے تو وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ خوف اسے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ جنت جیسا گھر، پیروں تلے آئے اور پھر آسمان سر پر آ گرے تو پھر کسی دیوار کو گھر بنانے کا دل نہیں چاہتا۔ محبت کرنے والا شوہر بچھڑ جائے تو کسی اور انسان کا ہاتھ پکڑنے کا سودا نہیں سماتا۔

عینی ان کے ساتھ ایک ہفتہ رہ کر گئی تھی۔ وہ چاروں مل کر مووی دیکھتی تھیں۔ اجالا انہیں نئے سے نئے کھانے پکا کر کھلاتی تھی۔ آنٹی اپنی جگہ پر لیٹی رہتیں۔ عینی ٹی وی پر جو کچھ لگاتی، چپ چاپ دیکھ لیتیں۔ آواز کم ہوتی، اونچی کرنے کے لیے نہ کہتیں۔ ایک پرسکون گھر کا خواب تو ان کا بھی رہا ہو گا۔ بیٹیاں ماں جیسی زندگی نہ گزاریں، یہ دعا وہ کرتی ہوں گی۔ ان دنوں پہلی بار اجالا نے محسوس کیا تھا کہ عورتیں اگر ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں، تو وہ سکون بھی بن جاتی ہیں اور خوشی بھی۔ اطمینان کی ایک خاص قسم ہے، جو ایک عورت ہی، دوسری عورت کو دے سکتی ہے۔ ایک ماں، بہن، بیٹی، سہیلی سے جو ڈھارس ملتی ہے، وہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ملتی۔

یہ جو شادی سے پہلے اجالا کو لگتا تھا کہ دل کا ساتھی ہی کافی ہوتا ہے، وہ خیال بدل چکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ شہریار ایسا نکل آیا تھا۔ بلکہ اس نے محسوس کیا کہ ایک مرد سے ساری محبت مل جانے پر بھی، عورت کا ایک حصہ، اپنی ہی صنف کی سنگت میں خوشی حاصل کرتا ہے۔ خوشی کی یہ قسم کسی مرد سے نہیں مل سکتی۔

گل باجی نے مشعل کی ایک جیکٹ نیتو کو دی تھی۔ جب سے موسم سرد ہوا تھا، نیتو وہی پہن رہی تھی۔ گل کی نظر اس ہفتے نیتو پر پڑی تو نظر وہیں ٹھہر گئی۔ گل کے چہرے کے رنگ بدل گئے۔ نیتو جیسے سمجھ گئی۔ وہ بہانے سے جیکٹ اتار رہی تھی کہ گل باجی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

"نہیں نہیں...... تم بھی میری بیٹی جیسی ہو...... یہ پہن کر رکھو...... تمہیں محبت سے دی ہے۔"

لیکن اگلی بار نیتو وہ جیکٹ پہن کر نہیں گئی تھی۔ ماؤں کے دلوں کا حال سب سمجھ جاتے ہیں۔ یہ جو محبت کے سلسلے ہیں، یہ سب سے زیادہ تکلیف وہ ہوتے ہیں۔ گل نے گھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یا شاید وہ خود کو مضبوط کرنا چاہ رہی تھی۔ گھر سے سوگ کی کیفیت اتر چکی تھی۔ انسان مر بھی تو جاتا ہے، اور دنیا کا نظام چلتا رہتا ہے۔ پیچھے والوں کو سنبھلنا ہی پڑتا ہے۔ وہ آہیں بھرتے ہیں، لیکن جیتے ہیں...... کیونکہ جینا پڑتا ہے۔

گل نے ان سب کے لیے کھانا بنایا تھا۔ بڑے اصرار سے انہیں کھلاتی رہی۔ پلیٹیں بھرتی رہی۔ ڈبوں میں الگ سے پیک کیا تھا۔ آتے ہوئے وہ ڈبے پکڑا دیے۔ مشعل کے پاپا اسٹور سے جلدی آ گئے تھے۔ گل باجی نے انہیں قہوہ بنا کر دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا حساب کتاب کرنے لگے۔ دونوں بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کارٹون مووی پر ہنس رہے تھے۔

"ہر شے اپنی جگہ پر واپس آ چکی ہے۔" اُجالا نے سوچا تھا۔

"مشعل بھی واپس آ جائے گی۔" اس نے بڑے دل سے اُمید کی تھی۔

مشعل...... وہ اپنی زندگی کے طوفان سے اکیلی نبرد آزما تھی۔

وہ اور الماس ایک اور بار مشعل سے مل آئی تھیں۔ ماں نے اس کے لیے پیسے بھیجے تھے۔

"ماما ٹھیک ہیں اجالا!"

اس نے بڑی مشکل سے سر ہلایا تھا۔ "اب تو ٹھیک ہیں...... لیکن بہت چپ چپ رہتی ہیں......"

"میرا پوچھ رہی تھیں؟"

"تمہاری کوئی بات کرتی ہیں تو رو دیتی ہیں......" اجالا اسے نیتو کی جیکٹ والی بات بتانا چاہتی تھی پھر رک گئی۔

مشعل نے سر ہلایا جیسے سمجھ رہی ہو۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا...... ابھی پاپا غصے میں ہیں...... میں انہیں منا لوں گی...... میں نے یہ کام بھی نہیں کیا لیکن اب میں کر لوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں عزم تھا۔ اُجالا جس نے مردوں کو اپنے تایا جی اور باپ کی شکل میں مجسم محبت دیکھا تھا، اسے یہ سن کر اچھا لگا۔ پھر وہ دیکھ چکی تھی کہ گھر کا ماحول کتنا پُرسکون ہو چکا ہے۔ شروع میں انہیں اس پر غصہ آیا ہو گا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرے گا ان کا غصہ اتر جائے گا۔ خون کے رشتے ایسے ہی تو ختم نہیں ہو جاتے۔

"تم بیٹی ہو ان کی...... وہ مان جائیں گے......"

اُجالا نے اسے پُرزور اُمید دی۔ وہی اُمید جس میں وہ خود رہتی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کہتے ہیں عورتیں خوابوں میں رہتی ہیں۔ وہ خوابوں میں اس لیے رہتی ہیں کیونکہ حقیقی دنیا کو ان کے رہنے کے لائق نہیں بنایا جاتا۔ خوابوں میں رہنا ان کی مجبوری ہو جاتا ہے۔ خواب انہیں خوشی دیتے ہیں۔ حقیقت تو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہے۔

"مجھے کوشش کرنی چاہیے...... کسی کو تو آگے بڑھ کر ان چیزوں کو ٹھیک کرنا ہے...... ورنہ نسل در نسل یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا۔"

وہی سارہ جیسی بات کہ چلو دنیا بدلیں۔ وہی بات مشعل کر رہی تھی کہ اس کے خاندان کی دوسری لڑکیوں کو اس جیسی تکلیف سے نہ گزرنا پڑے۔ اسے ہمت کرنی چاہیے اور چیزیں بدل دینی چاہئیں۔ مشعل کا فیصلہ سن کر الماس بہت مطمئن ہوئی تھی۔ اس کے شانے کو تھپکا تھا۔ گل اتنی پیاری تھیں کہ ہر انسان چاہتا تھا کہ

ان کا دل ٹھنڈا رہے، اور کوئی ماں کا صبر نہ سمیٹے۔

''کچھ وقت کے بعد اپنے پاپا سے اسٹور جا کر ملو۔ میری دعا ہے کہ وہ مان جائیں۔ اپنی بیٹی کو سمجھ جائیں۔''

مشعل نے سر ہلا دیا۔ ''میرا یہی ارادہ ہے۔''

☆☆☆

سارہ اس پر ہنستی تھی کہ تم کیا دوسروں کے مسئلوں کی وکیل بنی ہوئی ہو۔ پہلے روشن، اب مشعل۔ تمہاری زندگی کا مقصد گاڈ فادر بننا ہے۔ اگر ہاں تو پھر ٹھیک سے بنو۔ پہلے اپنی زندگی کے ولن سے مقابلہ کرو۔ اسے ٹھکانے لگاؤ۔

خود شعلوں میں گھری ہو، اور بھر بھر پانی دوسروں کی آگ پر ڈال رہی ہو۔

سارہ نے کچھ دیہاتی لب ولہجہ اپنا کر کہا تھا۔ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یہ عابدہ جیسی بات، عابدہ جیسا انداز تھا۔ اس نے بڑھ کر سارہ کو گلے سے لگا لیا۔

''تم جو ہو میرے لیے...... تم کرنا میرے ولن سے مقابلہ......''

سارہ نے اجالا کی طرف محبت سے دیکھا۔ ''اچھی لڑکی ہو تم...... میری بات مانو تو زیادہ اچھی ہو جاؤ گی۔''

اجالا نے بے ساختہ قہقہہ لگا دیا۔ وہ دنیا کی پہلی نند تھی، جو اپنے بھائی کے خلاف اپنی بھابی کو بھڑکاتی تھی۔ وہ اتنی سچی لڑکی تھی کہ اپنے خونی رشتوں تک کا جھوٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے سچے لوگ، جھوٹے لوگوں میں گھرے تھے۔ کیا نصیب ہے بے چاروں کا۔ آنٹی ایسی کوئی بات سن لیتیں تو کڑے تیوروں سے دونوں کو گھورتی تھیں۔ شہریار ان کا لاڈلا تھا۔ ماؤں کو ایک یہ شوق بھی ہوتا ہے، جو جتنا بگڑا ہوا ہو، اسے لاڈلا بنا لیتی ہیں۔ اس معاملے میں ماؤں کے معیار گر جاتے ہیں۔ اور ان ہی لاڈلوں کے لیے ان کی ناک اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ ہر شے کمتر اور معمولی دکھائی دیتی ہے۔

وہ شہریار کو یاد کرتی تھی۔ اس شہریار کو جو گاؤں کے کمرے میں اس سے ملا تھا۔ وہ انسان جس سے اس نے پورے دل سے محبت کی تھی۔ وہ محبت جواب بڑی ظالم چیز لگتی تھی۔ عینی نے یہ گھر اس وقت چھوڑا تھا جب شہریار نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اپنی ماں کے کہنے کے مطابق وہ اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ اور شہریار نے اس کے سر پر لیمپ دے مارا۔ ماں کہتی اس کے اینگر ایشوز ہیں۔ باپ سے غصہ لیا ہے، پاگل ہو جاتا ہے۔ سارہ کہتی تھی کہ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہ ہو سکے۔ جانوروں کو ڈھیل دے دی جائے تو وہ درندے بن جاتے ہیں۔ سب ماں کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ اسے لات ماریں، گھر سے باہر پھینکیں۔ آنٹی اس تبصرے پر چیخنے لگتیں۔

''تا کہ وہ نشئی ہو جائے...... مر جائے......''

سارہ منہ بنا لیتی تھی۔ دونوں نے اپنی ماں کو سمجھایا تھا کہ ایسے انسان کی سرے سے شادی ہی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ان کی ماں ایسے وقت میں، پرانے خیالات کی دیسی عورت بن جاتی تھی۔ جو اپنے بیٹے کو ٹھیک سمجھتی تھی اور اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔

شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے، وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ اتنا ٹھیک ہو گیا کہ بھول ہی گیا کہ وہ گاؤں سے ایک لڑکی کو محبت کے وعدے میں باندھ کر لایا ہے۔ اب تو محبت ہی قصہ پارینہ لگتی تھی۔ اجالا کو لگتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر شے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے ایک سوائے شہریار کے۔ سارہ کہتی ہر دوسری تیسری عورت تمہاری طرح ہے۔ کہنے کو شادی شدہ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اور حقیقت میں اندر سے پوری طرح خالی ہے۔ نہ محبت ہے نہ احترام۔ کوئی قدر نہیں، احساس نہیں۔ شادی کا لیبل پیشانی پر چپکا ہے۔ نہ رہائی، نہ خلاصی۔ گاؤں والی ماں کہتی تھی کہ اپنا آپ مار دو، مٹا دو، پھر قدر ہوتی ہے۔

وہ پہلے دن سے خود کو مٹا رہی ہے...... سارا مٹ جائے گی تب قدر ہو گی؟

☆☆☆

ان ہی دنوں میں وہ اور بلبل ایک جگہ چائے پی رہے تھے کہ شفیق بھائی دکھائی دیے تھے۔ پہلی نظر میں وہ انہیں پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ کہاں وہ تھکا ہوا انسان، کہاں یہ ہشاش بشاش قہقہے لگانے والا بندہ۔ شفیق بھائی نے لیدر جیکٹ پہنی تھی۔ کافی مہنگی تھی۔ اسٹائل میں بال بنائے تھے۔ شاید انہیں کلر بھی کیا تھا۔ سلیقے سے شیو بنی ہوئی تھی۔ ان کی میز سے کچھ دور، وہ کسی لڑکی کے لیے کرسی گھسیٹ رہے تھے۔ لڑکی لانگ کوٹ میں تھی۔ گہری سانولی رنگت کی تھی۔ گھنگریالے بال تھے۔ وہ اتنی پرکشش تھی کہ کئی لوگوں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ بلبل تک نے اس طرف دیکھ کر اجالا کو کہنی مار کر متوجہ کیا تھا۔

"ہو گیا کام خلاص...... شفیق بھائی کی ماں تا تمہارا گلا دبانے امریکا تک ضرور آئیں گی...... ان کے کماؤ پوت کو تم نے ہی یہ راستہ دکھایا ہے۔"

اجالا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"ہو سکتا ہے کوئی دوست ہو۔" اجالا کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اتنا بن ٹھن کر دوست کو لے کر کون نکلتا ہے...... دال میں کالا نہیں، پوری دال کالی ہو چکی ہے...... بلکہ گلابی شادابی...... لڑکی کسی اونچی جگہ جاب کرتی ہے۔ اس کی ڈریسنگ دیکھو...... تم نے ہی مشورہ دیا تھا نا شادی کا...... تیاری کر لو لڈو کھانے کی...... مجھے ساتھ ضرور لے جانا۔"

اجالا ذرا دور بیٹھے شفیق بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اس انسان کی پوری کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔ سالوں مشقت کی چکی میں پسنے والا آج ہلکا پھلکا بے فکرا لگ رہا تھا۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ شفیق بھائی کو اپنے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ جو بھی تھا، انہیں ایسے دیکھ کر اجالا کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ تپتے ہوئے صحرا میں کسی کو تو نخلستان ملا۔

اجالا نے بلبل کو منع کیا تھا کہ چپ کر کے نکل جائیں گے لیکن وہ باز نہیں آئی اور قریب سے گزرتے ہوئے، زور سے اُجالا کا نام پکارا کہ شفیق بھائی متوجہ ہو گئے۔ اسے دیکھ کر تو وہ کھل اٹھے۔ فوراً لپک کر اس کی طرف آئے۔

"اُجالا باجی...... آج تو کمال ہو گیا...... ادھر آؤ ان سے ملو...... آؤ آؤ...... آج بڑا پیارا دن ہے......"

اس نے دونوں کو لڑکی سے ملوایا۔ چاروں میز پر بیٹھ گئے۔ چائے آئی۔ باتیں ہوئیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بات کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ بلبل انگلش میں فر فر باتیں بنانے لگی۔ اس کا پورا پتا ٹھکانا حاصل کر لیا۔ بس وہی پہلی ملاقات میں آگے پیچھے کی ساری معلومات حاصل کر لینے والی عادت۔ یہ دیسی لوگ، یہ ان کے تجسس کی بڑھی ہوئی حسیں کہ پرتھوں کو کھنگال لیتے ہیں۔ شفیق بھائی اجالا سسٹر، اجالا سسٹر کہتے رہے۔ وہ انسان اتنا خوش، اتنا معصوم لگ رہا تھا کہ اجالا نے اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دل سے دعا کی۔

"لیلیٰ کیسی لگی اجالا باجی......" لتی کو شفیق بھائی نے لیلیٰ کا نام دیا تھا۔

"بہت اچھی ہے...... وری بیوٹی فل......"

"میرا دل رکھ رہی ہو......"

"سچ بول رہی ہوں......"

"ماں کو پسند آ جائے گی؟؟"

"اب سچ بولوں یا جھوٹ؟"

شفیق بھائی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "کچھ نہ کہنا...... میں سمجھ گیا...... سب سمجھ گیا......"

بڑھتے ہوئے اداس موسم کی یہ پہلی خوش خبری تھی جس نے اسے خوش کیا تھا۔

☆☆☆

اسی موسم کی دوسری خوش خبری یہ تھی کہ آنٹی اپنی سہیلیوں اور کولیگز کے ساتھ یورپ کے ٹرپ پر جا چکی تھیں۔ وہ ہر سال دو ہفتوں کے لیے جاتی تھیں۔ شاپنگ کرتیں، گھومتی پھرتی تھیں اور کسی فکر کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی تھیں۔ وہ ایسے نکلی تھیں جیسے

اس گھر سے بھاگ رہی ہوں۔ سب اس گھر سے بھاگنا چاہتے تھے۔ اور سب اسی گھر میں رہنے پر مجبور تھے۔

آنٹی سارا سال فیکٹری کے گودام کی بھیڑ چال کو دیکھتی تھیں۔ ملازموں پر چیختی چلاتی تھیں۔ پیپر بورڈ ہاتھ میں پکڑ کر اتنے بڑے گودام کی چیزوں کا حساب رکھتی تھیں۔ سارہ بتا رہی تھی کہ انہوں نے گودام کا کام ایسے سنبھالا ہوا ہے کہ وہ اگر دو دھمکی دے دیں کہ جاب چھوڑ رہی ہوں تو مالکوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ کئی طرح کے الاؤنس دے کر انہیں روکتے ہیں۔

آنٹی لمبی مدت سے یہ جاب کر رہی تھیں۔ کام کو ایسے سیکھ لیا تھا کہ مالکوں کی ضرورت بن گئی تھیں۔ کوئی مرد ان کے برابر چھوڑ، ان کے جیسا کام نہیں کر سکتا تھا۔

اوور ڈوز سے سارہ کے فادر کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ وہ زندہ تھے تب بھی انہیں کوئی سکھ نہیں دیا تھا۔ ہمیشہ سے آنٹی نے ہی گھر چلایا اور بچوں کو دیکھا تھا۔ ان کا کام کھڑے رہنے کا تھا۔ دو بار گھٹنے کی سرجری ہو چکی تھی۔ ایک بار وہیل چیئر پر آ چکی تھیں۔ بڑی ہمت کر کے خود کو کھڑا کیا تھا۔ وہ روتی نہیں تھیں۔ شاید بہت رو چکی تھیں اس لیے۔ ان پر کسی کے رونے کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا۔

وہ کتنی دکھی ہیں، کتنی اداس ہیں، اس کا اندازہ صرف ٹی وی کی آواز سے ہوتا تھا۔ وہ رونا چاہتی ہیں، چیخنا چاہتی ہیں، اس کا بھی۔ انہیں زندگی میں کبھی پر امن، صلح جو، خیال رکھنے والا مرد نصیب نہیں ہوا تھا۔ شاید اسی لیے وہ بضد تھیں کہ شہریار میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ وہ اس آخری چانس پر، ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

یہ سارے کلیے اچھے تھے یا برے، لیکن انہوں نے اپنی زندگی پر لاگو کر لیے تھے۔ اب انہیں زندگی میں آرام چاہیے تھا وہ کیسے بھی ملتا۔ شہریار سے انہیں بہت محبت تھی۔ محبت سارہ اور عینی سے بھی تھی لیکن انہیں سارہ اور عینی کی بد زبانی پسند نہیں تھی۔ چار کتابیں پڑھ کر وہ ماں کی اٹھائیس سالہ پر مشقت زندگی پر سوال اٹھاتی تھیں۔

جس عورت نے ایڑیاں تک رگڑی تھیں، اس عورت سے وہ حساب مانگتی تھیں۔

وہ کیا جانتی تھیں کہ پردیس میں اکیلی عورت کیسے زندہ رہتی ہے۔ تنہائیوں سے کیسے لڑتی ہے۔ اپنی طرف آنے والوں کو کیسے روکتی ہے۔ وہ کتنی شدت سے شفقت کے لیے ترستی ہے۔ ایک مہربان لہجہ اسے کتنا عزیز ہوتا ہے۔ سرد ملک کی سردی، کیا کیا تقاضے اپنے ساتھ لاتی ہے۔

یہ عورت کتنا صبر کرتی ہے...... صبر کہ محبت کے لیے اس کی تڑپ کتنی بڑھ جاتی ہے۔ یہ آج کل کی نسل کیا جانتی ہے۔ کھال کچی ہے تب نہیں جا کر زندگی اس کنارے سے آ کر لگی ہے۔ ورنہ چار گولیاں پھانک کر قبر میں جانا کیا مشکل تھا۔

"تمہیں تمہارے جواری باپ کے پاس چھوڑ کر جانا میرے لیے آسان تھا۔ نہیں گئی اسی لیے آج تم سے باتیں سن رہی ہوں۔ اپنی ہی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں۔"

ایک بار سارہ کی چیخ چیخ کے جواب میں انہوں نے بڑے ضبط سے کہا تھا۔ سارہ اپنے بال نوچ کر رہ گئی۔ وہ سب اپنی مشقتوں کے دائروں میں بھاگ بھاگ کر کچھ کے کچھ ہو چکے تھے۔ وہ سب غلط اور سب صحیح تھے۔ زہریلے ماحول میں پلنے والے بچے امرت کیسے ہوں گے۔

سارہ اور عینی نے بڑا زور لگا کر خود کو جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔ سارہ سب سے زیادہ ہمت دکھاتی تھی۔ کالج سے چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کبھی جاب سے بھی آف نہیں لیتی تھی۔ اس کے پاس ایک کھٹارا سی گاڑی تھی، اور اسے ہی جہاز کی طرح اڑاتی رہتی تھی۔

اس گھر کا ہر فرد پہلے سے ہی زخمی تھا۔ ان زخموں میں انہوں نے اجالا کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

آنٹی سیاحت کے لیے نکلیں تو شہریار بھی نکل گیا۔ جو قرض تھا وہ اُجالا کا قرض تھا، اسے ادا کرنا تھا۔ "یہ

امریکا"، یہاں میری مشکل ہماری مشکل نہیں۔ یہاں تمہاری مشکل صرف تمہاری مشکل ہے۔"

آنٹی نے تو صاف کہا تھا وہ ایک پیسہ نہیں دیں گی۔ اس نے بہت تکلیف اٹھائی لیکن اس کی اس شراب خانے سے جان چھوٹ گئی۔ سرخ رومال جو اس کا سانس گھوٹتا تھا اس سے آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اب وہ ڈھیلی ڈھالی جینز پر سفید شرٹ پہنتی تھی، اور منہ دھوکر رکھتی ہے۔ سرخ لپ اسٹک کو اس نے پھینک دیا تھا۔ اسے نفرت ہو چکی تھی اس رنگ سے۔

عینی نے کہا کہ بلبل کو گھر بلا لو، اپنے ساتھ رکھو۔ اس نے بلبل کو گھر بلا لیا۔ عینی نے اپنا کمرا کھول دیا تھا بلبل وہاں رہنے لگی۔ صبح وہ سارہ اور بلبل کے لیے ناشتہ بناتی، پھر سارہ انہیں ڈراپ کر دیتی تھی۔ واپسی پر وہ مل کر رات کا کھانا کھاتیں، اور ٹی وی پروگرام دیکھتی تھیں۔ اور اتنے میں ہی اسے لگتا کہ اس کی زندگی مکمل ہو چکی ہے۔

ایک ویک اینڈ پر وہ گھومنے چلی گئیں اور دوسرے ویک اینڈ اجالا نے سب کو گھر دعوت پر بلا لیا تھا۔ الماس آپا ان کی بیٹیاں، نیتو، اس کی بھابی، سب آئے تھے۔ لانا اور جیڈی نے میوزک پر سالسا ڈانس کر کے دکھایا تھا۔ وہ ایک اچھی ستارہ رات تھی۔ وہ سب خوش تھیں۔ لانا انہیں سکھا رہی تھی کہ یہ ڈانس کرنا کتنا آسان ہے۔ اس نے نیتو کو کھینچا پھر الماس کو، اور پھر سب ایک دوسرے کو کھینچتے چلے گئے۔

انسان رشتوں کا محتاج ہے۔ جہاں وہ پردیس میں ہر چیز کا نعم البدل ڈھونڈ لیتا ہے، رشتوں کا بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ عابدہ سے بلبل مل گئی۔ حریم کی کمی سارہ اور عینی نے پوری کر دی۔ تائی جی، الماس آپا سے بدل گئیں۔ قمر، شفیق بھائی میں جھلکنے لگا۔ نیتو، لانا، جیڈی، اس کی گاؤں والیاں ہو گئیں۔ ایک دن کوئی ماں جیسا بھی مل جائے گا اور تایا جی جیسا بھی۔ پھر پردیس کاٹنا آسان ہو جائے گا۔

پھر پردیس...... پردیس نہیں رہے گا......

☆☆☆

زمین پر پہلا قتل ایک مرد کا ہوا۔ ایک مرد نے کیا۔ یہ ایک کے دل کا بغض تھا، جو دوسرے کی جان پر نازل ہوا۔ لوگ کہتے ہیں یہ قتل ایک عورت کے لیے ہوا۔ زمین کے پہلے قتل کے پیچھے عورت کے شر کا سایہ تھا۔ اور وہیں سے "زن" کو فساد میں پہلا درجہ دے دیا گیا۔ زن، زر اور زمین...... پہلا قتل عورت کی وجہ سے...... پہلا جھگڑا زر کا اٹھا...... پہلی جنگ زمین پر ہوئی......

تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ پہلے قتل میں فساد کی جڑ کون تھی۔ لیکن تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ......

پہلی بدنامی عورت کی ہوئی......

پہلی تہمت عورت پر لگی......

پہلی مظلوم عورت ہوئی......

☆☆☆

وہ پہلی بار اپنی فرینڈز کے ساتھ کروز پر سیاحت کے لیے نکل چکی تھی۔

وہ دل سے اداس تھی لیکن وہ زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اسے سنبھلنے میں کچھ اور وقت لگنا تھا لیکن اس نے حقیقت قبول کرنا بھی شروع کر دی تھی۔ حقیقت کہ شاید پاپا اسے کبھی معاف نہ کریں۔ حقیقت کہ اس کے بھائی بڑے ہوں گے تو شاید گھر کی صورت حال بدل جائے۔ وہ اپنی بہن کو سمجھ جائیں گے۔ اس پر بند دروازے کھول دیں گے۔ حقیقت کہ شاید اسے ہمیشہ تنہا زندگی گزارنی پڑے۔ وہ شاید ہی دوبارہ کبھی اپنی ماں سے مل سکے۔

ماں نے ٹھیک کہا تھا، یہ اس کے فیصلے کی قیمت تھی۔ قیمت بھاری تھی...... اتنی بھاری کہ شاید ہی اس سے چکائی جا سکے۔ لیکن وہ خود کو مضبوط کر رہی تھی۔ وہ پاپا سے ملنے کی کوشش کو ترک نہیں کرے گی۔

وہ ایک بار پاپا کے اسٹور گئی تھی۔ شیشے کی دیواروں کے اس طرف کھڑے ہو کر اپنے باپ کو دیکھتی رہی تھی۔ اس نے اندر جانے کی ہمت کی۔

لیکن خوف نے اسے پتھر کا بنا دیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پائی۔ باپ کی آنکھوں کی سرد مہری اب اس پر بہت بھاری پڑنے والی تھی۔

وہ اپنے باپ کو بتانا چاہتی تھی کہ جب وہ چھوٹی تھی تو کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان کے آنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسے دنیا میں ماں اور باپ، ان دو سے زیادہ کوئی عزیز نہیں رہا تھا۔ اسکول میں ایک ایکٹیویٹی میں اس نے سپر ہیومن میں اپنے باپ کا خاکہ بنایا تھا۔ اس نے اپنی ٹیچر کو بتایا تھا کہ اس کا باپ بہت چھوٹے سے گاؤں سے آیا تھا۔ وہ بہت بہادر انسان ہے۔

بہادر باپ کی بیٹی نے اپنے لیے بہادری ہی چنی تھی۔ وہ پاپا کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ ان ہی کی وجہ سے کالج آ رہی ہے۔ ورنہ اسٹوڈنٹس کو کئی کئی جاب کرنی پڑتی ہیں پھر وہ اپنی فیس دیتے ہیں۔ اپنی فرینڈز میں وہ سب سے اچھے اور مہنگے کپڑے پہنتی ہے۔ پیسہ خرچ کرنے میں اس کا ہاتھ کھلا ہے۔ جس گھر میں وہ رہتی ہے، وہ گرم ہے، کشادہ ہے۔ اس کا کمرا خوب صورت ہے۔ بستر نرم ہے۔ اس لیے کہ زندگی کی ساری سختی باپ نے کاٹ لی ہے۔

وہ پاپا کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی...... اور یہ بھی کہ اتنی سہولتیں دینے پر بھی آپ کے پاس مجھ پر زبردستی کرنے کا حق نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر زبردستی ہی جائز ہوتی تو پہلی زبردستی اللہ کرتا۔

ہر طرح کے نظریاتی اختلافات کے باوجود، وہ یہ نہیں چاہتی تھی جو کچھ اب ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کے تعلقات میں امن قائم ہو جائے۔ پاپا کچھ تو اپنے رویے میں لچک کا مظاہرہ کریں۔ درمیان کا ایک ایسا راستہ نکال لیا جائے، جو دونوں کے حق میں بہتر ہو جائے۔

اپنی فرینڈز کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے بھی یہی سب کچھ اس کے اندر چلتا رہا۔ وہ تحفظ جو ماں باپ سے ملتا ہے، اسے وہ تحفظ پسند رہا تھا۔ وہ امریکا کی بہت سی چیزوں کو پسند کرتی تھی۔ لیکن ناپسند اسے اپنے باپ دادا کی زمین بھی نہیں تھی۔ وہ متنفر نہیں تھی۔ اسے کچھ جائز حق چاہیے تھا۔ پیرس میں نئے سال کے جشن کے ہجوم میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے لیے ایک ایسے سال کی تمنا کی تھی جس میں اس کے عزیز اس کے ساتھ ہوں۔ وہ کالج سے یونیورسٹی چلی جائے، اور پھر اپنا کامیاب کیریئر شروع کر دے۔

نیا سال...... نئی زندگی......

پندرہ دن بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔ ایسا اس کی فرینڈز کا کہنا تھا۔ مشعل کا اپارٹمنٹ خالی تھا، کیونکہ دوسری دو لڑکیاں ابھی اپنے شہر سے واپس نہیں آئی تھیں۔ آخری بار انہوں نے اسے کروز پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد انہیں مشعل دکھائی نہیں دی تھی۔ نئی کلاسز شروع ہو گئیں لیکن مشعل کالج نہیں آئی۔ وہ مشعل کے اپارٹمنٹ گئیں لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ سب فرینڈز نے ایک دوسرے سے پوچھا لیکن کسی کو مشعل کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

نئے سال کا پہلا ہفتہ گزر چکا۔

مشعل کی فرینڈز نے پولیس میں مسنگ پرسن میں مشعل کی رپورٹ کروا دی اور انہیں جتنی معلومات دے سکتی تھیں، دے دی۔ پولیس کی طرف سے ضروری کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اسی کارروائی کے سلسلے میں پولیس مشعل کے گھر گئی۔ گھر کے دروازے پر بیل دی۔ دروازہ کھلا تو سامنے مشعل کے پاپا کھڑے تھے۔ کچھ دور سامنے گل کچن میں کھڑی تھیں۔ ان کی نظر ان دو پولیس والوں پر پڑی۔ صرف ایک نظر کی دیر تھی۔ ان کا سر اتنی بری طرح سے گھوما کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ کاؤنٹر پر رکھے کئی برتن ان پر آ گرے۔

"میری مشعل......"

اندھیرے میں ڈوبنے سے پہلے گل نے آہ بھری تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فاطمہ ہارون

بکھرے گیت

"نا جانے کیا ہوا ہمارے کچن کو اس دفعہ جو سودا مہینے سے اوپر جاتا تھا وہ کافی دن پہلے ختم ہو گیا۔" اقصیٰ نے فکرمند سے لہجے میں اسد کو مخاطب کیا۔

اسد جو مہینے کے آخر میں زیادہ بل آنے کی وجہ سے پریشان بیٹھا تھا۔ اقصیٰ کی بات سن کر سر کو دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔ گویا مزید پریشانی کا اظہار خاموشی سے کرنے لگا اور ایسے ظاہر کرنے لگا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا اسد! ہر پریشانی کا حل خاموشی تو نہیں ہے۔ چلو بل تو آپ کہیں سے مانگ تانگ کے جمع کروا دیں گے۔ لیکن کچن کو تو میں نے دیکھنا ہوتا ہے۔ جو آخری سات دن ہیں وہ کیسے گزریں گے جبکہ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے اور کچن کا سودا ختم۔

آپ کو کچھ لانے کو کہوں تو کہتے ہیں خرچ تو تمہیں دے دیا۔"

اسد جتنا خاموش طبیعت والا تھا اقصیٰ اتنا زیادہ بولتی تھی اور اس نے اسد کی خاموشی پہ ایک بھرپور تقریر کر ڈالی۔ اسد کے کان پہ جوں تک نہ رینگی اور آنکھیں ایک ہی نقطے پر جمی رہیں۔ جیسے اسد کچھ بہت گہرا سوچنے میں مصروف تھا۔ جب بولا تو صرف اتنا



کہا۔

''اقصیٰ! ایسا کرتے ہیں کہ اماں کو واپس لے آتے ہیں، اماں کے جانے کے بعد ہی ہمارے گھر میں اتنے مسائل ہونے لگے ہیں۔''

''اب اماں کے آنے یا جانے سے مہنگائی زیادہ یا کم نہیں ہوتی ہے۔'' اقصیٰ نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن اماں جب تک تھیں تو میں یہی سودا لاتا تھا اور اماں کچن میں جانے سے پہلے وہ تھیلا اپنے پاس رکھوائی تھیں اور نہ جانے اس پر کیا پڑھ کر پھونکتی تھی کہ اس میں برکت ہو جاتی تھی۔''

''لیکن اماں ہمارے پاس رہیں بھی تو ان کو بس ہر وقت اپنے چھوٹے بیٹے اور بہو کی فکر ہولائے رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے بھی ایک مہینے سے اوپر رہ لیں تو رونے لگتی ہیں کہ مجھے عابد اور اسما کے پاس چھوڑ آؤ میرا ان کے بغیر دل نہیں لگتا۔''

''ہاں تو تم بھی تو کبھی کبھی حد کرتی ہو، اماں اگر تم سے کوئی دین کی دو چار باتیں کر لیں تو تمہیں اپنے سو کام یاد آ جاتے ہیں اور تم اٹھنے کے بہانے ڈھونڈتی ہو اور ان کی بتائی ہوئی باتوں میں مین میکھ نکالتی رہتی ہو کہ اماں ایسے بتاتی ہیں جیسے ہم تو دین کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہ ہو۔'' اسد نے کافی اونچی آواز میں کہا۔

''ہاں تو وہ بھی تو کبھی کبھی حد کرتی ہیں کہ اگر دین کی کوئی بات چھیڑ دیں تو دو دو گھنٹے اسی ایک ٹاپک پہ لگی رہتی ہیں۔ میں کہتی بھی ہوں کہ مجھے اس بارے میں پتہ ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی بات پہ ڈٹی رہتی ہیں کہ سن لو کام آئے گا۔ اب میرے بھی تو سو کام ہوتے ہیں۔ بچے ہیں ان کے کام کرنے ہوتے ہیں۔ باہر کے بھی آدھے سے زیادہ کام مجھے کرنے پڑتے ہیں۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اسما بھابھی کو دنیا کا کوئی کام نہیں یا ان کے بچے نہیں ہیں۔ وہ بھی تو اماں کے پاس بیٹھتی ہیں اور یہی باتیں کتنی دلچسپی سے سنتی ہیں۔''

''اسما بھابھی کو تو آپ رہنے ہی دیں وہ تو بہت ہی بورنگ عورت ہیں۔ انہیں تو کوئی باتیں کرنے والا مل جائے۔ اور وہ سنتی رہیں۔'' اقصیٰ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''اچھا رہنے دو تم سے کون جیت سکتا ہے۔ ایک چائے کا کپ ہی دے دو پھر کچھ سوچتا ہوں کیا کرنا ہے۔ بلکہ جاتا ہوں کسی کے پاس کچھ پیسے ادھار مانگتا ہوں تنخواہ آنے پر واپس کر دوں گا۔'' اسد نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دوسرے دن جب اسد گھر آیا تو آتے ہوئے اماں کو بھی ساتھ لیتا آیا۔

''السلام وعلیکم! اماں کیسی ہیں...... کتنے دن ہو گئے آپ نے چکر ہی نہیں لگایا۔ یہاں سے جاتے ہی آپ ہمیں تو بھول جاتی ہیں۔'' اقصیٰ نے ساس کے گلے لگتے ہوئے شکوہ کیا۔

''نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں اب صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ گھٹنوں میں کافی درد رہتا ہے۔ بس اب ادھر ادھر جانے سے کتراتی ہوں۔ کیا بات ہے خاموشی بہت ہے۔ بچے ابھی اسکول سے واپس نہیں آئے۔'' اماں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بس آنے والے ہوں گے۔ اچھا اقصیٰ کھانا لگا دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔ آج آفس میں بھی کچھ نہیں کھایا۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' اسد نے اٹھتے ہوئے اقصیٰ کو آواز دی۔

اقصیٰ نے کھانا لگا دیا۔ ''رات کی دال کے ساتھ کھچڑی بنالی تھی۔ بچوں کے لیے دو انڈے فرائی کر لیے۔'' اسد بتا دیتے کہ آپ کو بھی ساتھ لائیں گے تو کوئی سبزی بھی لا کر بنا لیتی۔'' اقصیٰ نے کھانا ساس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... جو ہے اللہ اس میں

برکت ڈالے۔"

بچے بھی دس منٹ تک اسکول سے آگئے۔ دادو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بیگ ایک طرف رکھ کر...... دادو کے گلے لگ گئے۔ اور دادو کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئے۔

"دادو صدقے جائے۔" اماں نے بچوں کے سر پہ پیار کرتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی اٹھ کر ہاتھ دھونے کا کہا۔

"اٹھو بچوں ہاتھ دھو کر آؤ اور دعا پڑھ کے کھانا شروع کرو شاباش۔"

"میں تو ان کو روز بتاتی ہوں، لیکن بچے ہیں پھر بھول جاتے ہیں اور پھر ایسے ہی کھانے پہ بیٹھ جاتے ہیں۔" اقصیٰ نے ساس کو اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

اماں بھی کھانا کھا کر نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ اسد اور اقصیٰ بھی تھوڑی دیر آرام کرنے چلے گئے۔ بچوں نے اپنے کارٹون لگا لیے اور پھر کارٹون دیکھتے دیکھتے سو گئے۔

عصر میں جب اماں اور اقصیٰ شام کی چائے اکٹھی پی رہی تھیں تو اقصیٰ نے اماں سے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

"نہ جانے اماں کیسی بے برکتی ہے گھر میں...... اسد کی آمدنی بھی ٹھیک ہے لیکن پھر بھی مہینے کے آخر میں حالات بہت ڈاؤن ہو جاتے ہیں پتا نہیں سمجھ میں نہیں آتا ...... ہر طریقے سے بجٹ بنا کر دیکھ چکی ہوں۔"

اماں نے سکون سے اپنی چائے ختم کی۔ اور اقصیٰ کی طرف پہلو بدل کر بیٹھ گئیں اور اپنی بات شروع کی جو وہاں سے ہی سوچ کر آئی تھیں کہ آج تو اقصیٰ کو سمجھاؤں گی کہ شاید کچھ سمجھ میں آجائے۔

"بیٹا، اسد نے بھی کل عابد کے گھر مجھے کچھ بتا دیا تھا۔ کہ گھر کے حالات کیسے چل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ جتنا کما کر لاتا ہوں۔ اس سے زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔

بیٹا ساس بھی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ میں کیوں چاہوں گی کہ میرے بیٹے کے گھر کوئی تنگی ہو۔ میں نے تو جب بھی تمہیں سمجھانے کے لیے کوئی دین دنیا کی بات کی تو تم نے اسے رد کر دیا کہ اماں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ حالانکہ نماز اور قرآن پڑھنے سے گھر میں برکت ہوتی ہے۔

راشن بھرتے وقت ذکر الٰہی کریں تو جو راشن مہینے کا ہے۔ وہ ڈیڑھ مہینہ چلے گا۔ ان شاء اللہ۔"

"اچھا تو اماں آپ یہ کرتی تھیں۔ اور واقعی میں ہمارا راشن کافی ٹائم نکال لیتا تھا۔" اقصیٰ نے جلدی سے اپنی بات ختم کی۔

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی بیٹا۔" اماں نے اس کو مزید بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"اگر تم خود صبح جلدی اٹھو، نماز اور قرآن کو اپنی زندگی میں شامل کر لو۔ تو تمہاری زندگی میں بھی برکت ہو جائے گی۔ اگر تم خود آدھی رات تک موبائل دیکھو گی۔ اور صبح لیٹ اٹھو گی تو بچے بھی تمہیں دیکھ کر وہی روٹین اپنائیں گے۔ صبح جلد اٹھنے سے ہم کئی پریشانیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ شیطان ہماری زندگی اور ہمارے دماغ پر حاوی نہیں ہوتا۔" اماں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اور اب اسد کو جگاؤ کہ مجھے عابد کے گھر چھوڑ آئے۔ میں مغرب کی نماز وہاں جا کر پڑھوں گی۔"

"اماں، آپ آج آئی ہیں۔ اور ابھی سے جانے کی باتیں کرنے لگیں، بچے بھی ناراض ہوں گے۔ دو تین دن تو رہیں پھر اسد چھوڑ آئیں گے۔"

"نہیں بیٹا! میرا اسما کے بغیر دل نہیں لگتا۔"

اماں نے اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔ اور اقصیٰ سمجھ گئی کہ اماں کا دل اسما کے بغیر کیوں نہیں لگتا۔

ہاجرہ ریحان

اللہ کافی ہے

کتنی ہی بار گھڑی دیکھ چکی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وقت تھم کر رہ گیا ہے، جبکہ جون کی شدید گرمی اور حبس میں گھر کے اندر سانس لینا مشکل لگ رہا تھا تو باہر قبرستان میں مردوں کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ میں خود کو گرمی سے بچانے کے لیے کسی بھی طرح سے وقت کے گزارنے کو ممکن بنانے کے لیے مختلف باتیں سوچ رہی تھی۔ بندہ قرآن شریف بھی کتنا پڑھے؟ اوپر سے زمین پر بیٹھ کر دانے گننا بھی آسان بات نہیں۔

آدھے ایک گھنٹے کے بعد ہی میرے گھٹنے دکھنے لگے اور میں بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹے سے کمرے کی دیوار سے لگی کچھ کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی...... اُفف ابھی تو صرف دو ہی گھنٹے ہوئے، یعنی فقط ایک گھنٹہ پہلے تو یہ لوگ جمعہ کی نماز کے بعد میت لے کر قبرستان کے لیے میت گاڑی میں سوار ہو کر نکلے تھے۔ میرے پاس تو ہر ایک لمحے کی خبریں بذریعہ واٹس ایپ میسج آتی جا رہی تھیں۔

اب یہ بھی عجیب بات تھی مردوں میں کتنے ہی تھے جو مجھے ہر ایک لمحے سے آگاہ کرنے میں شاید ایک دوسرے سے بازی لگا رہے تھے مگر شوہر صاحب پہلی بار اس طرح بے نیازی دکھا رہے تھے۔ خیر ابھی تک قبرستان پہنچنے کا میسج نہیں آیا تھا۔ کب قبرستان پہنچیں گے کب دفن...... توبہ توبہ...... میں نے اپنا سر جھٹک کر خود کو جھڑکا اور میری ہمیشہ کی تنی ہوئی لمبی صراحی دار گردن ذرا سا لچک گئی۔

"اللہ کا خوف کرو بی بی...... کل تم کو بھی مرنا ہے اور کیا اچھا لگے گا تم کو، ایسا ہی کسی کا تمہارے لیے سوچنا کہ تمہاری میت کے گھر میں بیٹھی تمہاری پسندیدہ شخصیت تمہارے سپرد خاک کیے جانے کے تمام لوازمات کو اس بے دلی اور بے رخی سے جھیلے...... حد ہو گئی بھئی...... میں نے ایک بار پھر خود کو جھڑکا۔

"کہاں مرحومہ اور کہاں میں...... میرے لیے تو سب زار و قطار روئیں گے اور پھر روتے ہی چلے جائیں میں تو جب اس دنیا سے جاؤں گی تو جیسے سارا سنسار اشک بار ہو جائے گا۔ ہر کوئی مجھے چاہتا بھی تو اتنا ہے۔ اتنی پرکشش اور خوب صورت ہستی کے دنیا سے اٹھنے پر ایسا کچھ قیامت انگیز دردناک منظر ہی تو رونما ہوتے ہیں جیسے فلموں میں ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔"

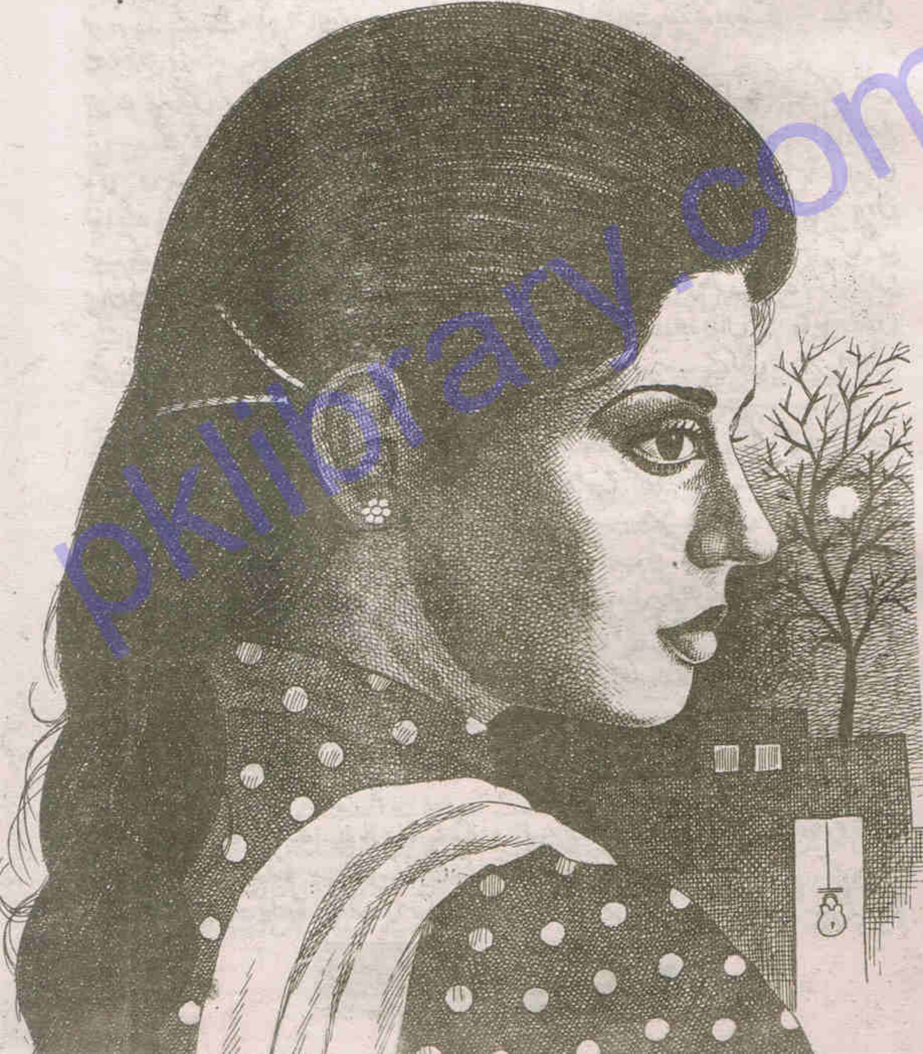
گردن کا تناؤ ایک بار پھر بھرپور ہو چکا تھا۔ مگر بھئی میں ابھی سے مرنے کے بارے میں کیوں سوچوں؟ میں نہ صرف صحت مند، جوان اور خوش شکل ہوں بلکہ میں پیسے والی بھی ہوں...... میرے والدین بھی اونچے درجے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر اوقات ہم یہ فیصلہ نہ کر پاتے کہ آیا ہم امیر ہیں یا متوسط......

خیر بتانے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے بہت ناز سے پالا ہے اور میری شادی کرتے وقت

انہوں نے بھرپور چھان بین کی تھی کہ — ان کی نازوں کی پلی بیٹی کو — کوئی جسمانی یا ذہنی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اسی لیے میرے لیے نا صرف امیر شوہر ڈھونڈا گیا بلکہ رشتہ طے کرتے وقت اس حساب کتاب کا بھی خیال رکھا گیا کہ میرا شوہر شادی سے پہلے ہی میرے عشق میں گرفتار ہو جائے جس کے لیے شادی سے پہلے ہی میرے والدین نے شوہر صاحب کے والدین کو میری خوشی کے اہم ہونے کو اتنا باور کرادیا تھا کہ شادی کے بعد شوہر صاحب کو قابو کرنے کے لیے مجھے زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑی کیونکہ وہ پہلے سے ہی مجھ پر فریفتہ تھے یا ایسا میں ظاہر کرتی ہوں۔

میں یہ بات بہت معمول کے انداز میں کہتی ہوں ان کو میرا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ میری ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں ان کے نزدیک میری خوشی سب سے اہم ہے۔

حالانکہ بظاہر دیکھا جائے تو شوہر صاحب ایک اچھے انسان ہیں جو خود سے جڑے ہر شخص کو اہمیت دیتے ہیں مگر میں ان کی اس عادت کو بھی اپنے ہی



اعلانیہ بیان، اکثر ساتھ موجود دوسری خواتین کی آنکھوں میں حسد و رشک کے آنسو لا سکتا ہے جو مجھے بہت ہی اطمینان دیتا تھا کیونکہ مجھے اپنی قسمت پر ناز کرنا اچھا لگتا ہے...... قسمت...... نسل در نسل ہمارے گھر کی باندی رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری آنے والی نسلیں بھی میری ہی طرح قسمت کی دھنی ہوں گی۔

مگر ایک اس بات کے علاوہ بھی میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہوں...... اور وہ یہ کہ مجھے ملنے والا ہر انسان عورت یا مرد، بڑا چھوٹا جوان بوڑھا سب ہی مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں جو پیار نہیں کرتے وہ مجھ سے بے حد متاثر ہیں...... مجھے کبھی کسی سے توجہ یا محبت کی بھیک نہیں مانگنی پڑی سب کچھ مجھے خود بخود بطور حق ملتا چلا گیا۔ لہٰذا مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ جب کسی کو ایسے سب کچھ با آسانی نہیں مل پاتا یا ملنے کی امید ہو مگر اس پر ان کی غریبی، ٹوک لگا دے تو ان کے دل میں کیسے کیسے دکھ پلتے ہیں شاید ان کو اپنے بدقسمت ہونے پر یقین آجاتا ہو۔

مگر میرے خیال میں بدقسمتی کچھ نہیں ہوتی اور بدقسمت لوگ ہوتے ہی نہیں، میرا اٹل یقین ہے کہ لوگ بدقسمت نہیں بلکہ بزدل ہوتے ہیں دراصل ان سے اپنی خوشی کے لیے فیصلے نہیں لیے جاتے اور اس بات پر بھی یقین رکھتی ہوں کہ یہ لوگ جو خود کو کمزور، بدقسمت اور بدصورت سمجھتے ہیں وہ دراصل شدید قسم کی احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ خود کو حساس گردانتے ہیں ہر وقت اپنے ساتھ دوسروں کے رویوں کو جانچتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اگر یہ بھی کبھی کسی کے ساتھ برا کریں گے کسی کا حق ماریں گے۔

کسی پسندیدہ شخص کے اپنے ماں یا باپ کے فیصلوں کے خلاف جانے کا سبب بنیں گے تو ان کے ساتھ دنیا میں ہی بہت برا ہوگا۔ یہ ذلت کی موت سے

آگ ہوگی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ہر وقت کی اس خود بینی سے ان کا اپنا ہی اعتماد، عزت نفس اور انا سب تتر بتر ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی بچتی ہی کہاں ہے۔ ایسے لوگ ہر طرح کی خوشی، طمانیت اور محبت سے ہی نہیں بلکہ زندگی سے ہی دور ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر ترس کھاتے جانا، ہر وقت اپنے آپ کو دوسروں سے کمتر سمجھنا اور محفلوں میں کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھنا کہ کہیں ان کی معمولی شکل و صورت اور ظاہری حلیے کو دیکھ کر، محفل میں موجود حسن و تزئین کے متوالوں کی طبیعت مکدر نہ ہو جائے...... بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟

ارے یہ سب کیا تماشا ہے؟ ایسا کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے پاس پیسوں کی کمی ہے۔ اس بات کو مان کیوں نہیں لیتے کہ دنیا میں معیار صرف پیسہ ہی بناتا ہے انسان کا خوب صورت، دل نشین اور ہر دل عزیز ہو جانا صرف پیسہ ہی کا جادو ہے...... جس شخص پر نظر ڈالو، وہ تمہارا، جس طریقے سے زندگی گزارنا چاہو وہ ہی سیدھی راہ اور جہاں بھی رہنا چاہو لوگوں کے لیے معتبر...... یہ سب پیسے کے کمال ہیں پھر یہ اخلاق، تحمل، رواداری، وفاداری، محبت...... سب کچھ غریب لوگوں کے کرنے کے کام ہیں۔ پھر بھی ان کی قسمت میں اسی طرح کسمپرسی اور غربت میں مر جانا ہوتا ہے جیسے یہ مرحومہ...... میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑا......

ایک عجیب سی خلش نے دل میں سر اٹھایا، میرا دھیان مرنے والی پر گیا ہی تھا کہ بریانی کی خوشبو نے سارا دھیان اپنی طرف کروالیا۔ جیسے بھی حالات ہوں نیند اور بھوک برحق ہے اور یہ بات ماننے میں بھلا کیا قباحت ہے۔ میں نے جھٹ شوہر صاحب کو فقط ایک سوالیہ نشان میسیج کر دیا...... میرے میسیج کو کبھی اس طرح نظر انداز ہونے کی عادت نہیں تھی اور میں اس پر غور کر ہی رہی تھی کہ دو چار کزنز اور مرحومہ کے بھائیوں کے میسجز آگئے۔

چلو شکر ہے کہ یہ لوگ قبرستان سے نکل گئے

نے مجھے ایک بار پھر شوہر صاحب کے فیصلوں پر مطمئن کر دیا تھا انسان کا پیٹ کہاں بھرتا ہے۔ دنیا کا دستور ہی یہی ہے ایک وقت کا کھایا نہیں کہ دوسرے وقت کی فکر لگ جاتی ہے، لہٰذا بھابیوں کا قصور بالکل نہیں وہ دنیادار تھیں جیسے ہر غریب آدمی ہوتا ہے۔

بس یہ مرحومہ ہی عجیب عورت تھی...... میرے دل میں کسی خیال نے چٹکی لی...... بے انتہا سست، بے دل اور آدم بے زار سی...... جیسے دنیا میں زبردستی بھیج دی گئی ہو۔ شاید کچھ لوگ زبردستی ہی بھیجے جاتے ہیں مگر کچھ اس انداز سے زندگی گزارتے ہیں جیسے دنیا والوں پر اپنے ہونے سے احسان کر رہے ہوں......

عاجزی سے رہیں گے مگر کبھی بلاوجہ جھکیں گے نہیں، لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہیں گے مگر اپنی ذات کو راز رکھیں گے، ہنستے بولتے ہوئے بھی آنکھوں میں تیرتی نمی کو چھپتی ہوئی، اس عورت سے مل کر اکثر میں بے چین ہو جایا کرتی تھی۔

پتا نہیں کیسی کشش تھی۔ اس کی شخصیت کے ٹھہراؤ، مزاج کی نرمی اور چال ڈھال کے دھیمے پن میں...... جو میرے وجود کو میرے تمام تر اعتماد کے باوجود جھنجوڑ کر رکھ دیتی تھی۔

میں ہمیشہ فیصلہ کرتی تھی کہ اب کی بار شوہر صاحب اس کے گھر جانے کا کہیں گے تو میں صاف منع کر دوں گی۔ عجیب بدروح قسم کی عورت ہے، میں دل میں غصے سے سوچتی، یہ جو دھواں دھواں سا ہالہ اس کے اردگرد اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے۔ وہ دراصل بے انتہا کے صبر و برداشت کے حامل ہی کسی انسان کو گھیرتا ہے اور پھر یہ سب مجھے ہی کیوں نظر آتا تھا، جیسے وہ میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح آتی رہی بس مجھے ذرا لفظوں پر توجہ ہی تو دینی تھی مگر میں ڈر کر کبھی اس پر توجہ نہ دے سکی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسے لوگ بلا کے جادوگر ہوتے ہیں، یہ قابو کر لیتے ہیں دل، دماغ، جگر سب کی قربانی مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مٹی میں مل کر مٹی ہونا پڑتا ہے اور میں ایسا کیسے کر سکتی تھی میں تو ایک خوش نصیب اور

ہیں۔ پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگے گا۔ اس وقت تک دیگوں کو اچھی طرح سے کپڑوں میں لپیٹ کر رکھا جائے تو بریانی ٹھنڈی ہونے سے بچ جائے گی۔ ویسے بھی گرمی جتنی بھی ہو کھانے میں بریانی گرم گرم ہی اچھی لگتی ہے۔

میں نے اپنے اردگرد دیکھ کر سوگواران اور دیگر حاضر محفل کو جانچا...... سب ہی اپنی دھن میں سوچ بچار کر رہے تھے مگر بظاہر تلاوت، تسبیح یا دانے گننے میں مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بریانی کی خوشبو نے تو سب کی ہی بھوک چمکا دی ہو گی۔

شوہر صاحب نے میت کا سنتے ہی بریانی کا آرڈر شہر کے سب سے مہنگے پکوان گھر کو دے دیا تھا۔

ہاں بھئی، غریبوں کے جانے کا دکھ بھی کیا کرنا بلکہ میں تو یہ سوچ کر ہی بہت مطمئن ہو گئی کہ بے چاری کی مشکل آسان ہو گئی، ویسے بھی دنیا میں جہاں اب تک سکون نہ ملا آگے کون سا مل جانا تھا۔ شوہر صاحب کی مرنے والی سے دور کی رشتہ داری تھی اور وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو، اچھی طرح جانتے تھے پھر بھی شوہر صاحب نے جس قدر بردباری اور خاموشی سے مجھے شامل کیے بغیر یہ سارے فیصلے کیے تھے مجھے تھوڑا سا دھچکا تھا۔ جیسے شوہر صاحب کوئی چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

یوں تو میں ایسے معاملات میں ہمیشہ نابلد ہی رہنے میں عافیت سمجھتی ہوں مگر اگر شوہر صاحب، مجھ سے مشورہ کر لیتے تو میں ان کو بتاتی کہ غریب لوگوں کی میتوں، میں آنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی اور جو آتے ہیں وہ یا تو میت کے دفنائے جانے کے بعد آتے ہیں یا جلدی آ کر بھی قبرستان تک کم ہی جاتے ہیں۔

اب یہ جو تین چار دیگیں اور کئی قسم کی کٹلری آئی ہے سب بے کار جائے گی، اتنے سے تو لوگ تھے۔ پھر اس گھر میں کون سا فریج یا ڈیپ فریزر ہو گا کہ بچ رہنے والی بریانی کو محفوظ کیا جائے...... خیر دیگوں کو دیکھ کر مرحومہ کی بھابیوں کے چہرے سے ٹپکتی خوشی

جانے کا شوہر صاحب نے تذکرہ کیا مجھ سے انکار نہ ہوا۔

ویسے بھی رشتہ دار غریب ہوں تو امیر رشتہ داروں کا فرض ہے کہ وہ عام دنوں میں نہ سہی، کم از کم تہواروں میں ان کے گھر ضرور جائیں اور ہم ہر تہوار پر بلاناغہ اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کی ماں بھی حیات تھیں جو شوہر صاحب کی دور کی خالہ لگتی تھیں، ناچاہتے ہوئے بھی شاید کئی ایک بار میں نے شوہر صاحب کو ٹوکا تھا۔

"اتنا خالی ہاتھ تو ہم اپنے والدین سے ملنے بھی نہیں جاتے، اپنی اس کزن کے گھر جاتے ہوئے آپ اس طرح منہ اٹھا کر کیوں چل پڑتے ہیں۔"

شوہر صاحب نے کئی مہینوں میرے استفسار پر خاموشی کے بعد ایک دن اچانک جواب دیا تھا۔

"کیونکہ کچھ لوگوں کے لیے اللہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اس سے ملنے کی یہی شرط ہے۔"

اور ضروری تو نہیں کہ ہر راز، ہر انسان پر کھل ہی جائے اپنے ساتھی کے ماضی پر جو پردہ پڑا ہو تو بہت سوچ سمجھ کر، اٹھانے کی جسارت کرنی چاہیے کیونکہ کبھی کبھی لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں لہٰذا میں نے بھی اس معاملے میں دبی آگ کو بھی کریدا نہیں، ہاں یہ میری طرف سے، عقل مندی کا ہی اقدام رہا کہ کبھی شوہر صاحب کو اکیلے آنے نہ دیا تاکہ حدود جو قائم ہوئی ہیں وہ قائم ودائم ہی رہیں۔ پھر شوہر صاحب کی دور کی اس خالہ یعنی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور بقول شوہر صاحب اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا غنی کر دیا کہ سال بھر میں ایک یا دو ملاقات سے بھی ہاتھ دھولیا گیا۔

پھر بھی ایک پتھر تھا جو میرے سینے پر دھرا تھا۔ اکثر شوہر صاحب بے دھیانی میں کسی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو میں ان کے پورے پیرائے ــ پر غور کرتی...... ہزار ہا قسم کی فکریں مجھے گھیر لیتیں اور میں بے چین ہو کر ان کو زبردستی خود پر متوجہ کرتی۔

لاحق ہو گیا ہے مگر پھر بھی جاتے جاتے چار سال تو نکال ہی لیے مرحومہ نے...... ان چار سالوں میں کوئی تین یا چار بار ہی تو ملاقات ہوئی ہوگی۔ مگر پھر بھی مرحومہ کے جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے کتنی صدیوں کی دشمنی تھی۔ اس سے چھٹکارے کی کتنی ہی دیرینہ خواہش میرے دل میں دبی تھی، پتا نہیں اس کی جگہ اگر میں چلی جاتی تو وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی...... شاید ایسی ہی سرشاری ایسی ہی خوشی جیسے کوئی بہت بڑا بھاری وزنی پتھر دل پر سے ہٹ گیا ہو۔

ظاہر ہے، صاف کھلے راستے کی رکاوٹ کون انسان برداشت کر سکتا ہے۔ اب رکاوٹ کون تھا؟ میں یا وہ؟ یہ فیصلہ تو وقت نے کرنا تھا جو میری خوش قسمتی کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے ہی حق میں کر چکا تھا۔

میں نے دروازے سے باہر جھانکا...... مردوں کے لیے لگایا گیا خوب صورت ٹینٹ، زمین پر بچھایا گیا صاف ستھرا سبز قالین اور اس پر ایک ترتیب سے رکھی گئی دیدہ زیب پلاسٹک کی آرام دہ کرسیاں اور ہلکے رنگ کے میز پوش سے ڈھکی گول میزیں...... اس غریب و پرانے طرز کے بوسیدہ علاقے کے گرد و نواح سے بالکل ہی الگ تھلگ سا منظر پیش کر رہی تھیں جیسے کسی نے جادو سے یہ سب یہاں لا رکھا ہو......

دل پر ایک سایہ سا لہرایا اور جب اپنے پیچھے گھومتی پھرتی عورتوں میں سے کسی نے آخری رسوم، میت کا گھر، مرنے والی کے نام کے جیسے کچھ ملے جلے الفاظ دہرائے تو سایہ ایک دم رخصت ہو گیا اور اس کی جگہ بھوک نے پھر ڈیرا جما لیا۔

امیر رشتہ داروں کا فرض ہے کہ غریب رشتہ دار کے ہر دکھ درد میں شریک ہوں...... میں پلٹنے ہی والی تھی کہ ٹینٹ میں مرد داخل ہوتے دکھائی دیے اور دوسری طرف بیروں کی فوج نے تیزی سے گھوم پھر کر ٹینٹ میں کھانا لگانے کے انتظامات شروع کر دیے۔ مجھے دروازے پر کھڑا دیکھ کر کئی ایک رشتہ دار مرد مسکراتے ہوئے میری طرف آ گئے۔

"آپ لوگوں کا بہت احسان ہے ورنہ یہ بے چارے اتنا کہاں کر پاتے......"

"بس اس کا اجر تو اللہ ہی دے گا......"

"یہ بچارے تو بس شکریہ بھی نہ کہہ سکیں۔"

مجھے طرح طرح سے سب بہلانے لگے...... جبکہ میری نظریں شوہر صاحب کو ڈھونڈتی رہیں...... کھانا لگتے ہی خواتین میں سب سے پہلے مجھے اطلاع دی گئی اور بہت اہتمام اور نفاست سے میرے دستر خوان پر بیٹھتے ہی کھانا چن دیا گیا۔

خواتین میں بیروں کو آنے کی اجازت نہیں ملی تھی اور پھر ویسے بھی خواتین میں کوئی بھی قریبی سوگوار نہ تھا۔ دو بھابیاں تھیں جو میت کے اٹھتے ہی اپنی ماں بہنوں کو لے کر الگ الگ گروپ بنا کر بیٹھ گئی تھیں اور اب کھانا لگنے، پر دستر خوان پر بہت شد و مد سے اپنی پلیٹیں بھرنے کے ساتھ ساتھ بریانی کی ٹرے کو اپنی جان پہچان کی خواتین کے درمیان گھما رہی تھیں۔ ٹرے پھیر کر لانے، گرم بریانی جیسی آوازیں گردش کر رہی تھیں، کوئی میزبان تھا اور کوئی مہمان بھی نہ تھا۔ غم کس کو تھا کہ اسے بہلا پھسلا کر دستر خوان پر لایا جاتا اور اس کے پہلے نوالہ لینے کا انتظار ہی کیا جاتا۔

سب ہی خواتین مزے دار بریانی کے بڑے بڑے لقمے بھر رہی تھیں اور جھوٹ کیوں بولوں میں بھی ان میں شامل تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی مجھے شوہر صاحب کا بلاوا آ گیا اور میری جان میں جان آئی کیونکہ کھانے کے بعد اب بے حد نیند آ رہی تھی اور جون کی لمبی دوپہر ابھی مکمل ڈھلی نہیں تھی، لہٰذا گھر جا کر دوپہر کا قیلولہ کا ابھی بھی وقت تھا۔

میں نے جلدی میں مرحومہ کی بھابیوں سے چند الوداعی کلمات کہے اور باہر نکل آئی تو شوہر صاحب کے چہرے پر نظر پڑتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا ہوا ان کو؟ صبح تک ٹھیک ہی تھے...... مگر اب یہ جو چہرہ ہے اس کے ارد گرد دھواں دھواں سا کیوں لگ رہا ہے جیسے کسی بڑے صدمے نے ہالہ بنا دیا ہو...... شاید گرمی کی شدت برداشت نہ ہوئی ہو......

میں نے ایک بار پھر خود کو بہلایا۔ واپسی کے سفر کے دوران ہماری جدید گاڑی کے تیز اے سی نے دن بھر کی کھائی گرمی کا دکھ یک دم مٹا دیا میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر، آنکھ لگانے کا سوچا ہی تھا کہ شوہر صاحب گمبھیر آواز میں گویا ہوئے۔

"مانا کہ بیمار تھی مگر مرنے کے بعد اتنی ہلکی ہو گئی تھی کہ کندھا دیتے ہوئے بالکل لگ رہا تھا جیسے ہم میت کے بغیر ہی چل رہے ہیں...... جب ہمارے بوڑھے چچا نے اپنی باری پر کندھا دیا تو کچھ اس طرح کلمہ پڑھنے لگے کہ سب کو وزن کے نہ ہونے کا احساس دلایا دیا اس کے دونوں بھائی جو آگے تھے وہ بھی رونے لگے مجھ سے بھی برداشت نہ ہو سکا......"

میں نے گمشدہ وزن ایک بار پھر اپنے سینے پر محسوس کر کے بے چینی سے پہلو بدلا مگر شوہر صاحب اپنی دھن میں بولے جا رہے تھے۔ وہ بچارے بھی کیا کرتے ان کو کہیں تو بولنا ہی تھا کسی سے تو دکھ بانٹنا ہی تھا مگر شاید وہ یہ بھول رہے تھے کہ میں ان کی جیون ساتھی بھی ان کے اس دکھ کو بانٹنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی......اور نہ ہی خود کو تیار کر سکوں گی۔

"ہم دونوں کی عمر میں خاص فرق نہیں اور ہمیشہ سے دوستی بے انتہا تھی...... وہ مجھے سمجھتی تھی ہمیشہ سے ہی...... مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ...... وہ......"

شوہر صاحب اس لمحے مجھ سے پوچھے بغیر ماضی کے پردوں کو اٹھانے پر تل گئے تھے مگر میں چاہ کر بھی بے انتہا کے تجسس کے باوجود اس سے آگے سن نہیں سکتی تھی اور ان کو دکھ کی دنیا سے اس دنیا میں واپس لانے کے لیے ٹوک بیٹھی......

"آپ کو یاد ہے ناں آپ نے ہی تو کہا تھا کہ کچھ لوگوں کے لیے اللہ کافی ہوتا ہے...... وہ ہلکی پھلکی اس لیے بھی کہ وہ اپنا سارا بوجھ یہیں اتار گئی۔ جیسے زندگی میں اسے صرف اللہ ہی کافی تھا وہاں ساتھ لے جانے کے لیے بھی اسے صرف اللہ ہی کافی تھا اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اس کی یہ خواہش ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔"

☆☆

نمرہ احمد

مالا

مکمل ناول

اڑتیسویں قسط

"درست۔ ہر انسان آزاد ہے۔ جس کی جو مرضی آئے وہ کرے۔"

بیربل پھیکا سا مسکرایا۔ پھر کھنکھارا۔ باری باری سب کو دیکھا۔

"میں آپ لوگوں سے کچھ بات کرنا..."

ماہر کا فون بجنے لگا تو اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ فون کان سے لگایا۔ ہوں، ہاں، میں آ رہا ہوں، جیسے مبہم الفاظ کہے۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ابھی کہیں پہنچنا ہے۔ مگر تمہیں کچھ کہنا ہے؟" رک کے بیربل کو دیکھا۔ اس نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں ... کوئی بات نہیں۔ پھر سہی۔"

ماہر اس کے قریب سے گزر کے باہر نکل گیا۔ بیربل اب بھی اس سے نگاہ نہ ملا سکا تھا۔

زارینہ فرید خاموشی سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ ان تاثرات کو پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کس کا فون تھا۔ وہ اسے جب پکارے گی وہ جائے گا۔

☆☆☆

"کشمالہ؟ کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

انٹرکام میں آواز ابھری۔ مالا کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ سہارے کے لیے دیوار پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"میں اوپر نہیں آؤں گا نہ آنا چاہتا ہوں۔ ہم باہر کسی پبلک پلیس پہ بات کر سکتے ہیں۔ ساری دنیا کے درمیان۔" اس کی آواز میں تھکان تھی۔

"مجھے بدر کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

وہ بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی۔

"کہاں؟"

"یہاں قریب میں ایک کیفے ہے، نارنجی موٹر سائیکل والا۔ اس کے"...

"وہاں نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ وہ زیاد سلطان سے اس جگہ مل کے اس کیفے کو ہمیشہ کے لیے آلودہ نہیں کر سکتی تھی۔

"اس کے سامنے ایک کباب شاپ ہے۔ وہاں آجاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔" وہ رکا۔ "تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اب کسی کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

آواز خاموش ہو گئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ بے یقین۔ شل۔ پھر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ وہ گلی میں دور چلتا جا رہا تھا۔ رخ متعین گروہ کباب شاپ کی جانب تھا۔ گردن جھکی اور چال سست تھی۔

پھر اس نے موبائل اٹھایا۔ انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ماہر کے نمبر پہ انگلی رکھی۔

("میں نے جو کہا ہے وہ میں کروں گا۔" مالک فرید کی آواز سماعت میں گونجی۔ "اگر زیاد نے ماہر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کی جان لے لوں گا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ تمہارے بچے کا باپ ہے۔")

مالا نے جھرجھری لی۔ اسے ماہر کو اس سب میں ملوث نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ اس کی جنگ تھی۔ اسے خود لڑنی تھی۔

☆☆☆

نارنجی موٹرسائیکل اور پھولوں سے سجا ٹیفے معمول کی طرح پر رونق تھا۔اس کے سامنے ایک کباب ریستوران تھا۔فاصلہ اتنا نہ تھا لیکن ہر قدم بھاری تھا۔ ہر سانس بوجھل تھی۔وہ کتنی ہی دیر ریستوران کے دہانے پہ کھڑی رہی۔ گہرے سانس لیتی تنفس نارمل کرتی رہی۔لمبا بھورا کوٹ پہنے، سر پہ اونی ٹوپی جمائے وہ ایک ہاتھ سینے پہ رکھے ہوئے تھی۔دھڑکن بے قابو تھی۔

اسے لگا تھا اب وہ اس سے نہیں ڈرتی تھی۔لیکن وہ نڈر پن جو اتنے برسوں سے زیاد سلطان کے سلاخوں کے پیچھے ہونے کے باعث اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا وہ غائب ہو چکا تھا۔

ریستوران اوپن ائیر تھا۔کھڑکیوں کے نام پہ بڑے بڑے چوکھٹے بنے تھے جن سے بوسفورس کا پانی دکھائی دیتا تھا۔چھت ندارد تھی۔البتہ ٹھنڈ کے باعث چھت کی جگہ پلاسٹک کی شفاف شیٹ ڈالی گئی تھی جو لٹک کے کھڑکیوں کو بھی ڈھانکے ہوئے تھی۔شیٹ مسلسل استعمال سے قدرے گدلی ہوئی تھی اور باہر کا منظر دھندلا دکھا رہی تھی۔

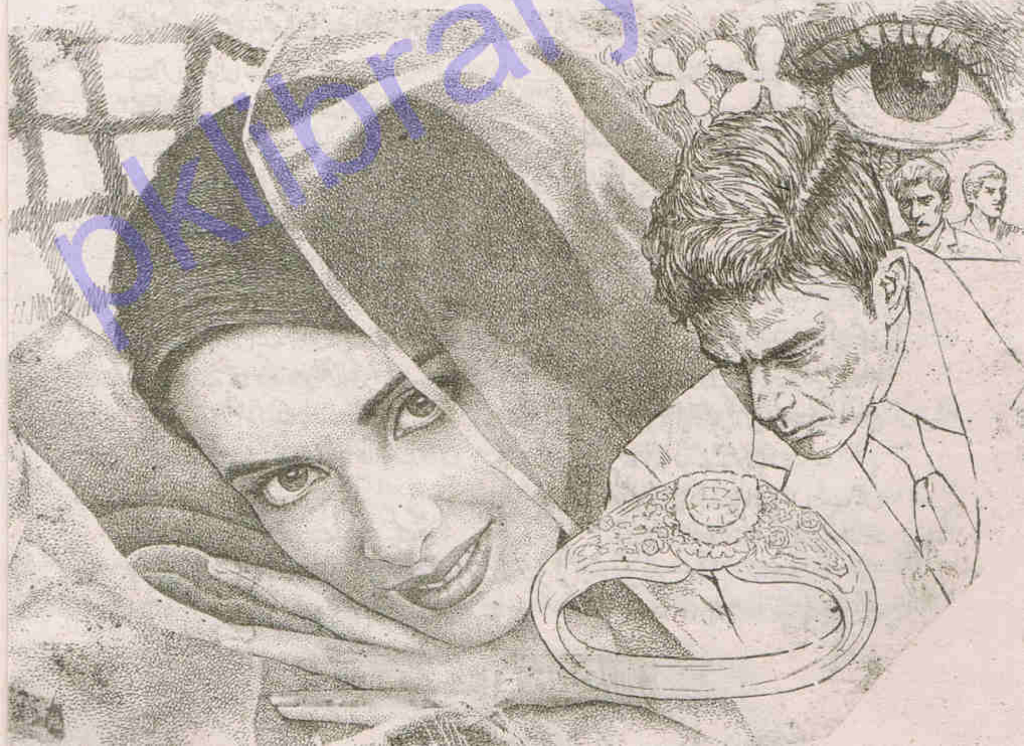
دروازے کی جگہ بھی شیٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔مالا نے اسے اٹھا کے دیکھا تو منظر واضح ہوا۔

دور ایک کھڑکی کے ساتھ میز پر زیاد سلطان موجود تھا۔مالا اندر آئی۔شیٹ چھوڑ دی۔وہ کھڑکتی ہوئی لہرا کے نیچے آن گری۔

اب وہ اس پلاسٹک کی دیواروں والے ڈھابے نما ریستوران میں قید تھی۔

زیاد اسے دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔درمیان میں چند میزیں تھیں۔اور لکڑی کے ستون جن کو بنانے کی ضرورت نہ تھی کہ انہوں نے کسی چھت کو سہارا نہ دے رکھا تھا۔دو تین انگیٹھیاں راستے میں رکھی تھیں۔ان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ان کی وجہ سے اندر کا موسم نسبتاً گرم تھا۔

وہ ویسا ہی تھا۔یا شاید نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی۔ پہلے سے دبلا چہرہ۔آنکھوں تلے حلقے۔ایک



تھکا ہارا انسان۔ اسے دیکھ کے سر جھکا دیا۔

وہ خوف جو زیاد کی آواز سننے سے یہاں آنے تک اس کے دل کو جکڑے ہوئے تھا وہ ایک دم زائل سا ہو گیا۔

یہ تو ایک شکست خوردہ مرد تھا۔ ایک انسان کی پرچھائیں۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی؟

دھڑکن خود بخود ہموار ہو گئی۔ اور تنفس نارمل۔ وہ تیز تیز چلتی میز تک آئی۔

"میرے پاس تمہارے لیے صرف پندرہ منٹ ہیں۔ جو کہنا ہے اسی میں کہو۔" وہ سامنے بیٹھی۔ کوٹ کا بٹن بھی نہیں کھولا۔ نہ بیگ کندھے سے اتارا۔ گردن سیدھی رکھی اور چہرہ سپاٹ۔

زیاد نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

"کیسی ہو؟"

"تم یہ سوال نہیں پوچھ سکتے۔ تم نے مجھے بدر کے لیے بلایا ہے۔ اس کے بارے میں بتاؤ۔"

زیاد نے گردن جھکا دی۔

"ہمارا بیٹا..."

"میرا بیٹا۔ وہ صرف میرا بیٹا ہے کیونکہ تم تو اپنی طرف سے اس کی جان لے چکے تھے۔"

"میں اسی لیے اس کو دنیا میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا میرے گناہ اس کا تعاقب کرتے رہیں گے۔" وہ زخمی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آواز ہلکی تھی۔ اور چہرے پہ تاریکی۔

"تمہارے گناہ ہم سب کا پیچھا کرتے رہیں گے، زیاد!"

میز پہ رکھے گلدان کے پھول ایک دم مرجھا گئے تھے۔ گردن جھکائے کسی سوگوار مریض کی طرح۔

"کیا جانتے ہو تم بدر کے بارے میں؟"

"کسی نے مجھے جیل میں خط لکھا تھا... کہ وہ اس کے پاس ہے۔"

وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اسے دیکھے گئی۔

"وہ ایک پرانا دشمن ہے۔ اور وہ کوئی چال چل رہا ہے۔" وہ اسی پست آواز میں کہہ رہا تھا۔ "شاید بدر اس کے پاس ہے۔ شاید نہیں۔ میں اس شخص کا اعتبار نہیں کر سکتا۔ وہ بہت شاطر اور مکار ہے۔"

زیاد نے نفی میں سر ہلایا جیسے اس سے زیادہ خود کو یقین دلا رہا ہو۔ "بدر اس کے پاس نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں مزید پھنسا سکتا ہے۔ تم...."

"کون ہے وہ؟"

"عالیان۔"

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ کھڑکیوں پہ لگی شیٹ کھڑکتی ہوئی اونچی اٹھی اور واپس گر گئی۔

"کون عالیان؟"

"کبیرہ بیگم کا بیٹا۔ وہ بھی میری ماں کے پاس قید تھا۔" اس نے نگاہیں جھکا دیں۔

"ہلال کی طرح؟"

زیاد نے سر جھکائے گردن ہلائی۔

"اور اب وہ نیا سرکار بن چکا ہے؟"

"میں نے سنا ہے وہ ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن وہ خطرناک آدمی ہے۔ تمہیں اس سے احتیاط کرنی ہوگی۔"

"اور تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کب سے ہو گئی، زیاد؟"

"کشمالہ!" وہ اسے دیکھ کے رہ گیا۔ "میں بدر کو ڈھونڈ لوں گا۔ اس کا ڈھونڈنا میرے گناہوں کا کفارہ ہے میرے لیے۔"

وہ ان ہی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"میں صرف ایک ماہ یہاں ہوں۔ ایک اسائنمنٹ پہ۔ تب تک اسے تلاش کر لوں گا۔ عالیان سے بھی میں نمٹ لوں گا۔ میں تمہیں ہمارا ..... تمہارا بیٹا واپس دے کر ہی جاؤں گا۔ اور جب جاؤں گا تو پلٹ کے کبھی نہیں آؤں گا۔ تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی اور وہ بولتا رہا۔

"میں وہ انسان نہیں ہوں جو جیل گیا تھا۔ اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں سے مارنے کا بوجھ بہت بڑا ہوتا ہے، چاہے ماں نگینہ سلطان ہی کیوں نہ ہو۔ اس بوجھ نے مجھ

سے بہت سے کام چھڑوا دیے۔ میری زندگی میری سب سے بڑی سزا ہے۔ مجھے ایک طویل عمر اب خود اپنے پچھتاووں کے ساتھ گزارنی ہے۔ عمر قید۔ میں تمہیں یہاں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میں بدر کو تمہیں واپس لا دوں گا۔"

ایک بیرا انگیٹھیوں کے درمیان سے گزرتا ان تک آیا۔ آرڈر کا پوچھنے لگا کہ مالا نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔ وہ منہ بنائے واپس پلٹ گیا۔

"یعنی تم بدل گئے ہو؟"

"پتا نہیں، کشمالہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "مگر میں ان کاموں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔" پھر چہرے پہ ایک رمق سی ابھری۔ "میں اپنی کتاب لکھ رہا ہوں۔ بس وہی میرا کفارہ ہے۔"

پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک دم کشمالہ کے سارے اعصاب تن گئے۔

لیکن ہاتھ جب واپس آیا تو اس میں ایک خط کا لفافہ تھا نہ کہ پستول۔ مالا کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔

"میں نے کبھی تمہیں چائلڈ سپورٹ پے نہیں کی کیونکہ تمہیں میری کمائی نہیں چاہیے تھی۔"

اس نے لفافہ مالا کے سامنے رکھا۔

"یہ وہ پیسے ہیں جو مجھے تمہیں دینے چاہیے تھے۔ بدر کے لیے۔"

مالا نے چبھتی نظروں سے لفافے کو دیکھا، پھر اسے۔

"یہ میری بلڈ منی سے نہیں ہیں۔ میں نے لاہور والا گھر بیچ دیا ہے۔ یہ اس کے پیسے ہیں۔"

کشمالہ نے سینے پہ بندھے بازو کھولے۔ دو انگلیاں اس لفافے پہ جمائیں۔

"اس گھر کی دیواروں میں تمہاری ماں کے کالے دھاگوں کی گرہیں بندھی ہیں، زیاد!" انگلیوں سے اسے زیاد کی طرف واپس دھکیلا۔

"تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں یہ پیسے لوں گی؟" زیاد کی گردن مزید ڈھلک گئی۔

"کیا تم مجھے کسی طرح کفارہ نہیں ادا کرنے دو گی؟"

وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"کفارہ؟ گناہوں کی سزا؟ میں بدل گیا ہوں؟ ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے تمہارے ایک لفظ پہ بھی اعتبار نہیں ہے۔ یہ سب تمہارا کوئی نیا فریب ہے۔ مجھ سے دور رہو زیاد۔ دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

کرسی دھکیل کے وہ کھڑی ہوئی۔ ابھی آگے بڑھی تھی کہ وہ پیچھے سے پکار اٹھا۔

"کیا تم مجھے کبھی معاف کر سکو گی؟"

وہ کوئلوں کی دہکتی انگیٹھی کے ساتھ رک گئی۔ دھواں اٹھ اٹھ کے فضا میں گم ہو رہا تھا۔

"خدا بھی انسان کو معاف کر دیتا ہے، کشمالہ! پھر انسان کیوں نہیں معاف کر سکتا؟ جانتا ہوں میرے گناہ بہت بڑے ہیں۔ لیکن کیا تم کبھی مجھے معاف کر پاؤ گی؟ میں قسم کھاتا ہوں میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنی ماں کی معافی بھی نہیں ملے گی۔ لیکن کیا تم ..." اس کی رندھی ہوئی آواز ٹوٹ گئی۔

مالا نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ وہ ہوا سے کھڑکتی پلاسٹک کی کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نم

ہیں۔
"جو تم نے میرے ساتھ کیا اس کی کوئی معافی نہیں ہے، زیاد! دور رہو مجھ سے۔"
اور انگیٹھی کے ایک طرف سے نکل کے آگے بڑھ گئی۔ شیٹ کا پردہ ہٹایا۔ ٹھنڈی ہوا نے سڑک پہ اس کا استقبال کیا۔ وہ اب مزید قید نہیں تھی۔ وہ رہا ہو چکی تھی۔
سڑک پہ چلتے ہوئے وہ بار بار پیچھے پلٹ کے دیکھ رہی تھی۔ وہ دھندلی شیٹ کے پار وہیں بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ البتہ اپارٹمنٹ پہنچتے ہوئے اس کا سانس پھول چکا تھا۔
کوٹ اتارنے سے پہلے اس نے موبائل نکالا اور اس نمبر پہ انگلی رکھ دی۔
جب یہ طے تھا کہ وہ اسے سب بتائے گی تو وہ اسے سب بتائے گی۔ مالک فرید کو اچھا لگے یا برا۔
"ہیلو؟" سرسری سے ہیلو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان بیٹھا ہے۔
"زیاد میرے اپارٹمنٹ آیا تھا۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بس اتنا کہا۔
ماہر نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "ہوں... ہاں.... میں آرہا ہوں۔"
جب تک اس نے کوٹ اتارا ماہر کا میسج موصول ہوا۔
"دروازہ لاک کرو۔ باہر مت نکلنا۔ میرا ای ٹی اے چودہ منٹ ہے۔"
اس نے بھیگی آنکھوں سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ایک تحفظ کا احساس ہر شے پہ غالب آگیا۔

☆☆☆

دھپ سے کسی نے میز پر کتاب رکھی تو وہ اچھلا۔ ایک کان سے ہینڈز فری پھسلا اور فرش پہ لڑھک گیا۔ وہ جلدی سے جھکا۔ ہینڈز فری اٹھایا۔ پھر سیدھا ہوا تو دیکھا سامنے زرد رنگت اور بھورے بالوں والی لائبریرین اس کو گھور رہی تھی۔
"ایک گھنٹے سے تیرہ کتابیں لے کر بیٹھے ہو اور ابھی تک ...." میز پہ پھیلی کتابوں کی گنتی کی۔ "چار کا ڈیٹا بھی انٹر نہیں ہوا۔"
"کررہا ہوں میم۔ کررہا ہوں۔" اس نے لیپ ٹاپ اسکرین فولڈ کردی اور جلدی سے کتابیں ترتیب سے رکھنے لگا۔
"بہت سست ہو تم۔ اگر یہی حال رہا تو میں جلد تمہاری ری پلیسمنٹ تلاش کرلوں گی۔" گھور کے اسے دیکھتی وہ پلٹ گئی۔
"سوری میم۔ مجھے اس جاب کی ضرورت ہے۔ آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔"
"دیکھیں گے۔" اس نے پلٹے بغیر ہاتھ جھلا دیا۔
سنہری بالوں والے نوجوان نے سر جھکائے کتابیں سمیٹیں۔ پھر واپس بیٹھا۔ سویٹ پینٹس، ہڈی اور اسنیکرز میں ملبوس آنکھوں پہ عینک لگائے، اس کے بال روکھے پھیکے سے ماتھے پہ بکھرے تھے۔
لائبریرین کے دور جاتے ہی اس کے نادم تاثرات سپاٹ ہوگئے۔ اسکرین واپس کھولی۔ سامنے لائبریری کا پورٹل کھلا تھا جس میں اسے ایک ایک کر کے تمام کتابوں کا اندراج کرنا تھا۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ ونڈو بند کی اور ایک دوسری ونڈو کھولی۔ سیاہ اسکرین۔ اس پہ میسجز کی قطار۔ ساتھ ہی ہینڈز فری کان میں دبایا۔
"تم لائن پہ ہو؟" چہرے پہ مٹھی رکھے اتنی آہستہ آواز میں بولا کہ اس کے فرشتوں اور جنات دونوں کو سنائی نہ دی ہوگی۔
"ظاہر ہے۔" اندرانی کی بےزار آواز گونجی۔ "تم نے ہمیں پھنسا دیا ہے، عالیان! پولیس کے پاس تمہارا اسکیچ ہے۔"
"اس اسکیچ سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"
"مگر...."
"زیاد شہر میں آگیا ہے۔"
اندرانی کچھ بول نہ سکی۔
"کیا اس نے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟"
"وہی دیکھ رہا ہوں۔ نئے میسجز میں اس کا کوئی میسج نہیں ہے۔"
"اتنا عرصہ جیل میں رہا ہے وہ۔ اس کو کیا معلوم

کہ تمہارے ساتھ انٹرنیٹ پہ کیسے رابطہ کرنا ہے۔"

"میں نے اسے خط پہنچایا تھا اندرانی، کہ اس کا بیٹا میرے پاس ہے۔ اسے مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔" ابرو اکٹھے کیے وہ قدرے جھنجھلایا ہوا تھا۔ عینک میں اسکرین کا عکس جھلک رہا تھا۔ ٹچ پیڈ پہ انگلی پھیرتا وہ میسجز نیچے کیے جا رہا تھا۔ یہ عام عوام کے میسج تھے۔ جہاں جہاں تک اس گمنام جادوگر کی خبر پھیلتی وہاں سے میسج آنے لگتے۔ کسی کو کسی کی خوشیوں سے حسد تھا، کسی کو اپنے لیے دنیا کمانی تھی اور کسی کو محبت حاصل کرنی تھی۔ ہر میسج کرنے والا اس شخص کا ریفرنس ضرور دیتا تھا جس نے اسے سرکار کے پاس بھیجا ہوتا تھا۔ وہ ریفرنس شدہ شخص کے نام سے بتا سکتا تھا کہ کون زندگی میں کتنا آگے تھا۔ کتنا پڑھا لکھا تھا۔ کتنی دنیا خرید چکا تھا۔ اور اسے ایسے ہی کلائنٹس چاہیے تھے جن کے لیے پیسہ مسئلہ نہ ہو۔ وہ یونہی ہر کلائنٹ نہیں لیتا تھا۔ بے زاری سے وہ فالتو میسجز کو آرکائیو کرتا جا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا، عالیان! یہ بچے والا کھیل نہ کھیلو۔ ہم زیادہ دشمنی نہیں مول لے سکتے۔"

"ریلیکس۔ سب ٹھیک جا رہا ہے۔"

"جو کرنا ہے جلدی کرو۔ ہمیں اس بچے والے معاملے سے نکلنا ہے، عالیان۔"

عالیان نے کال کاٹ دی۔ پھر ٹیک لگائی۔ انگلیاں مروڑتے ہوئے انگڑائی لی۔ دائیں بائیں فرصت سے دیکھا۔ دور دور تک کتابوں کے ریک تھے۔ لکڑی کا فرش۔ مدھم روشنی۔ پرسکون خاموشی۔ اردگرد کی تمام میزیں خالی تھیں۔ اس نے چہرہ دوبارہ اسکرین پہ جھکایا اور دونڈو اسکرول کرنے لگا۔

دفعتاً وہ ٹھہرا۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ تیزی سے اندرانی کو دوبارہ کال ملائی۔

"اسکرین شیئر کر رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔ کس کا میسج آیا ہے۔"

"دکھاؤ۔" اندرانی کی چونکی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے "ہا" نکلا۔

"دنیا گول ہے، عالیان!" وہ بس اتنا کہہ سکی۔

عالیان نے جواب نہیں دیا۔ وہ منہ پہ مٹھی رکھے آنکھیں چھوٹی کیے اس میسج کو گھورے گیا۔

"میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔ میری ایک دوست نے آپ سے کام کروایا تھا۔ (ریفرنس کا نام بھی درج تھا۔) اور اس کی باتوں سے میں بھی آپ کی اور آپ کے جدید طریقوں کی معتقد ہو گئی ہوں۔ مجھے ایک رشتے دار پہ جادو کروانا ہے۔ ایسا عمل جس سے اس کی دنیا جل کے راکھ ہو جائے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟

کبیرہ سیادان۔"

"اس کا میسج ڈیلیٹ کر دو۔ ہم نے اس کے قریب بھی نہیں جانا۔" اندرانی کی آواز اس کے کان میں گونج رہی تھی۔ لیکن وہ اسکرین کو دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا یہ جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟"

"ناممکن۔ میں کہہ رہی ہوں اس کو ڈیلیٹ..."

مگر اس کی انگلیاں ٹائپ کر رہی تھیں اور اندرانی دم سادھے اپنے موبائل پہ نظر آتے اس کے الفاظ پڑھ رہی تھی جو شیئر شدہ اسکرین کی وجہ سے اس کو دکھائی دے رہے تھے۔

"میں آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ مجھے آپ کے دشمن کا نام، ایڈریس اور تصویر چاہیے۔"

"عالیان، کیا کر رہے ہو؟" اندرانی کا احتجاج مدھم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی کیز دباتی انگلیوں کی آواز غالب آ گئی تھی۔

☆☆☆

کال بیل نہیں بجی۔ نچلا دروازہ شاید کھلا تھا۔ ماہر سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آیا اور ٹھک ٹھک ہاتھ کی پشت سے دروازہ بجایا۔ وہ جو لونگ روم میں دائیں بائیں ٹہل رہی تھی بھاگ کے دروازے تک آئی۔

"تم ٹھیک ہو؟" چوکھٹ میں کھڑے ماہر نے پہلے اسے، پھر گردن اٹھا کر اس کے پیچھے دیکھا۔

مالا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور راستہ چھوڑ دیا۔ وہ چند قدم اندر آیا پھر زمین پر پھیلی سبزیوں کو

رک گئے۔

"کیا اس نے اندر آنے کی کوشش کی؟"

"اوہ نہیں۔ سوری۔ یہ مجھ سے ہوا تھا۔ سمیٹنا بھول گئی۔" وہ آگے بڑھی لیکن وہ اس سے پہلے جھک گیا اور گرے ہوئے سبز پتے اٹھانے لگا۔

"اس نے کہا اسے بدر کے بارے میں بات کرنی ہے۔ میں نے اسے کباب شاپ پہ بلایا تھا۔ وہاں ملی میں اس سے۔"

"میں نے کہا تھا باہر مت نکلنا۔" ماہر نے گردن اٹھا کے افسوس سے اسے دیکھا۔

"میں نے تمہیں کال اس سے ملاقات کے بعد کی تھی، ماہر! مجھے اس کا سامنا کرنا تھا۔ میں اس سے نہیں ڈرتی۔"

ماہر سبزی سمیٹ کے سیدھا ہوا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی انگلی پر فاختہ والا نیکلیس لپیٹ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے بار بار کانوں کے پیچھے بال اڑستی۔

"دکھائی دے رہا ہے۔ کیا کہا اس نے؟"

اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ماہر نے کوٹ نہیں اتارا۔ گویا رکنے کا ارادہ نہ تھا۔

"یہی کہ وہ بدل گیا ہے، معافی مانگی، مجھے پیسے دینے کی کوشش کی، اور یہ کہ عالیان جو کہ کبیرہ تائی کا بیٹا تھا، اس کی ماں کے پاس قید تھا اور اب وہ نیا سرکار بن چکا ہے..." وہ کسی روبوٹ کی طرح بولتی ساری روداد سنا گئی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پلکوں کی لرزش کو۔ اس کی انگلیوں کو جو نیکلیس کی زنجیر کو گول گول لپیٹ رہی تھیں۔

"اس نے کہا وہ خود کو بدل رہا ہے۔ کیا وہ واقعی بدل سکتا ہے؟" اس کی آنکھوں میں امید بھری ہچکچاہٹ تھی۔

ماہر فرید تلخی سے مسکرایا۔ نگاہ گھما کے ہر کونے میں رکھے سرسبز پودوں کو دیکھا۔

"انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتے، مالا! زیاد سلطان بھی کبھی نہیں بدلے گا۔"

"جانتی تھی۔" سر جھٹکا۔ تلخی سے۔ ایک امید سی بندھی تھی۔ وہ بدر کا باپ تھا۔ اگر کبھی وہ ایک اچھا انسان بن جائے تو کل کو بدر... مگر نہیں۔

"اس نے کہا وہ بدر کو ڈھونڈنے میں مدد....."

"تمہارا بیٹا اسی کے پاس ہے۔"

مالا چہرہ اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

ماہر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"جانتا ہوں۔ تم نہیں مانو گی مگر مجھے ایسے مت دیکھو۔ یہ سب زیاد نے..."

"تم اس کا نام کیوں نہیں لیتے؟"

وہ بولتے بولتے ٹھہر گیا۔ الفاظ ایک دم ذہن سے خطا ہو گئے۔

"اسے ہمیشہ "تمہارا بیٹا" کہتے ہو۔ اس کا نام بدر ہے۔ بدر۔" پھر مالا کی آنکھوں میں زخمی سا تاثر ابھرا۔ "یا شاید اس لیے کہ اس کا پورا نام بدر زیاد سلطان ہے۔ تمہارے لیے وہ ہمیشہ زیاد کا بیٹا رہے گا۔"

وہ چند لمحے اس کی زخمی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر گردن گھما کے دائیں بائیں دیکھا۔

"ایک کمرہ ہے اپارٹمنٹ میں؟"

"ہاں۔" اس کا انداز دفاعی تھا۔

"کمرے میں کتنی الماریاں ہیں؟"

"ایک مگر...."

"گڈ۔ کتنی دیر میں اپنا سامان پیک کر لوگی؟"

"سامان؟ کیوں؟"

"کیونکہ تم یہاں نہیں رہو گی۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔ میں نے تمہارے لیے ایک دوسری جگہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ اور..." انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی۔ "میں پوچھ نہیں رہا۔ بتا رہا ہوں۔"

"مگر میں نے دو ماہ کا کرایہ دیا ہوا ہے۔"

"کتنے ملین؟"

مالا کے کندھے خفگی اور شرمندگی سے ڈھلک گئے۔

"وہ مجھے ہر جگہ تلاش کر لے گا۔" جتا کے یاد دلایا۔

خود کرلوگی؟"

"تمہیں سامان پیک کرنا آتا ہے؟ میں سمجھی تمہارے ملازم یہ کام کرتے ہوں گے۔"

"ٹیکنیکلی تم بھی میری ملازمت کرتی ہو، سو خود کرلوگی۔ گڈ۔ میں ادھر انتظار کررہا ہوں۔ یہ ٹی وی چلتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ چیخ کے کہتی آگے بڑھ گئی۔ ماہر نے لونگ روم کی میز سے ریموٹ اٹھایا اور بٹن دبایا۔ اسکرین روشن ہوگئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کمرے کو دیکھا جس کا دروازہ زوردار آواز سے بند ہوا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

جب وہ باہر آئی وہ صوفے پر ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا اور نگاہیں ٹی وی اسکرین پہ جمی تھیں۔ اس دوران وہ کئی دفعہ اندر باہر آتی رہی تھی لیکن اس دفعہ شاید وہ آخری دفعہ باہر آئی تھی کیونکہ ایک سوٹ کیس اور ایک ہولڈ آل بیگ ساتھ تھا۔ ماہر نے پیالی رکھی۔ اور فرصت سے بیگ کو دیکھا۔

(براؤن کیوں؟)

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ گردن اٹھا کے اسے منتظر سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا تم مجھ پہ بھروسہ کرسکتی ہو کہ محفوظ ترین جگہ ہی لے کر جاؤں گا؟"

"میں کتنا بھاگوں گی اس سے؟ اور "مجھے" اس سے خطرہ نہیں ہے۔"

"بھروسا ہے یا نہیں؟"

وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ حلق میں گیلی گیند سی اٹک گئی۔

"ضروری سامان اٹھایا ہے بس۔ اپنے ملازموں سے کہنا میرے پودے لیتے آئیں گے۔"

مرد ذات سے بھروسا ٹوٹنے کے بعد ایک دوسرے مرد پہ اعتبار کرنے کی عادت ڈالنا کتنا مشکل تھا۔ خوف زدہ کردینے والا۔ تکلیف دینے والا۔ اس کے اندر ڈری سہمی عورت بار بار اپنے بازو پھیلائے

کو بچالے لیکن اسے اس عورت کو خاموش رکھنا تھا۔ اگر وہ خود کو حفاظتی قلعوں میں قید کردے گی تو زندگی میں کبھی کچھ نیا نہیں کرسکے گی۔ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکے گی۔

وہ اپنا کوٹ اٹھائے باہر آئی تو ماہر نے دیکھا اس کا رنگ بھی بھورا تھا۔ اونٹ جیسا بھورا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ ایک ہی سوال بار بار نہیں دہرا سکتا تھا۔

"بھروسا ہے تم پہ۔ لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

ماہر نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے پھر سر جھٹک کے سیڑھیاں اترنے لگا۔ یہ طے تھا کہ وہ اسے وہاں پہنچنے سے پہلے نہیں بتائے گا۔

مالا کے ذہن میں بہت سی جگہیں آئیں۔ جہاں وہ اسے لے جاسکتا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے اس جگہ لے جارہا تھا جو اس کے ذہن میں کبھی آ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

"کس چیز کی خواہش ہے آپ کے دل کو؟"

اندھیرے کمرے میں لیپ ٹاپ کی اسکرین کی روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ روشنی بھی اتنی ہی تھی کہ کرسی پر ٹانگیں لمبی کرکے نیم دراز عالیان کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ اب عینک غائب تھی اور بال پیچھے کررکھے تھے۔ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس وہ کسی لونگ روم میں بیٹھا تھا جو کہ اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اسکرین پہ کبیرہ بیگم کا چہرہ تھا۔ وہ غالباً موبائل اونچا پکڑے ہوئے تھیں۔ پیچھے چیسٹر فیلڈ صوفے کی اونچی پشت اور پردے دکھائی دیتے تھے۔ چھوٹے کٹے بال، میک اپ سے سیاہ آنکھیں اور کانوں میں بڑے نگینوں والے ٹاپس۔

اسکرین پہ عالیان کا کیمرہ آف تھا۔ وہ انہیں دیکھ سکتا تھا لیکن کبیرہ کو صرف اس کا نام دکھائی دے رہا تھا۔

اس کاروبار کی سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ کلائنٹ یہ فرض کرکے آتا تھا کہ عامل کو اس کا اگلا

پچھلا سب معلوم ہے۔ سو وہ عامل سے اپنا نام، پتا، حسب نسب کچھ نہیں چھپاتا تھا۔

"کیا تم ہر کلائنٹ سے ویڈیو کال کرتے ہو؟"

"پہلے سوال میں نے پوچھا ہے۔ کیا چاہیے آپ کے دل کو؟"

وہ سانس لینے کو رکیں۔ چند لمحے آنکھیں چھوٹی کیے اسکرین کو دیکھے گئیں۔

"مجھے کسی کی زندگی جلا کے راکھ کرنی ہے۔"

"ویری بولڈ۔" وہ ستائش سے مسکرایا۔ "ورنہ میرے کلائنٹس اپنی خواہشات کو ضرورت کے پتوں سے لپیٹتے ہیں۔ مجھے انتقام لینا ہے کیونکہ میرے ساتھ برا ہوا، مجھے محبت خریدنی ہے کیونکہ اس سے میری زندگی بہتر ہو جائے گی، مجھے انصاف تب ملے گا جب وہ تباہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ مگر آپ بہت ڈائریکٹ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو کسی کی زندگی تباہ کرنی ہے اور وہ بھی جادو سے۔ ویری بولڈ۔"

وہ ہلکا سا مسکرائیں۔ "مجھے تمہاری جج منٹ سے فرق نہیں پڑتا۔"

"جج نہیں کر رہا۔ تعریف کر رہا ہوں۔ بتائیے۔ کس کی زندگی تباہ کرنی ہے؟"

"میری ایک رشتے دار تھی۔ حور جہاں۔ اس کی بیٹی کی۔"

"بیٹی کا نام۔ اس کی ماں کا نام۔ تصویر۔ اور اس وقت وہ جہاں موجود ہے وہاں کا ایڈریس چاہیے ہوگا۔"

"ماہ بینہ مبین۔ وہ کینیڈا میں...."

"ایسے نہیں۔ مجھے میسج کریں۔ مگر کرنا کیا ہے اس کے ساتھ؟"

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئیں۔

"وہ زندگی میں ترقی کر رہی ہے۔ اس کا گھر ہے۔ بچے ہیں۔ جاب ہے۔ یہ سب کچھ عنایہ... میری بیٹی کے پاس بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ ماہی کو مل گیا۔ یعنی ماہ بینہ کو۔ بس کچھ ایسا کرو کہ یہ سب اس سے چھن جائے۔"

"چھن کے آپ کی بیٹی کو پھر بھی نہیں ملے گا۔"

ان کی آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھری۔

"اسے کیسے ملے گا؟"

"دینا اوپر والے کا کام ہے۔ اور چھیننا میرا۔" وہ مسکرادیں۔ البتہ اس مسکراہٹ میں زخم تھے۔

"کیا دشمنی ہے آپ کی اس لڑکی سے؟" وہ بغور اسکرین کو دیکھ رہا تھا جیسے ان کی آنکھوں کو پڑھ رہا ہو۔

"اس کی انسٹاگرام پوسٹس مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ وہ ہر روز کچھ پوسٹ کرتی ہے۔ کبھی اپنے بچوں کی تصویریں۔ کبھی جاب کی کامیابیاں۔ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ ٹریول پہ لی گئی ویڈیوز۔ جب میں وہ دیکھتی ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جب اس کے پاس یہ سب نہیں رہے گا تو مجھے تکلیف نہیں ہوگی۔ اتنی سی خواہش ہے میری۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"اونہوں۔ غلط تو وہ ہے جو تصویریں لگا رہی ہے۔ اسے اتنا احساس نہیں کہ دنیا محروم لوگوں سے بھری پڑی ہے۔" پھر وہ مسکرایا۔ "بے فکر رہیں۔ ہم اس کو بھی محروم کر دیں گے۔ میں عمل شروع کروا دیتا ہوں۔ لیکن عمل کو میچور ہونے میں ایک ماہ لگے گا۔"

"ویری فاسٹ۔ عموماً عامل تین سے چھ ماہ کا وقت لیتے ہیں۔"

"بتایا نا۔ جدید دور۔ جدید طریقے۔ گڈ نائٹ۔" اس نے اسکرین فولڈ کر دی۔

اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ چند لمحے صرف عالیان کے سانس لینے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

پھر موبائل اسکرین روشن ہوئی۔ ایک دفعہ پھر اس کا چہرہ نیلی روشنی میں چمکا۔ اب وہ ایک نمبر ملا رہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" زارینہ فرید کی غراتی ہوئی آواز اسپیکر پہ سنائی دی۔

وہ ہنس دیا۔

"ایک سافٹ ریمائنڈر دینا تھا۔ تم نے مجھے اس ماہ کی پے منٹ نہیں کی۔ شادی تک ہر ماہ پے منٹ کرنی تھی۔ میں تمہارے ری ٹینر پہ ہوں، مائی ڈیئر۔"

"میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں کال ریکارڈ نہیں کر رہا۔ اس لیے ایسے مت بولو۔ میرا دل برا ہو رہا ہے۔"

"میں تمہیں نہیں جانتی۔ اس لیے دوبارہ مجھے کال مت کرنا۔"

"اور وہ پے منٹس جو تم مجھے کرتی آئی ہو؟"

" کوئی بینک ٹرانسفر، کوئی وائر، کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

عالیان ایک لمحے کو چپ ہو گیا۔ سر کھجایا۔

"اسی لیے تم کیش پے منٹس کرتی تھیں۔ تمہیں اس دن کا ڈر تھا جب میں تمہیں بلیک میل کروں گا۔"

"میں تم سے کبھی ملی ہی نہیں۔ پتہ نہیں تم کون ہو۔"

"میرے پاس ہماری ملاقاتوں کی ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگز ہیں، زارا۔ میں وہ..."

"جب میں تم سے ملی ہی نہیں تو یقیناً وہ تم نے ڈیپ فیک کی ہوں گی۔ آج کل اے آئی سے ہر چیز ممکن ہے۔" زارا کا لہجہ بالکل پرسکون تھا۔

عالیان کے چہرے پہ تناؤ در آیا۔ ماتھے پہ بل پڑے۔

"دو ماہ بعد تمہاری شادی ہے۔ پے منٹ کرنے کی بجائے تم مجھ سے الجھ رہی ہو۔" دبا دبا سا غرایا۔

"جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تو کس چیز کی پے منٹ کروں؟" زارا کے لہجے میں حیرانی تھی۔

عالیان نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے۔ ری ٹینر نہ سہی۔ تم مجھے یک مشت ادائیگی کرو۔ ایک رقم کا فگر بھیج رہا ہوں۔ مجھے صبح تک یہ چاہیے۔ اگر نہ ملی تو کل صبح دس بجتے ہی میں تمہاری حقیقت کھول دوں گا۔"

"تمہیں مجھ سے ایک پاؤنڈ نہیں ملے گا۔ اور جہاں تک بات ہے ماہر کی... وہ تمہارا کبھی یقین نہیں کرے گا۔"

"کس نے کہا میں ماہر کے پاس جاؤں گا؟"

دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔

"صبح دس بجے تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔ بائے مائی ڈیئر۔" مسکرا کے کال بند کی۔ موبائل اسکرین بجھ گئی۔ ایک دفعہ پھر سے اندھیرا چھا گیا۔ اب صرف وہ تھا اور اس کی سوچیں۔

☆☆☆

اپنے اپارٹمنٹ کے لونگ روم میں بیٹھی زارا تیزی سے فون پھینک کے اٹھی۔ دوڑ کے بیڈروم میں گئی۔ الماری کھولی۔ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی اور جلدی جلدی لاکر کا کوڈ پنچ کیا۔ اندر بہت سے کاغذات، چیک بکس اور کیش کی گڈیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ کچھ جیولری باکسز بھی تھے۔ اس نے چیک بک نکالی۔ صفحے پلٹائے۔

"کب کب پے منٹ کی تھی میں نے اسے؟"

اس نے ان چیکس کی نقلیں نکالیں جب اس نے پیسے نکلوائے تھے۔ ساتھ ہی پرنٹ شدہ انوائس رکھے تھے جن پہ کسی کمپنی کا نام درج تھا۔ یہ تمام رقم اس نے بیگز کے لیے نکالی تھی۔ کاغذوں پہ یہی درج تھا۔ وہ بیگز خرید کے اس نے بعد میں بیچ دیے تھے۔ کاغذی ٹریل مکمل اور شفاف تھا۔

وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ ماہر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ زارا ماڈرن لڑکی تھی۔ اسے کیا پتہ جادو ٹونے کی باتوں کا۔ وہ کہاں یقین کرتی ہے ان باتوں پہ۔

الماری بند کر کے وہ اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی لباس کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ اس کی رنگت پھیکی تھی اور پیشانی پہ قطرے تھے۔

کس نے کہا میں ماہر کو کچھ بتاؤں گا؟"

پھر کون؟ اوہ۔ بابا۔ وہ بابا کے پاس جائے گا۔ ہونہہ۔ بابا کو تو ویسے ہی جادو پہ آج تک یقین نہیں آیا۔ بابا کبھی اس کا یقین نہیں کریں گے۔ اور... اور اس نے یہ نہیں کیا بابا کے ساتھ۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔

کسی تسبیح کی طرح وہ بار بار دہرا رہی تھی۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب کار ایک سیاہ جالی دار گیٹ کے سامنے رکی۔ گیٹ کھلتا گیا اور ماہر کار اندر لے آیا۔ باہر نکل کے مالا نے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ سامنے تین دراز قد عمارتیں ساتھ ساتھ کھڑی

تھیں۔ جیسے ٹاورز ہوں۔ ابھی اسے اس شہر کے راستوں کی اتنی سمجھ نہ تھی کہ وہ بنا جی پی ایس کے جان پاتی کہ یہ کون سا علاقہ تھا۔

اس نے اپنے بیگ کا ہینڈل تھامنا چاہا لیکن ماہر نے وہ اس سے لے لیا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ابھی اس سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔

ریسپشن سے گزرتے ہوئے ماہر نے کاؤنٹر پہ بیٹھی لڑکی کو سر کے خم سے سلام کیا تھا۔ یعنی وہ یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔

لفٹ میں تمام راستہ خاموشی سے کٹا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ دھاتی دروازوں میں ان دونوں کا عکس دکھائی دے رہا تھا اور درمیان میں مالا کے بیگز تھے۔ بھورے بیگز۔

دروازے جدا ہوئے اور وہ کسی جانی پہچانی سمت کی طرف بڑھ گیا۔ یہ نیم خوابیدہ سی بتیوں سے روشن راہداری تھی۔

ایک دروازے کے سامنے ماہر رکا۔ وہاں پہلے ہی سوٹ میں ملبوس دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے تیزی سے اس کا بیگ لے لیا۔

تب ہی اس کی نگاہ دروازے کی تختی پہ پڑی۔ دل دھک سے رہ گیا۔

فرید لار۔

چونک کے اسے دیکھا۔ وہ کوڈ پنچ کر رہا تھا۔ دروازہ کلک سے کھل گیا۔

ماہر ایک طرف ہٹا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

"میرے گھر میں خوش آمدید۔"

کشمالہ مبین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر گھر کے دروازے کو۔

وہ اسے اپنے گھر لے آیا تھا؟ کیا سوچ کے؟ اس کا دماغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا۔

"مالا؟" وہ اسے چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ سر کو خم دیتی آگے بڑھی۔

ایک روشن کاریڈور سامنے تھا۔ لیونڈر کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کی سیاہ ٹکٹن ہیلو کی ٹھک ٹھک سنائی دینے لگی۔

(کیا وہ اسے یہاں رہنے کو کہنا چاہتا تھا؟ اس کا دماغ درست تھا؟)

وہ اس کے ساتھ اندر نہیں آیا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کے نہ دیکھ سکی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ شل ذہن کے ساتھ وہ لونگ روم تک پہنچی۔

وہ سیاہ سفید ساڈ پلیکس (دو منزلہ) اپارٹمنٹ تھا۔ اونچے سیاہ پردے سمٹے ہوئے تھے اور سفید شفون کے پردے کھڑکیوں کے آگے برابر تھے۔ سیاہ ایل شیپ صوفہ۔ سیاہ، سفید اور سرمئی سا اوپن کچن۔ اس بلیک اینڈ وائٹ منظر نامے میں رنگین شے صرف ایک پستہ قد ہاؤس کیپر تھی جو اس کی طرف بڑھی اور خوش اخلاقی سے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ اس نے ہلکا سا سر ہلایا۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

دوسری رنگین شے ایک اسٹینڈ پہ جما چوکھٹا فریم تھا۔ اس پہ کچھ بنا ہوا تھا۔ ساتھ ٹرالی میں رنگین دھاگے رکھے تھے۔ ہاؤس کیپر اب اس کو بیٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اسے مینٹل شیلف کے ساتھ رکھی ونگ چیئرز دکھائی دیں۔ وہ جوتوں سے چلتی ایک چیئر تک آئی۔ اور غیر آرام دہ انداز میں اس پر بیٹھی۔

(اس کا دماغ درست تھا؟)

ایک سنہری کتا نہ جانے کہاں سے زینے پھلانگتا نیچے آیا۔ پہلے لاؤنج کے کنارے کھڑے ہو کے خوب بھونکا۔ پھر دیکھا کہ وہ متوجہ نہیں ہے تو چپ چاپ کھڑکی کے ساتھ لمبا لیٹ گیا اور تھوڑی زمین پر رکھ لی۔

وہ بالکل الجھی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس نے نہیں دیکھا ہلال کب اپنے کمرے سے نکلی ہے، کب ناپ تول کے قدم رکھتی وہاں تک آئی ہے۔ اس نے ہاؤس کیپر کی آواز سنی۔ وہ ہلال کو کچھ بتا رہی تھی۔ ہلال نے بغیر صوفے تک آئی۔ صوفہ شال اٹھا کے عجلت میں ٹپسٹری کے اوپر پھیلانے لگی یہاں تک کہ وہ ڈھک گئی۔

مالا تب چونکی جب ہلال اس کے قریب آچکی تھی۔

"کیسی ہو، مالا؟" ہلال اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔ بھوری آنکھیں مالا کے پیچھے کسی غیر مرئی

نقطے پہ جمی تھیں۔
"ٹھ.... ٹھیک۔ سب ٹھیک۔"
"تم پریشان ہو، مالا! ریلیکس۔ تم یہاں محفوظ ہو۔ فیضی خانم.. مالا کے لیے پانی لائیں۔" وہ اسی نرمی اور سکون سے کہہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے وہ اس کے قدموں کے قریب کشن کے سہارے بیٹھ گئی۔
"تھینکس۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ پہلو بدلا۔
ذہن جاگنے لگا۔ سیاہ سفید اپارٹمنٹ۔ کچھ یاد آیا تھا۔ لاہور میں... جب وہ کیف کے پیچھے گئی تھی... اس کے اپارٹمنٹ.... وہ بھی ان ہی دو رنگوں میں آراستہ تھا۔ وہ ان ہی رنگوں کے کپڑے عموماً پہنتا تھا۔ کیا اسے بھی دو رنگ پسند تھے؟
پھر جانتی کیوں؟
آہٹ پہ وہ چونکی۔ ماہر اب اندر آیا تھا۔ جرابیں لپٹے چلتا ہوا وہ لاؤنج کے دہانے پہ رکا۔
وہ سامنے ونگ چیئر پہ بیٹھی تھی۔ پیروں میں جوتے تھے۔ ماہر نے بے اختیار فیضی خانم کو دیکھا جو ان جوتوں کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ ماہر کے دیکھنے پہ جھینپ کے کچن کی طرف چلی گئیں۔
"ماہر.... یہ تمہارا گھر ہے؟" وہ بے چین سی کرسی کے بالکل کنارے پر بیٹھی تھی۔ جیسے بھاگ جانے کو تیار۔
"سویٹ ہارٹ" وہ ساتھ والی ونگ چیئر پر بیٹھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں رہو۔ دروازے پہ میرے گارڈز ہیں۔ عمارت سیکیور ہے۔ اور تم میری نظروں کے سامنے ہو گی۔"
کشمالہ نے بے یقینی سے پلکیں دو بار جھپکائیں۔ (اس کا دماغ درست تھا؟)
"ادھر؟ تمہارے گھر میں؟" انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کیا۔
"میرے گھر میں نہیں۔ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں۔" اس نے پیشانی چھوئی۔ "نیکسٹ ڈور کی بات کر رہا ہوں۔"
"اوہ..." اس کے تنے اعصاب ایک دم سے ڈھیلے ہوئے۔
"وہ بھی ہمارا ہی ہے۔ اسی کا ٹوئن اپارٹمنٹ ہے اور ڈوپلیکس ہے۔ بیسک سا فرنیچر ہے اس میں۔ ہم نے رینٹ پہ چڑھانے کے لیے لیا تھا۔ ابھی خالی ہے۔ بس دو ماہ کی بات ہے۔ تم آرام سے وہاں رہو..." ہاتھ اٹھا کے اسے بولنے سے روکا۔ "یہ مت کہنا تم رینٹ ادا کرو گی۔ تم اس کو افورڈ نہیں کر سکتیں۔"
مالا کے لب بھنچ گئے۔ آنکھیں چھوٹی کر کے اسے گھورا۔
"میں کرایہ دوں گی بھی نہیں کیونکہ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی۔"
"گڈ۔ ارول تمہارا سامان اور پودے لے آئے گا۔ تمہیں گروسری میں جو چاہیے ہو فیضی خانم (کچن میں کام کرتی روبوٹ نما عورت کی طرف اشارہ کیا) سے لے سکتی ہو۔"
اس کے سینے میں ایک عجیب سا احساس اٹھا۔
(ٹھنڈا کنٹینرز۔ بند دروازہ۔)
"میں قید ہوں کیا؟"
ماہر کے تاثرات نرم ہوئے۔
"میں تمہیں قید کیوں کروں گا؟ تم جب اور جہاں چاہے آ جا سکتی ہو۔ بس احتیاط سے۔ باقی یہاں رہنے سے تمہاری حفاظت پہلے سے بہتر ہو گی اور مجھے سکون رہے گا کہ تم محفوظ ہو۔ کیا تم مجھ پہ بھروسہ کر کے یہاں رہ سکتی ہو؟" وہ آگے کو جھکا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
اس کے چہرے کی لکیریں ڈھیلی پڑیں۔ وہ اس کی حفاظت چاہتا تھا۔ وہ اس کو اپنا اتنا قیمتی اپارٹمنٹ دے رہا تھا کیونکہ اسے اس کا خیال تھا۔ اسے اس کی نیت پہ شک نہیں کرنا چاہیے۔
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماہر فرید کے احسانات بڑھتے جا رہے تھے۔
"مالا؟" بیربل کی آواز پہ وہ چونکی۔ وہ ابھی کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اسے دیکھ کے خوش گوار حیرت چہرے پہ آئی۔

"مالا آج ڈنر ہمارے ساتھ کرے گی۔" ماہر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت اچھا۔" بیربل نے پہلے مالا کے جوتوں کو دیکھا۔ پھر وہیل چیئر کو۔ پھر واپس ماہر کو۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ عود آئی۔ ابرو اٹھایا۔

"اچھا لگا تمہیں یہاں بیٹھے دیکھ کے، مالا!" مسکرا کے اونچا سا بولا۔ پھر باہر کی طرف جاتے ماہر کے پیچھے لپکا۔

"مجھے تم سے بات کرنی..."

"میں ابھی کام سے جا رہا ہوں۔ ڈنر پہ ملاقات ہوگی۔" وہ سنے بنا آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ کمرے کی جانب تھا۔

بیربل نے سوچتی نظروں سے مالا کو دیکھا۔

"یہ زیادہ بہتر ہے۔ اب ڈنر پہ بات ہوگی۔ تم ہوگی نا؟" قدرے امید سے اسے دیکھا۔ مالا کے سامنے ماہر خود پہ قابو رکھے گا۔

وہ تکان سے مسکرادی۔ وہ تھک گئی تھی۔ زیادہ سے ملاقات، پیکنگ، ذہنی الجھن۔

بیربل کے چہرے پہ تھکی ہوئی پھیکی سی مسکراہٹ در آئی۔

ماہر کے باہر آنے تک بیربل جا چکا تھا۔ اس نے تادیبی نظروں سے ماہر کو دیکھا۔

"کیا تم نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی؟"

"بات کر کے اس کے لیے اعتراف آسان کردوں؟" آستین پیچھے موڑتے ہوئے ابرو اٹھایا۔

مالا نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

"تم کیوں اس کے ساتھ..."

"دیکھو اور سیکھو۔" مسکرا کے وہ آگے بڑھ گیا۔ گزرتے ہوئے ہلال کے بالوں پر ہاتھ پھیرا جو خاموشی سے وہاں بیٹھی تھی۔ یوں جیسے اس محفل کا حصہ نہ ہو۔

جب فیضی خانم مالا کے ساتھ اس کا سامان سیٹ کرنے وہاں سے چلی گئیں تو ہلال اٹھی اور بدقت ٹیپسٹری کو اسٹینڈ سے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وہ بنا آنکھوں کے ان پیچ و خم کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو ان دونوں کو آپس میں جوڑے ہوئے تھے۔ تھک کے اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اس پر ڈھکی ہوئی شال کی گرہیں لگانے لگی تاکہ وہ ہوا سے پھسل نہ جائے۔

☆☆☆

وین کوور میں دو ہی موسم ہوتے تھے۔ سرما کا موسم اور کنسٹرکشن کا موسم۔

صد شکر کہ نومبر کی آمد سے بہت پہلے ہی کنسٹرکشن سیزن ختم ہو چکا تھا۔ اور ماہ بینہ مبین کے سفید اجلے اجلے سے گھر کے باہر ٹھنڈی سی خزاں اپنے خوب صورت رنگ بکھیرے ہوئے تھی۔ جگہ جگہ گھروں کے باغیچوں میں نارنجی حلوہ کدو رکھے تھے۔ خزاں حلوہ کدو کا موسم تھا۔ اور ماہی اس وقت کچن میں کھڑی پمپکن اسپائس کے ساتھ ایک گرم ڈرنک بنا رہی تھی۔ بچوں کے کمرے سے ان کے بولنے اور کارز سے کھیلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کاؤنٹر پر ان کا بچا ہوا کھانا رکھا تھا جو اب اسے ہی کھانا تھا کیونکہ ماں کا معدہ ہوتا ہی ڈسٹ بن ہے۔ اس کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرنک بن گیا تھا۔

یہ وقت تھا جو جاب اور بچوں کے کاموں میں الجھی ماہی کو قدرے فارغ ملتا تھا۔

گرما گرم ڈرنک اس نے مگ میں انڈیلا۔ آنکھیں بند کر کے اس کو سونگھا۔ واہ۔

پھر وہ کھڑکی کے ساتھ رکھی آرام دہ کرسی پہ آگئی۔ کتاب اٹھا کے گود میں رکھی۔ شال ٹانگوں پر ڈالی اور پیر اوتومین پر رکھے۔ مگ اور کتاب کو ساتھ ساتھ رکھ کے تصویر کھینچی۔ مگ ایک طرف رکھا اور چند منٹ فلٹر اور میوزک سیٹ کر کے اسٹوری پوسٹ کی۔ پھر ایک گھونٹ بھرا۔ واہ۔ شان دار۔

باہر خزاں کے زرد نارنجی رنگ بکھرے تھے اور سامنے کتاب کھلی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے مگ سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ بچے مصروف تھے۔ آج کے کام مکمل تھے۔ یہ ایک آئیڈیل دن تھا۔

زندگی خوب صورت تھی۔

اس نے مسکرا کے کتاب سامنے کی۔ ابھی

ڈھائی صفحے ہی پڑھے تھے کہ......

اچانک سے.....

کچھ زور سے کھڑکی پہ آن گرا۔

وہ ڈر کے اچھلی۔ کتاب چھوٹ گئی مگ اوندھا ہو گیا۔

کھڑکی کے شیشے پر خون کی دھاریں تھیں۔

جیسے کسی نے خون سے بھرا جگ وہاں انڈیل دیا ہو۔

ماہی نے چیخ روکنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ مگ سے بہتا ڈرنک کارپٹ کو بھگو چکا تھا۔ اور وہ خوف زدہ سی کھڑی بے یقینی سے سرخ شیشے پہ دیکھ رہی تھی۔ بوندیں ٹپک ٹپک کے نیچے جا رہی تھیں اور باہر فرش میں جذب ہو رہی تھیں۔

ماہ بینہ کی ٹانگوں سے جان نچڑنے لگی۔

اتنے برس بعد...... کیا پھر سے؟

☆☆☆

کشمالہ مبین کا نیا اپارٹمنٹ فرید لارکی نقل تھا۔ وہی آرکیٹیکچر۔ ویسی ہی کمروں کی ترتیب۔ درمیان میں سیڑھیاں۔ البتہ رنگ اور فرنیچر بالکل مختلف تھے۔ جہاں فرید لار سیاہ سفید رنگوں سے پر تعیش انداز میں سجایا گیا تھا، وہاں اس اپارٹمنٹ میں نام کے سفید پردے تھے اور واجبی سا آئیکیا کا فرنیچر۔ صرف ایک بیڈروم فرنشڈ تھا۔ باقی خالی خالی تھا۔ البتہ فرید لار کی نسبت یہاں روشنی زیادہ تھی۔ کھلا۔ ہوا دار۔ اردل شام میں اس کے پودے لے آیا تو انہوں نے سارے میں سبز رنگ بھر دیا۔

البتہ اس اپارٹمنٹ کی فضا میں، ماہر فرید کے بڑھتے ہوئے احسانات کا بوجھ بھی تھا جس کے باعث وہ چند منٹ بعد ہی برا محسوس کرنے لگی تھی۔

اسے عبدالمالک فرید کی نگاہیں اور ان میں پنہاں تشویش یاد آئی۔ کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے ماہر کو غیر محفوظ کر رہی تھی؟

مگر وہ اور کیا کرتی؟ ایک ہائپر انڈیپنڈنٹ (شدید خود مختار) عورت کی طرح اتنے برس اپنا خیال خود رکھ رکھ کے اب وہ تھکنے لگی تھی۔ کم از کم کوئی تھا جسے اس کی حفاظت کا خیال تھا۔

یہ وہ پہلا فیملی ڈنر نہیں تھا جس میں ماہر اور وہ ایک میز پہ بیٹھے تھے۔ اسے معید کی شادی سے پہلے والا ڈنر یاد آیا۔ البتہ امید تھی کہ آج کا ڈنر آکورڈ نہیں ہوگا۔

ڈنر ڈائننگ ہال میں سجایا گیا تھا۔ یہ ہال لونگ روم کا دوسرا حصہ ہی تھا، البتہ درمیان میں سیڑھیوں کی وجہ سے یہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہاں کھڑکی نہ تھی۔ بس دیوار گیر آئینہ لگا تھا جس میں مالا کو ایک دوسری ڈائننگ ٹیبل اور اس پہ براجمان تین افراد دکھائی دے رہے تھے۔ ایک سیاہ لانگ ڈریس میں بیٹھی سبز آنکھوں والی لڑکی جس کے بال بندھے تھے اور کانوں میں ننھے موتی تھے۔ ایک مقابل بیٹھی گھنگریالے بالوں اور جھکے سر والی لڑکی۔ اور ایک سربراہی کرسی پر براجمان سیاہ شرٹ اور پینٹس والا آدمی جو مسلسل اپنے فون پہ لگا تھا۔

اس ڈنر کی چوتھی شریک خاموشی تھی۔ وہ خاموشی جس سے وہ بیربل کے منتظر تھے۔

بیربل کی جگہ ہلال کے ساتھ تھی۔ اس پہ چارجر، پلیٹس، کٹلری، نیپکن سب بچھا تھا۔

فیضی حانم کچن میں خاموشی سے منتظر تھیں۔ کب وہ آئے۔ کب سروس شروع ہو۔

یہ خاموشی چند لمحے بعد مالا کو مزید بوجھل محسوس کروانے لگی۔ شاید اسے ماہر کے فیملی ڈنر پہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ غیر آرام دہ سا تھا اس میز پہ۔ شاید وہ خود کو چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ وہ پولیس والے معاملات میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ اب اس نے اسے اپنا اپارٹمنٹ دے دیا تھا۔ اس کے احسان بڑھتے جا رہے تھے۔ شاید اسے اپارٹمنٹ لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔

"تمہارا سامان آگیا؟" ماہر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ پھر واپس موبائل اسکرین کو۔

وہ بدقت مسکرائی۔ "ہوں۔ سب آگیا۔"

خاموشی پھر سے چھا گئی۔ہلال سر جھکائے پلیٹ پر انگلی پھیر رہی تھی۔جیسے کچھ ان دیکھا سا لکھ رہی ہو۔طویل میز کے وسط میں پھول رکھے تھے اور اونچی موم بتیاں جل رہی تھیں۔

بالآخر بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے جیسے سکون کا سانس لیا۔جوتوں کی آوازیں۔ بیربل جوتے اتار رہا تھا۔ہیلز کی ٹک ٹک۔وہ چونکی۔بے اختیار ماہر کو دیکھا۔

اس نے بالآخر اپنا موبائل ایک طرف رکھ دیا تھا۔

قدم لاؤنج عبور کر کے اس طرف آتے سنائی دے رہے تھے۔مالا کمر سیدھی رکھے چوکنی سی بیٹھی تھی۔

پہلے بیربل کا چہرہ دکھائی دیا۔

"آؤ، بیربل!" ماہر فرصت سے ان کی طرف متوجہ تھا۔

"شام بخیر۔مجھے آپ لوگوں کو کچھ بتانا ہے۔" وہ ماہر کے مقابل سربراہی کرسی کے پیچھے جا رکا۔"میں کافی دن سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن تم سننا نہیں چاہتے تھے۔جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم جانتے ہو۔اس لیے... اب یہ سرپرائز نہیں رہا۔" اب وہ ماہر کو دیکھ رہا تھا۔تھوک نگلتا۔ رک رک کے کہتا ہوا۔

"میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔"

مالا نے بیربل سے نگاہ ہٹا کے ماہر کو دیکھا۔اس کا چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔پھر دوبارہ بیربل کو۔وہ کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"میں نے شادی کر لی ہے۔"

"واٹ؟" ہلال نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ناسمجھی کی لکیریں ماتھے پہ ابھریں۔صرف وہی ناواقف تھی۔

"اور تم اسے جانتے ہو۔" اس نے گردن موڑ کے کسی کو اشارہ کیا۔ہیل کی ٹک ٹک قریب آنے لگی۔

"بالکل۔میں اسے جانتا ہوں۔لیکن کیا تم اس کو جانتے ہو، بی؟"

مالا نے دیوار گیر آئینے کو دیکھا تا کہ اسے گردن موڑنے کی ضرورت نہ ہو۔آئینے کے کونے سے وہ آتی دکھائی دے رہی تھی۔

کندھوں تک آتے بھورے بالوں والی لڑکی۔پوری آستین کا سفید فلٹڈ ڈریس پہنے جو جو پنڈلیوں کے درمیان میں ختم ہوتا تھا۔کانوں میں سنہرے ٹاپس۔کہنی پہ ایک میٹلیک برکن بیگ جس کے لیے چند دن پہلے اس کی کلائنٹ اور نکوئے کی مسجد کے سامنے رو رہی تھی۔اب وہ بیربل کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔مالا نے آئینے سے نگاہ ہٹا کے اس کے اصلی وجود کو دیکھا۔اس کی انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں تھیں۔ایک میں تین کیرٹ کا ڈائمنڈ واضح دمک رہا تھا۔

ان سب کو اپنی طرف دیکھتے سادگی سے مسکرائی۔

"سوزین۔" سر کو ذرا خم دیتے تعارف کروایا۔

"سوزی اور میں نے شادی کر لی ہے۔" وہ ساتھ آ کھڑی ہوئی تو بیربل نے کرسی کا کنارہ چھوڑ دیا۔گردن قدرے تن گئی۔

مالا کی نگاہیں کورٹ میں دائیں بائیں جاتی ٹینس بال کی طرح ان دونوں سے ماہر کی طرف اٹھ گئیں۔وہ پیچھے کو ٹیک لگائے بالکل سنجیدہ بیٹھا تھا۔

"کب؟"

"پانچ دن پہلے۔ہم نے اچانک سے فیصلہ کیا۔۔ ہمیں لگا یہ ہمارے لیے ٹھیک ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔پھر رکا۔مالا کو دیکھا۔

"سوزی... سوزین... ماہر کی وکیل تھی۔اس نے ماہر کا کیس لڑا تھا اور اس کو جیل سے نکالا تھا۔وہ کیس جس میں..." وہ ہچکچایا۔" زیاد نے اسے پھنسایا تھا۔"

"یاد کروانے کے لیے شکریہ۔" وہ جبراً مسکرائی۔سوزی کو سر کے خم سے سلام کہا۔وہ بھی

میں سے کم از کم ایک فرد بے تحاشا دولت کا مالک ہو۔)

مالا نے ماہر کو دیکھا اس کے چہرے کی لکیروں میں فرق نہیں آیا تھا۔

"اس پری نپ کی کاپی میں آپ کو ای میل کردوں گی۔ آپ اپنی تسلی کرلیں۔ میں نے بیربل سے شادی ایک گھر بنانے کے لیے کی ہے۔ اس کی دولت میں حصہ دار بننے کے لیے نہیں۔ "پھر اس نے چہرہ موڑ کے بیربل کو دیکھا۔ آنکھوں میں نرمی تھی۔

"وہ چیزیں جن کی وجہ سے عورتیں بیربل کے پیچھے بھاگتی ہیں، میں وہ چیزیں بچپن سے دیکھتی آرہی ہوں۔ "پھر ماہر کو دیکھا اور جیسے اداسی سے مسکرائی۔ "یہ بیگز، یہ جواہرات، یہ گھر اور لگژری تعطیلات، یہ میرے لیے نیا نہیں ہے۔ میرا اپنا سوشل سرکل ہے۔ ایک کامیاب کیریئر ہے۔ مگر میری زندگی میں صرف ایک چیز کی کمی تھی۔ "ساتھ کھڑے بیربل کا ہاتھ تھاما۔ "کمپینین شپ" کی کمی۔ اس کی تلاش میں، میں بہت سے لوگوں سے ملی ہوں۔ بیربل سے امیر۔ بیربل سے کم پیسے والے۔ مگر پیسہ میرے لیے اہم نہیں ہے کیونکہ میں یہ خود کما سکتی ہوں۔ لیکن بیربل وہ واحد شخص ہے جو مجھے سمجھتا ہے۔ جس کے ساتھ میں نے خود کو اتنا محفوظ اور مکمل محسوس کیا ہے۔"

اس کی مسکراتی آنکھوں میں گلابی سی ابھری۔

"اسی لیے جب اس نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے ہاں کردی۔ اور ہم نے فوراً شادی کرلی۔ کچھ سوچا نہیں۔ کچھ دیکھا نہیں۔"

"سوائے پری نپ کے۔"

سوزی نے گہری سانس لی۔ "میں وکیل ہوں، ماہر بے۔ دس منٹ میں معاہدہ بنوا سکتی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ مجھے لالچی عورتوں کی کیٹیگری میں ڈالیں۔ ہم نے پیسے کو پہلے دن سے ہی اپنے تعلق سے نکال لیا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔ میں ان چیزوں کے دوستانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر دوبارہ ماہر کو دیکھا۔

"جانتی ہوں آپ لوگ خفا ہوں گے کہ ہم نے آپ کو نہیں بتایا۔"

"کیوں نہیں بتایا، بیربل بھائی؟" ہلال ابھی تک پریشان بیٹھی تھی۔ بیربل کے چہرے پہ ملال ابھرا۔

"آئی ایم سوری۔ مگر ہم نے وہ کیا جو ہمیں اپنے لیے بہتر لگا۔ سوری ہلال!" پھر ماہر کو دیکھا۔ "سوری ماہر!"

ماہر اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے صرف سوزی کو دیکھ رہا تھا۔

"ماہر بے... "وہ کھنکھاری۔ "مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو بیربل اور میرے فیصلے سے افسوس ہوا ہوگا..."

"درست اندازہ ہے۔"

"اور یہ بھی کہ آپ بیربل کی چوائس پہ بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ ماضی میں بیربل کے ساتھ ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ میں اور بی ایک عرصہ دوست رہے ہیں، سو میں جانتی ہوں کہ اس کی زندگی میں..."

"آگے بولو۔" اس نے ہاتھ کو گھمایا۔ جلدی کا اشارہ کیا۔ سوزی کے چہرے کی جوت بجھ گئی لیکن وہ جلدی جلدی کہنے لگی۔

"میرا مطلب ہے.... آپ کو یقیناً کچھ خدشات ہوں گے۔ سو آپ کی تسلی کے لیے کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" وہ اسی نرمی سے کہہ رہی تھی۔ ماہر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔

"میں نے اور بیربل نے ایک پری نپ سائن کیا ہے۔"

(پری نپچوئل ایگریمنٹ اس معاہدے کو کہتے ہیں جو شادی سے پہلے میاں بیوی سائن کرتے ہیں جس کے مطابق طلاق کی صورت میں دونوں ایک دوسرے کی دولت یا جائیداد میں حصے دار نہیں بن سکتے۔ یہ عموماً تب سائن کیے جاتے ہیں جب دونوں

پیچھے نہیں بھاگتی جن کے پیچھے دوسری عورتیں بھاگتی ہیں۔ میں ورکنگ وومن ہوں۔ اپنی محنت سے اپنی لگژریز افورڈ کرسکتی ہوں۔ بیربل اپنا کام کرے گا اور میں اپنا کام۔ ہم اپنی زندگی شیئر کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھی بنیں گے۔ لیکن ہم پیسے شیئر نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا پہلے دن سے معاہدہ ہے۔"

ماہر بالکل خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو ہال میں سناٹا چھا گیا۔

"کیا آپ ہم سے ناراض ہونے کی بجائے ہمیں اپنی بلیسنگز ——— (دعائیں) دے سکتے ہیں؟"

وہ دونوں آنکھوں میں فکرمندی اور امید لیے سامنے کھڑے تھے۔

"اور تمہارے گھر والوں کی دعائیں؟"

سوزی کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "ماں ناراض ہیں۔ میں نے انہیں آج بتایا ہے۔ وہ امریکہ میں ہیں اور فی الحال میری کالز نہیں لے رہیں۔" اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے لیکن اس نے جیسے آنسو نگل لیے۔ "مجھے احساس ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے لیے ایک فیصلہ لے کر کچھ غلط نہیں کیا۔ لیکن آپ لوگوں کو اعتماد میں نہ لے کر غلط کیا ہے۔ اگر آپ اس فیصلے کو قبول کرلیں تو وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ رکی۔ پھر دہرایا۔ "وہ میری ماں ہیں۔ مجھے ان کو منانے کے لیے بھی آپ کی مدد چاہیے۔"

مالا کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے بے اختیار ماہر کی طرف گردن موڑی۔

ماہر کے تاثرات نہیں بدلے تھے۔

"میرے پاس قبول کرنے کے سوا کیا آپشن ہے، سوزین خانم؟ فیصلہ تم لوگ کرچکے ہو۔ میں صرف اتنا کرسکتا ہوں کہ..... فیضی خانم..." زور سے آواز دی۔ بیربل اور سوزی کا سانس رک گیا۔

فیضی خانم بھاگتی ہوئی آئیں۔ قدرے ڈر کے اسے دیکھا۔

"آپ سوزین خانم کے برتن لگادیں۔ وہ آج سے اس گھر کی ممبر ہیں۔"

سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

سوزین مسکرادی۔ بے اختیار بیربل کو دیکھا۔ وہ بھی نروس سا مسکرایا۔ البتہ کرسی پر بیٹھنے اور برتن لگنے تک وہ بار بار پریشانی سے ماہر کو دیکھتا تھا جو اب گود میں نیپکن بچھا رہا تھا۔

کھانا خاموشی سے سرو ہوا۔ خاموشی سے کھایا جانے لگا۔ اسے اپنا آپ بس ایک تماشائی لگ رہا تھا۔ ماہر نے اسے کیوں بلایا؟ بیربل تو چاہتا تھا کہ وہ موجود ہوتا کہ اس کی بے عزتی نہ کی جائے۔ وہ بے دلی سے کھانے لگی۔ البتہ دیکھ سکتی تھی کہ بیربل اور سوزین نے تھوڑا تھوڑا کھایا ہے۔ ڈائننگ ہال کی فضا ابھی تک تناؤ سے بھری تھی۔ ماہر نے یہی الفاظ اگر خوش دلی سے مسکرا کے کہے ہوتے تو وہ سب مطمئن ہوتے۔ لیکن نہیں۔ کلاسک ماہر فرید۔

"ہم کل ہنی مون کے لیے نکل رہے ہیں۔" بیربل نے کھانے کے اختتام پہ اطلاع دی۔

"کہاں جاؤ گے تم لوگ؟" وہ مسکرا کے گفتگو میں شریک ہوئی۔ شاید ماحول کا تناؤ کم ہو۔

"مونٹینیگرو۔" وہ قدرے جوش سے بتانے لگا۔ "ابھی تک ہم ہوٹل میں تھے۔ وہیں سے ایئرپورٹ جائیں گے۔ مگر صرف چار دن کے لیے کیونکہ پھر... (سوزی کو دیکھا۔ محبت اور فخر سے) ...سوزی کی ایک اہم عدالتی سماعت ہے۔"

"زیادہ دن کام سے آف بھی نہیں لے سکتی نا۔" وہ مسکرائی۔

بیربل نے بات جاری رکھی۔ "واپس آ کے پھر ہم..."

"جو بھی کرنا ہے کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ کانٹے میں پاستا کا ٹکڑا پھنساتا اسی اکتاہٹ سے بولا تھا۔ میز پہ ایک دفعہ پھر سے سناٹا چھا گیا۔ پھر ماہر نے چہرہ اٹھایا۔

"جب میں نے کہا کہ میں تمہارے فیصلے کو قبول کر چکا ہوں تو کر چکا ہوں۔ " پھر انہی نظروں سے سوزی کو دیکھا۔ "قاسم فرید کے گھر میں خوش آمدید۔ اس گھر کو اپنا سمجھو۔ فیضی حانم کو کنگ کرتی ہیں۔ تم ان سے اپنی مرضی کا جو بھی بنوانا چاہو بنوا سکتی ہو۔ " پھر اطراف میں دیکھا۔ "اس گھر کا انٹیریئر میں نے بنایا ہے۔ لیکن تم چاہو تو تبدیلیاں کر سکتی ہو۔ جیسے چاہو رہو۔ میری طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ "

"نہیں، ماہر۔ اٹس او کے۔ " بیربل نے بے اختیار بات کاٹی۔

"اب ہمیں اپنی الگ جگہ پہ شفٹ ہو جانا چاہیے۔ "اس کا انداز نارمل تھا کہ یہی اس شہر کا اصول تھا۔ شادی شدہ جوڑے کو جلد از جلد اپنی خودمختار جگہ چاہیے ہوتی تھی۔

ہلال نے چونک کے سر اٹھایا۔ "آپ ... یہاں سے چلے جائیں گے؟"

"دور نہیں۔ " بیربل مسکرایا۔ "ساتھ والے اپارٹمنٹ میں۔ "

کشمالہ بیگم نے بہت آہستہ سے چمچہ کانٹا نیچے رکھا اور نگاہیں اٹھا کے ماہر کو دیکھا۔

اسے بالآخر سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی تھی۔

"ساتھ والے اپارٹمنٹ میں؟ " ماہر نے ناسمجھی سے بیربل کو دیکھا۔

"ہاں۔ وہ بھی تو ہمارا ہی ہے۔ یوں ہم قریب بھی رہیں گے اور ہماری اپنی اسپیس بھی ہوگی۔ "

ایک ابال سا مالا کے سینے میں اٹھا۔ مگر ابھی اسے ضبط کرنا تھا۔

"مگر وہ تو میں نے مالا کو دے دیا ہے۔ "

بیربل اور سوزی نے چونک کے مالا کو دیکھا۔ وہ صرف ماہر کو دیکھ رہی تھی۔ لب بھینچے۔ ضبط کیے۔ آنکھوں میں چنگاریاں لیے۔

"مالا کو؟"

"ہاں مالا کو۔ اس کا ایکس ہزبنڈ واپس آ گیا ہے شہر میں۔ اسے ایک محفوظ جگہ چاہیے تھی۔ میں اسے بلت میں نہیں چھوڑ سکتا۔ " ماہر کے تاثرات بگڑے۔ "اگر تم فیصلہ لینے سے پہلے مجھے بتا دیتے تو میں یہ نہ کرتا۔ لیکن تم نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ "

کشمالہ بہت سے جذبات حلق سے نیچے دھکیلے بدقت کھنکھاری۔ "میری وجہ سے آپ... "

"ہم بھائی بات کر رہے ہیں۔ ہمیں بات کرنے دو۔ " ہاتھ اٹھا کے روکا۔ "میں نے دو مہینے بعد ویسے بھی لندن چلے جانا ہے۔ مالا بھی ایک دو ماہ تک چلی جائے گی۔ دونوں اپارٹمنٹ تمہارے ہوں گے۔ تب تک یہیں رہو یا کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ تمہاری مرضی ہے۔ " وہ رکا۔ تاثرات مزید برہم ہوئے۔ "اب میں مالا کا سامان یہاں سے اٹھوا تو نہیں... "

"نہیں نہیں۔ "

"بالکل بھی نہیں۔ "

بیربل اور سوزی ایک ساتھ بولے تھے۔ نفی میں سر ہلاتے۔ فکرمندی سے۔

"مالا، تم آرام سے وہاں رہو۔ یہ میرا ہی گھر ہے۔ ڈونٹ وری۔ "

"جی۔ ویسے بھی اچھا ہے نا۔ مجھے تو ماہر اور ہلال کے ساتھ رہنا زیادہ اچھا لگے گا۔ ایک فیملی کی طرح۔ "سوزی نے کہتے ہوئے بہت امید سے ماہر کو دیکھا۔ مگر وہاں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"گڈ۔ بات ختم۔ "وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پہ جھک گیا۔ اب صرف ماہر فرید کے چمچہ کانٹے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ دونوں معذرت کر کے جلد ہی اٹھ گئے۔ انہیں ہوٹل جا کے پیکنگ کرنی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ہلال بھی اسی خاموشی سے اٹھ گئی۔ اس نے بھی کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔

کھانا صرف ایک شخص نے ٹھیک سے کھایا تھا۔ اور ابھی تک کھا رہا تھا۔

خاموشی پہ چہرہ اٹھائے دیکھا۔ وہ کہنیاں میز پر رکھے اس کی طرف پوری گھوم کے بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

"کیا؟"

"اور میں سمجھی تم میری حفاظت کے لیے مجھے یہاں لائے ہو۔ تمہارا ایک اور احسان بڑھ گیا تھا مجھ پہ۔ لیکن نہیں۔" سر دائیں بائیں ہلایا۔ "تمہیں بیربل کو اس اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے سے روکنا تھا۔ اتنی جلدی تمہیں کرایہ دار مل نہیں سکتا تھا۔ سو تم نے مجھے استعمال کیا۔"

"کہا تھا نا۔ دیکھو اور سیکھو۔" وہ مسکرایا۔ یہ اس کی اس شام پہلی مسکراہٹ تھی۔

"اُف، ماہر.... اُف۔" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ الفاظ ختم ہو گئے۔

"حیرت ہے تم نے احتجاج نہیں کیا۔ میں سمجھا مجھے تمہیں اپارٹمنٹ خالی کرنے سے بزور قوت روکنا پڑے گا۔"

مالا نے گہری سانس لی۔ پھر اسی کے انداز میں مسکرائی۔

"کیوں احتجاج کرتی؟ دوپہر سے تمہارے احسان کے نیچے بوجھل تھی۔ مگر اب تم میرے احسان تلے ہو۔ اچھا لگا جان کر۔"

اس کے کندھے اس بوجھ سے آزاد ہو چکے تھے۔ وہ نکل جاتی تب بھی وہ ان کے ہنی مون سے لوٹنے سے پہلے تک کسی اور کو وہاں لے آتا۔ کرایہ دار بنا کے۔ پھر اسے بھی اپنے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

"کچھ کچھ سمجھنے لگ گئی ہو تم مجھے۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"کیوں سوزین کو اس گھر میں رکھنا چاہتے ہو؟"

"Keep your enemies closer." (اپنے دشمنوں کو قریب رکھو)

"وہ دشمن نہیں، تمہارے بھائی کی بیوی ہے۔ تم ایک فیملی بن کے بھی رہ سکتے ہو۔ ویسے بھی وہ لالچی نہیں ہے۔ وہ سر سے پیر تک امارت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نے تمہاری تسلی کے لیے پری نپ سائن کر لیا ہے۔ تم خلوصِ دل سے اس کو ایک چانس دے سکتے ہو۔ کیا معلوم وہ بیربل کی زندگی سنوار دے؟ تم میری بات سن رہے ہو؟"

"میں کھانا کھا رہا ہوں۔"

مالا نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"ایسے مت کرو، ماہر۔ بیربل کو اس سے دور کرنے کے لیے کوئی نئی پلاننگ مت کرو۔ تم اپنا بھائی کھو دو گے۔"

ماہر نے پلیٹ پرے دھکیلی۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"دیکھو اور سیکھو۔" پھر رکا۔ "چائے؟"

"نو تھینکس۔ مجھے بلانے کا مقصد پورا ہو گیا؟ گڈ نائٹ۔" رکھائی سے کہتی وہ اٹھ گئی۔ وہ اٹھنے لگا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کے ماہر کو روک دیا۔

"میں خود جا سکتی ہوں۔"

کچن میں کام کرتی فیضی خانم نے پلٹ کے اسے دیکھا جو کاریڈور میں آگے جا رہی تھی۔ پھر گہری سانس لی۔ اس گھر میں نئے نئے کام ہونے لگے تھے۔ بیربل ایک بیوی لے آیا تھا اور ماہر ایک لڑکی کے جوتے برداشت کرنے پہ مجبور تھا۔ اللہ اللہ۔

مالا کے جانے کے بعد فرید لار پھر خاموش ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے کے بجائے ہلال کی جانب آیا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا اور وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی۔

"لالی؟" وہ اس کے قریب آیا۔ ایک ننھا اسٹول کھینچا جو ڈریسنگ ٹیبل کا حصہ تھا اور اس کے سامنے بیٹھا۔

وہ گردن سیدھی رکھے کھڑکی پہ آنکھیں جمائے ہوئے تھی۔ ابرو اکٹھے بھنچ رکھے تھے۔

"بیربل بھائی نے ہمیں شادی پہ کیوں نہیں بلایا؟"

"اس کو لگا ہم اسے یہ نہیں کرنے دیں گے۔"

وہ غور سے ہلال کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

"وہ اچھی ہے۔ پھر آپ اس سے ایسے بات کیوں کر رہے تھے؟"

"وہ ہمارے لیے اچھی نہیں ہے۔"

"اس کی انرجی بری نہیں تھی۔ مختلف تھی۔ وہ بیربل بھائی کے ساتھ آنے والی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ وہ واقعی اس گھر میں فیملی کی طرح رہنا چاہتی ہے۔ پھر آپ کیوں...؟"

"میں چھٹی حس سے زیادہ اپنی پانچ حسیات پہ بھروسہ کرتا ہوں، ہلال۔"

"اب کیا ہمارے گھر کا ہر ڈنر ایسے ہی ہوگا؟ ٹینشن میں؟"

وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ "میں کچھ اور پوچھنے آیا ہوں۔"

ہلال اسی طرح چہرہ کھڑکی کی طرف موڑے بیٹھی رہی۔ اس زاویے سے باہر صرف آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

"تم نے مالا سے اپنی ہسٹری کیوں چھپائی؟"

ہلال کے ابرو چونکنے والے انداز میں اٹھے۔ اسی پل پرندوں کا ایک غول کھڑکی کے قریب سے گزرا۔ مدھم سی غٹرغوں سنائی دی۔ پھر خاموشی۔

"کچھ چیزیں وقت سے پہلے نہیں دیکھنی چاہئیں۔"

"کیا کوئی چیز تم سے پھر سے باتیں کرنے لگی ہے؟ کوئی آواز؟ کوئی وژن؟"

وہ غور سے اس کے برف جیسے چہرے کو پڑھنا چاہ رہا تھا۔

"میں عادی ہوں۔"

ہلال باہر دیکھتی رہی۔ یا شاید اپنے اندر۔ وہ فیصلہ نہ کرسکا۔

"تمہیں ان چیزوں کو بلاک آؤٹ کرنا ہوگا، لالی۔ یہ زندگی مشکل بنادیتی ہیں۔ مجھے دیکھو۔ میں نے ایک عرصہ ہوا یہ آوازیں سننا چھوڑ دی ہیں۔ ان کی طرف جتنی توجہ کرو، یہ اتنی بڑی ہوجاتی ہیں۔ توجہ ہٹاؤ تو غائب ہونے لگتی ہیں۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ البتہ ایک غیر آرام دہ سا احساس پر پھیلائے ماہر فرید کے کندھوں پہ دباؤ ڈال رہا تھا۔

یہ احساس کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔

اور اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ جب ہلال نے کچھ نہیں بتانا تو اس نے کچھ نہیں بتانا۔

☆☆☆

خزاں اس سڑک کے دونوں کنارے اُگے درختوں پہ اتری تھی۔ وین کوور کے یہ درخت اس موسم میں رنگ بدل لیتے تھے۔ نارنجی سرخ اور بھورے مائل کے درمیان۔ گھاس پہ جگہ جگہ خشک پتے گرے تھے۔

ایک گھر کے ڈرائیو وے پہ آرائشی کدو رکھے تھے جو غالباً ہالووین کی رات سے اب تک پڑے تھے۔

اس گھر کے مقابل ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ باہر رکھے بنچ کے ساتھ وہیل چیئر تھی جس پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ لمبا کوٹ پہنے۔ گردن میں مفلر۔ سر پر ٹوپی۔ چھوٹی داڑھی۔ عینک۔ جھریوں زدہ استخوانی ہاتھ کی پشت پر آئی وی لائن کی باقیات موجود تھیں۔ اور چہرے پر مسکراہٹ۔

"کیا چیز تمہیں یہاں لے آئی، ماہ بینہ؟"

وہ وہیل چیئر کا رخ بنچ کی طرف موڑے ہوئے تھے جس پر ماہی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈاکٹر رائند کے لیے افسوس اور ہمدردی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟"

"کینسر کا یہی مسئلہ ہے۔ ایک دفعہ لاحق ہوجائے تو بس... ہر گفتگو اسی بارے میں ہوتی ہے۔" وہ مسکرائے۔ چہرے کی جھریوں میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر رائند کی بیٹی نے اسے بتایا تھا کہ دو سال پہلے ان کو کینسر ہوا تھا۔ آخری چند ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔ اس مہلت کو ختم ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ اور وہ اب تک جی رہے تھے البتہ بہت کمزور اور

لاغر ہو گئے تھے۔ کیمو کے تازہ ترین سیشن کو چند ہفتے گزر چکے تھے، سو داڑھی اور بال واپس آنے لگے تھے۔ اور مسکراہٹ تو کبھی جدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

"میں دنیا کی نظر میں ایک اچھی زندگی گزار رہی ہوں، شیخ۔ یعنی "....اس نے سر جھکا دیا۔ "میرے بچے ہیں۔ شوہر ہے۔ گھر ہے۔ شاید دوسروں کو لگتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔ لیکن صبح شام میرے کیا چیلنجز ہیں، یہ میں جانتی ہوں۔ کبھی کبھی بچے مجھے ایسا پاگل کر دیتے ہیں کہ میں باتھ روم میں چھپ کے زور زور سے روتی ہوں۔ کبھی میری اور عباد کی ایسی لڑائی ہوتی ہے کہ ہمسائے تک سنتے ہیں۔ اور کبھی یہی بچے مجھے بہت ہنساتے ہیں۔ عباد اور میں ٹھیک ہو جاتے ہیں اور ہم ساتھ ٹریول پلان کرتے ہیں۔ جاب میں کامیابیاں بھی ملتی ہیں اور ساتھ ہی ایسے ایسے فنانشل مسئلے درپیش آتے ہیں کہ میں چکرا کے رہ جاتی ہوں۔ ساتھ رہتے رہتے تو جانور بھی ایک دوسرے سے عاجز آ جائیں، ہم چاروں تو پھر انسان ہیں۔ ہم مختلف موڈز سے گزرتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ پرفیکٹ نہیں ہے۔ لیکن دوسروں کو لگتا ہے کہ ماہی سیٹلڈ ہے۔"

"اور؟"

ماہی نے اداس پلکیں اٹھائیں۔

"اتنے عرصے بعد پھر سے وہی چیزیں شروع ہو رہی ہیں۔ میری کھڑکی پہ خون پھینکا گیا ہے جو کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ پولیس کو بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔"

وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھے گئے۔

"اور تمہیں کیا محسوس ہوا؟"

"خوف۔ بے بسی۔ کوئی جادو کر رہا ہے مجھ پہ پھر سے۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"میں کیا کروں؟ میں کیسے اس سب سے نکلوں؟ آپ مجھے کچھ پڑھنے کے لیے بتائیں۔ پکا وعدہ میں نمازیں بھی پوری پڑھوں گی۔ دعائیں بھی مانگوں گی۔ اذکار اور تسبیحات بھی مس نہیں کروں گی۔" وہ جلدی جلدی دہرا رہی تھی۔

"اور اگر کسی دن بھول گئیں تو؟"

ماہی گنگ سی انہیں دیکھنے لگی۔

"کسی دن بھول جاؤ گی۔ کسی دن دعا مس ہو جائے گی۔ اس دن جادو نقب لگا کے تمہاری زندگی میں داخل ہو جائے گا۔ پھر کیا کرو گی؟"

ماہی نے ہاتھ باہم پھنسا لیے۔ لب کاٹے۔ وہ اس کے بدترین خدشات کو زبان دے رہے تھے۔ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی، لیکن وہ کہہ رہے تھے۔

"اور اگر اذکار کو پڑھتے ہوئے کمی کوتاہی ہو گئی؟ ان کا اثر دوسرے گناہوں جیسے جھوٹ غیبت کی وجہ سے زائل ہو گیا اور جادو تمہاری فیملی کو نقصان پہنچا گیا.... تو؟ اس کے بعد کیا کرو گی، ماہ بینہ؟"

آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گرنے لگے۔

"ایسے مت کہیں۔ عورت اپنا خون بہا کے اپنا گھر بناتی ہے۔ بچے پالتی ہے۔ یہ خیال کہ کسی کا جادو اور حسد میری خوشیوں کو نظر لگا سکتا ہے.... اُف ... ایسے مت کہیں۔" دل خزاں کے پتوں کی طرح کانپا تھا۔

"تمہارا سب سے بڑا خوف کیا ہے؟"

ماہی کے ذہن میں چھپے سارے خوف سامنے لہرانے لگے۔ بڑے بڑے شیاطین جو الماری سے باہر آ گئے تھے۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ان کو زبان نہیں دے سکتی تھی۔

"میں بتائے دیتا ہوں۔ یہی کہ شوہر چھن جائے گا، بچے چھن جائیں گے، رزق چھن جائے گا، گھر چھن جائے گا۔ نعمتوں کے چھننے کا خوف، ہے نا؟"

اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہمیں جادو سے خوف نہیں آتا۔ ہمیں جادو کی وجہ سے اپنی نعمتوں کے چھن جانے کا خوف ستاتا ہے۔ جادو ہم سے ہر وہ شے چھین لے گا جس سے ہم

محبت کرتے ہیں۔"

وہ اب کے سر بھی نہ ہلا سکی۔ کیا کینسر انہیں مزید دانا بنا گیا تھا یا سنگ دل؟ وہ ایسے کیوں کہہ رہے تھے؟

"کیا کرو گی اگر جادو نقب لگا کے تمہاری دنیا میں داخل ہو گیا؟"

اس نے بس نفی میں سر ہلایا۔ ہوا کا سرد جھونکا قریب آیا اور ان کے گرد بھورے پتے بکھیر گیا۔ اونچے ، نارنجی درخت چپ چاپ کھڑے اپنے آسیبوں سمیت ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ آنکھیں ناک کٹے ہوئے حلوہ کدو بھی ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

"میں نے کئی برس پہلے بھی تمہیں ایک نصیحت کی تھی۔ آج دہراتا ہوں۔ جادو توڑنے کے بہت طریقے ہیں۔ کچھ جادو کے ذریعے۔ کچھ قرآن اور مسنون اذکار کے ذریعے۔ دونوں طریقوں سے جادو کٹ جاتا ہے۔ مگر جادو کے خلاف انسان کا سب سے پہلا ہتھیار یہ سب نہیں ہوتا۔"

اسے کچھ یاد آرہا تھا۔ کیا کہا تھا انہوں نے؟

"جادو کے خلاف تمہارا پہلا ہتھیار ہے، یہ یاد رکھنا کہ ..... جادو کس کی اجازت سے ہوتا ہے۔"

انہوں نے انگشت شہادت اوپر اٹھائی۔

"جادو صرف اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے۔ وہ اجازت نہ دے تو جادو اثر نہیں کرتا۔ اور وہ جادو کو اجازت دے دے تو تم صبح شام کتنے ہی اذکار کیوں نہ پڑھو، جادو اثر کر جائے گا۔ جو مصیبت تمہیں پہنچنی ہے وہ پہنچ جائے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟ اذکار نہ پڑھوں۔"

"ضرور پڑھو۔ وہی تو تمہیں جادو سے محفوظ رکھیں گے۔ مگر یاد رکھو..... پہلا ہتھیار یہ یقین ہے کہ جادو جس کی اجازت سے ہوتا ہے، وہی تمہیں اس سے نکالے گا۔ جادو سے ڈرنے کے بجائے اس کا سامنا کرنے کو تیار رہو۔ ہر انسان کو اپنے حصے کی مصیبت کاٹنی ہے۔ اگر تمہارے گھر، شوہر یا بچوں کو نقصان پہنچنا ہے تو وہ پہنچ کے رہے گا۔ مگر..."

"مگر؟" درختوں کے پتے بھی سانس روک کے سننے لگے۔ اور ان پر بیٹھے جنات بھی۔

"مگر اس نقصان کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہو گا جو تمہیں سنبھال لے گا۔ اس کو ایمان کہتے ہیں۔ انسان کا اتنا پختہ یقین رکھنا کہ بھلے میرے اوپر سو جادوگر بھی جادو کریں، جب تک اللہ میرے ساتھ ہے، اول تو جادو اثر نہیں کرے گا، اور اگر کر گیا اور مجھ سے کچھ چھن گیا تو اللہ مجھے وہ لوٹا دے گا۔ مجھے مصیبت پہنچ بھی گئی تو اللہ مجھے سنبھال لے گا۔ یہ یقین جب دل میں پختہ ہو جائے تو انسان جادو کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی سوچ جادوگروں کے خوف سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے تم لوگ ڈالو اپنی رسیاں۔ اور لگاؤ اپنا کھیل تماشہ۔ مجھے پرواہ نہیں کیونکہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ پھر مجھے کوئی مصیبت پہنچے یا میرا کوئی نقصان ہو... یا کوئی بیماری مل جائے... تو وہ میرے لیے میرے رب کے تحفے ہیں۔"

"بیماری تحفہ کیسے ہوتی ہے؟" اس کی نگاہیں ان کے بوڑھے ہاتھ کی پشت پہ لگی آئی وی لائن تک اٹھیں۔

"ہر چیز اس کا تحفہ ہے۔ ٹریجڈی بھی۔ خوشی بھی۔ اللہ آپ کو دونوں تحفے تھمائے گا۔ اپنے ہاتھ بڑھائے رکھو۔ وہ کسی وقت کچھ بھی تھما سکتا ہے۔ جو بھی تھمائے اسے قبول کر لو۔ ہاتھ نیچے نہ کرو۔ خوف سے خود کو بند نہ کر لو۔ ہاتھ پھیلائے رکھو۔ اگر ٹریجڈی ملے تو اس سے نکلنے کی کوشش کرو۔ اگر خوشی ملے تو اس کا شکر ادا کرو۔ لیکن شکوہ نہیں کرو۔ انسانوں کو الزام نہ دو۔ جادوگروں یا جنوں سے خوف نہ کھاؤ۔ یہ تو بس ایک ذریعہ ہیں اس مصیبت کو تم تک پہنچانے میں جو برسوں پہلے تمہاری قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ مکتوب تحفے۔"

"مکتوب تحفے۔" وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔ "یعنی جو ہونا ہے میرے ساتھ وہ ہو کر رہے گا۔ کوئی جادو کرے یا نہ کرے، نظر لگے یا نہ لگے۔ جو مصیبت میری زندگی میں لکھی ہے، وہ مجھے

ڈھونڈ لے گی۔"

"اور جو خوشی تمہاری قسمت میں لکھی ہے، اسے تم تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ نہ کسی کی بددعا، نہ کسی کا جادو، نہ کسی کی سازش۔"

اس نے گیلے چہرے اور مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

"یعنی میں اس امید کے ساتھ اذکار، نمازیں اور قرآن کثرت سے پڑھوں کہ یہ جادو کے خلاف میری حفاظت کریں گے۔ اور اگر ان کے باوجود بھی جادو کے اثر سے مجھ سے کچھ چھن بھی گیا تو اللہ ہے نا۔ وہ میرے اندر کوئی خیر دیکھے گا تو مجھے لوٹا دے گا ہر وہ چیز جو مجھ سے چھینی گئی تھی۔"

وہ ان سے زیادہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے خون آلود شیشے کی دیوار آجاتی اور کیسے اس نے اسکرب کر کر کے اس خون کو صاف کیا تھا۔ یہ واقعات ہوتے رہیں گے۔ اسے ان سے ڈرنا چھوڑنا تھا۔

☆☆☆

جیسے جیسے کیلنڈر نومبر کے دن گزارتا بڑھ رہا تھا استنبول کی فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ سریار کی اس سڑک کے کنارے کشمالہ مبین چل رہی تھی۔ پس منظر میں اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اونچے ٹاورز کھڑے تھے۔ فون کان سے لگا رکھا تھا۔ لمبے بھورے کوٹ کے اوپر کراس باڈی بیگ پہنے وہ ماہی کا آڈیو میسج سن رہی تھی، جس میں اس نے کھڑکی پہ خون پھینکے جانے کی داستان اتھل پتھل سانسوں کے درمیان سنائی تھی۔

میسج سنتے ہوئے مالا کے ابرو بھنچے ہوئے اور دانت بے دردی سے ہونٹ کچل رہے تھے۔ فون نیچے کر کے اس نے جوابی میسج ریکارڈ کرنا چاہا کہ احساس ہوا ایک سیاہ کار اس کے قریب آ کے رکی ہے۔ وہ چونک کے پلٹی۔ کار کی پلیٹ دیکھ کے ماتھے کے بل ڈھیلے ہوئے۔ گہری سانس خارج کی۔ وہ اس گفتگو کے لیے تیار تھی۔

پچھلی سیٹ کا شیشہ نیچے ہوا اور ماہر فرید کا چہرہ دکھائی دیا۔

"میں نے کہا تھا ہم آفس ساتھ جائیں گے۔" اس کا اشارہ صبح والے ٹیکسٹ کی جانب تھا۔

"اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ میں اپنی عادتیں خراب نہیں کرنا چاہتی۔" وہ موبائل والا ہاتھ نیچے کیے مسکراہٹ دبائے بولی۔

"ہم نے ایک ہی جگہ جانا ہے۔" ماہر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ یعنی اندر بیٹھ جاؤ۔

"تم نے کہا تھا میں قید نہیں ہوں۔ اپنی مرضی سے گھوم پھر سکتی ہوں۔"

"اس سردی میں صبح صبح گھوم پھر کر تم نے کیا کرنا ہے؟"

"کہیں بھی رک کے کافی اور ڈونٹ خرید سکتی ہوں۔ تمہاری جج منٹل نظروں کے خوف سے آزاد ہو کے۔"

"آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ آفس چلنا ہے؟"

"تاکہ تمہارے آفس والے مجھے بھی تمہاری طرح سمجھیں۔ سائیکو پیتھ وو ڈالرز۔" آنکھیں گھمائیں۔

ماہر دھیرے سے ہنس دیا۔ ڈرائیور اردل کی مسکراہٹ بھی بیک ویو مرر میں دکھائی دی۔

"یہ اس نام سے بہتر ہے جو بیر بل کی بیکری کے ملازموں نے اس کا رکھا ہے۔"

"کیا؟"

"پنوکیو۔"

کشمالہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

"واقعی۔ تمہارا نک نیم زیادہ بہتر ہے۔" وہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔ سڑک کنارے کھڑی، گردن کار کی کھڑکی پہ جھکائے۔

"تم نے ابھی آفس والوں کی تصحیح نہیں کی؟"

"کس چیز کی تصحیح؟"

"انہوں نے تمہیں گوگل کیا ہوگا اور وہ افواہ

پڑھی ہوگی نا تمہارے بارے۔ وہ ان سین اسائلم (پاگل خانہ) والی۔"

"وہ افواہ نہیں ہے۔"

مالا چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔ اچنبھے سے ذرا پیچھے ہوئی۔ کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟

"تمہاری کار کا نمبر ٹرپل فائیو کیوں ہے؟" بنا سوچے سمجھے پوچھا۔ ہر دفعہ اس کی کار دیکھ کے وہ یہ سوچتی تھی، لیکن پوچھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

"کیونکہ یہ میرا نمبر ہے۔"

"تمہارا لکی نمبر؟"

"نہیں۔ صرف نمبر۔" اس نے بٹن دبایا۔ شیشہ اوپر اٹھتا گیا اور دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ کشمالہ کو اس میں اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر پر جمی ٹوپی میں سے چند بال نکل رہے تھے۔ بے اختیار بال ٹوپی میں اڑسے۔ تب تک کار آگے بڑھ گئی۔

وہ آنکھیں چھوٹی کیے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔

اس نے یہ بات گزشتہ ماہ و سال میں چند ایک دفعہ سنی تھی۔ اصلی کیف جمال سے۔ انٹرنیٹ پہ کی گئی سرچ سے۔ اور شاید کسی مقام پہ زیادہ سے بھی۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ لیکن تب زندگی میں اتنا کچھ چل رہا تھا کہ بیٹھ کے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس وقت اس نے یقین بھی کر لیا تھا۔ لیکن اب جہاں بہت ساری دھند چھٹ چکی تھی، اس کا ذہن یہ ماننے سے انکاری تھا کہ ماہر فرید جیسا انسان کبھی کسی ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل ہو سکتا ہے۔ سائیکو پیتھ ایسے نہیں ہوتے۔

یا ہو سکتے ہیں؟

کیا وہ واقعی ماہر فرید کو جانتی تھی؟

☆☆☆

کیف کی عمارت آج کچھ زیادہ ہی بے رونق تھی۔ شاید آج بہت سے ورکرز کا ورک فرام ہوم تھا۔ یا شاید اس کے ٹیب کی خالی اسکرین اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ کیا بنائے وہ؟ کوئی چیز انسپائر نہیں کر پا رہی تھی۔

اسکرین کو دیکھتے دیکھتے جب اس کی آنکھیں تھک گئیں تو مالا نے انہیں مسلا۔ پھر انگلیوں کو دیکھا تو پوروں پہ مسکارے کے دھبے تھے۔ اُف۔ وہ کوفت سے اٹھی اور مین ہال کی بغلی راہداری کی طرف آئی جہاں واش رومز بنے تھے۔

"ماہر بے کا نمبر ٹرپل فائیو کیوں ہے؟"

واش روم ایریا کی روشنیاں تیز سفید اور فضا آرکڈ کی خوشبو سے معطر تھی۔ دیوار گیر آئینے کے سامنے چند سنک بنے تھے۔ ایک ستون سے شبنم ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ گردن موبائل پہ جھکی تھی۔ مالا نے نل کھولتے ہی سوال داغا۔

"یہ ان کا نمبر ہے۔" وہ بے چینی سے موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔

مالا نے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے گیلے ٹشو کی نوک سے آنکھ کے کنارے صاف کیے۔

"لکی نمبر ہے کیا؟ فون نمبر، کار کی نمبر پلیٹ، ہر جگہ وہ اتنے سارے فائیو کیوں استعمال کرتا ہے؟" جوتے سے ٹریش کین کا لیور دبایا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ ٹشو اس میں پھینکا۔ ٹریش کین نے فوراً اسے ہڑپ کر کے منہ بند کر دیا۔

"ان کی ڈیٹ آف برتھ ہے نا۔ پانچ مئی۔"

"اوہ۔" مالا چونک کے اس کی طرف گھومی۔ لیکن شبنم وہاں متوجہ نہیں تھی۔ وہ انگوٹھے کا ناخن دانت سے کتر رہی تھی۔

"اسے ان بلاک تو نہیں کر دیا؟"

شبنم نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔

"کون، خلیل؟ نہیں۔ وہ تو بلاکڈ ہے لیکن..." گلابی پڑتے گنجے ناخن والا انگوٹھا نیچے کیا اور سر جھکا دیا۔

"لیکن اب کوئی اور ہے؟" مالا آئینے کی طرف پشت کیے یوں کھڑی تھی کہ دونوں ہتھیلیاں دائیں بائیں واش بیسن پہ جمی تھیں۔

شبنم کے دانتوں نے اب ہونٹ کو کترنا شروع کر دیا۔

"کیا یہ حلیل سے بہتر ہے؟"

"بات یہ نہیں ہے کہ وہ بہتر تھا یا یہ۔" شبنم نے آنکھیں اٹھائیں تو عینک کے شیشوں کے پار نمی تھی۔ "یہ اچھا ہے۔ میرے اسٹینڈرڈز پہ پورا اترتا ہے۔ لیکن مسئلہ وہ نہیں ہے۔ مسئلہ میں ہوں۔"

"یعنی؟"

"یعنی میں ایک دفعہ پھر اس سے متاثر ہو چکی ہوں۔ حلیل کو بلاک کرنے کے بعد مجھے لگا تھا میں آزاد ہو گئی ہوں اور دوبارہ کوئی مرد مجھے ایسے محسوس نہیں کروائے گا۔ لیکن اب..." اس نے موبائل اسکرین مالا کے سامنے لہرائی۔ چہرہ روہانسا ہو گیا۔ "وہی بے چینی۔ وہی تکلیف۔ گھنٹوں اس کے میسج کا انتظار۔ وہ میسج نہ کرے تو مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے۔ میں کیا کروں؟ کیا یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا؟"

"ہاں۔ یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا کیونکہ..." کشمالہ پلٹی اور نل کے کنارے سے دو چیزیں اٹھائیں۔ ایک نقلی آرکڈ کا گملہ اور ایک ہینڈ واش کی بوتل۔ شبنم چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ گملہ حلیل ہے۔ وہ مرد جو زندگی سے نکل گیا۔" گملہ زور سے سنک کے سنگ مرمر پر رکھا۔

"اور یہ ہینڈ واش تمہارا اگلا ریلیشن شپ ہے۔ وہ مرد جو آگے آئے گا۔"

ہینڈ واش کی بوتل گملے سے ایک فٹ کے فاصلے پہ رکھی۔

"ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ تمہاری نارمل زندگی ہے۔ جب حلیل تمہاری زندگی میں تھا تو تم ہر وقت بے چین اور بے قرار رہتی تھیں۔ اس کے ایک ایک میسج کا انتظار کرتی تھیں۔ لیکن اس کے جانے کے بعد..." مالا نے انگلی سے درمیانی فاصلے کی جانب اشارہ کیا۔ "تم بالکل پرسکون ہو گئی تھیں۔ تمہیں کسی کے میسج کا انتظار نہیں رہتا تھا اور تمہیں لگتا تھا کہ تم خوش ہو۔ لیکن پھر..."

انگلی ہینڈ واش پہ رکھی۔

"ایک نیا شخص آیا اور تم اسی بے چینی کا شکار ہو گئیں۔"

شبنم نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"ایسا ہی ہے۔"

"اور یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ زندگی میں نئے نئے لوگ آئیں گے.... اور..." مالا اب مزید چیزیں اٹھانے لگی۔ سینیٹائزر۔ ٹشو باکس۔ ایک اور گملہ۔ اور انہیں قطار میں ہینڈ واش کے آگے رکھتی گئی۔

"یہ وہ تمام مرد ہیں جو تمہیں زندگی میں ملیں گے۔ ان میں سے کسی کو تم پسند نہیں آؤ گی، کوئی تمہیں پسند نہیں آئے گا۔ لیکن شادی کرنا چاہتی ہو تو بہت سے لوگوں سے ملنا تو ہوگا۔ ہر دو انسانوں کے درمیان ایک گیپ ہوگا۔"

شبنم غور سے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ہر گیپ کے درمیان تم خود کو اچھا محسوس کرو گی۔ آزاد۔ خوش۔ لیکن جیسے ہی کوئی مرد زندگی میں آئے گا تم دوبارہ سے اس کے آگے بے بس ہو جاؤ گی۔"

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ یہ بے چینی اور پریشانی جو تمہیں کسی کے میسج کا انتظار کرتے وقت محسوس ہوتی ہے، وہ دراصل تمہاری زندگی کا حصہ ہے۔ تمہیں وہ ریلیشن شپ میں بہت بڑی ہو کے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب کوئی مرد نہیں ہوتا اور تم گیپ پریڈ میں ہوتی ہو، تب یہ مرد کی طرف سے نہیں ملتی تو تم خوش ہو جاتی ہو کہ یہ ختم ہو گئی۔ مگر یہ دوسرے معاملات میں ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ تمہارے کام میں۔ کسی آن لائن آرڈر کے انتظار میں۔ کسی دوست کی ادھوری بات کو مکمل جاننے کے تجسس میں۔ یہ اینگزائٹی تمہاری ذات کا حصہ بن چکی ہے۔"

"یعنی جیسے ہی کوئی مرد میری زندگی میں آئے گا، یہ اینگزائٹی اس رشتے میں داخل ہو جائے گی۔"

"اور جب وہ مرد چلا جائے گا تو یہ دوسرے معاملات میں گھسی رہے گی۔ اگر تمہیں اس فیلنگ سے نجات چاہیے تو...."

"تو مجھے گیپ کے دوران اپنی اینگزائٹی پہ کام کرنا ہوگا۔"

"بالکل۔ جب تم عام زندگی میں اس اینگزائٹی پہ قابو پالو گی اور خود کو صابر اور ریلیکس رکھنا سیکھ لو گی تو یہ اینگزائٹی اگلے رشتے میں داخل نہیں ہوگی۔ ورنہ یہ ساری زندگی ہر معاملے میں تمہارا پیچھا کرتی رہے گی۔ کل کو تمہاری شادی ہو گئی تو یہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے رشتے کے درمیان بھی آ جائے گی۔ اس لیے ...." وہ آگے بڑھی اور چیزیں واپس اپنی جگہوں پہ رکھنے لگی۔ "ابھی سے اس پہ کام کرو۔"

"اور کیسے کام کروں؟"

کشمالہ نے مڑ کے گھورتے ہوئے اس کو دیکھا۔

"جیسے میں نے پہلے بتایا تھا۔ خود سے پوچھو کہ تم کیا محسوس کر رہی ہو۔ تمہارے جسم میں درد کہاں ہے۔ اور اس درد کا...."

"درد کا رنگ۔ یاد ہے، یاد ہے۔ خود سے پوچھوں۔ سیلف چیک ان۔" شبنم کسی سبق کی طرح دہرانے لگی۔ پھر یاد آیا۔

"تمہارے کام کا کیا ہوا؟"

"تمہارے باس کے اس بورنگ آفس نے دماغ مزید بند کر دیا ہے۔ اس لیے میں ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں شاید مجھے کوئی انسپائریشن مل جائے۔"

"ماہر بے نے پوچھا تو....؟"

"کہہ دینا مالا اپنی مرضی کی مالک ہے۔" مسکرا کے کندھے جھٹکے اور آگے بڑھ گئی۔

اسے اس قرمزی عمارت کی دیواروں پہ ایک بہت خوبصورت سا منظر پینٹ کرنا تھا۔ کیوں نا وہ ایک ایسی جگہ جائے جس کی دیواروں پہ کسی نے ایک شاہکار پینٹ کر رکھا ہو؟

☆☆☆

مالا جب پینوراما میوزیم پہنچی تو آسمان بادلوں سے سیاہ ہو چکا تھا لیکن نجانے کیوں وہ برس نہیں رہے تھے۔ ہر وقت بھیگا رہنے والا استنبول آج پانی کو ترسا ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا میوزیم تھا جہاں سیاح کم تھے اور مقامی افراد زیادہ۔ یہ اس قوم کے لیے ایک حب الوطنی سے جڑا میوزیم تھا۔ نیچے گیلری میں آویزاں فریم 1453 کی جنگ کی داستان سنا رہے تھے۔ البتہ اس کی دلچسپی کی جگہ بالائی منزل تھی۔ وہاں ایک پینوراما بنا تھا۔ پینٹ شدہ آسمان۔ ہال کی گولائی میں گھومتی دیواریں بھی پینٹ شدہ تھیں۔ ان پہ جنگ کا تھری ڈی منظر بنا تھا۔ گولے بارود کی زور دار آوازیں۔ آسمان کی گرج۔ جنگی میوزک۔ کہیں جرنیلوں کی للکار۔ دیواروں کے سامنے رکھی توپیں اور اصلی جنگی ساز و سامان۔

وہ پر جوش ہو کر کسی بچے کی طرح گھوم پھر کے سارے کو دیکھنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی جنگ کے میدان میں ہو۔ قدیم زمانوں کی وہ جنگ جس نے اس شہر کو فتح کروایا تھا۔ تب استنبول کا نام قسطنطنیہ ....

"تم مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔" کسی نے اس کے کان کے قریب اردو میں کہا۔ وہ ایک دم ڈر کے دور ہٹی۔ پھر ایڑیوں پہ گھومی۔

اگلے ہی پل وہ ساکت رہ گئی۔

سنہری بالوں والا نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ چہرے پہ مسکراہٹ۔ ہڈی کی ٹوپی سر پر گرائے۔

"میرا اسکیچ بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم ہوا کے دوش پہ کہہ دیتیں (انگلی گول گول گھمائی) کہ عالیان.... مجھ سے ملنے آجاؤ اور میں آجاتا۔" سینے پر ہاتھ رکھ کے سر جھکایا۔ پھر سیدھا ہوا۔

وہ بنا پلک جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم بھی میرا اسکیچ بنا سکتی تھیں۔ لیکن شاید تم نے

اس روز مجھے ٹھیک سے دیکھا نہیں تھا۔ ڈونر لیتے وقت۔ ہم نے انوائرمنٹ کے بارے میں بات کی تھی۔ بھول گئیں؟"

مالا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے۔ لیکن الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ کچھ تھا جس نے اس کے سارے وجود کو پکڑ لیا تھا۔

"تم سے بولا نہیں جا رہا۔ ہے نا؟ تمہاری گردن کو کوئی پکڑ رہا ہے جیسے۔"

عالیان ریلنگ کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ وہ ریلنگ جس کے عقب میں جنگ کا منظر تھا۔ اور وہ اس سے دو فٹ کے فاصلے پہ ساکت کھڑی تھی۔ بے یقینی سے ساکت۔

کیا یہ سرکار تھا؟ اس کا ذہن منجمد تھا۔ کسی قسم کا اندازہ لگانے سے قاصر۔

"میں..."

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن شاید شور تھا یا اس شخص کا اثر، الفاظ حلق میں پھنس گئے۔

"ہم کزنز ہیں۔ کیا تمہیں ہلال نے نہیں بتایا؟"

"ہلال؟" وہ چونکی۔ اپنی آواز مختلف سی سنائی دی۔

"بدر میرے پاس ہے۔"

ایک دم جیسے بہت سا خون مالا کے چہرے پہ سمٹ آیا۔ اسے لگا وہ اس پہ جھپٹ پڑے گی لیکن قدم ہلنے سے انکاری تھے۔

"اگر تم نے اس جگہ کوئی ری ایکشن دکھایا تو بدر تمہیں زندہ نہیں ملے گا۔"

اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ضبط سے سانس اندر کھینچی۔

"میں... میں کیسے مانوں کہ تم سچ بول رہے ہو؟" اس نے خود کو غراتے سنا۔ وہ مجمع کے درمیان اس کے ساتھ تنہا کھڑی تھی۔ اسے چلانا چاہیے۔ پولیس۔ سیکیورٹی۔ کسی کو بلانا چاہیے۔ وہ کیوں نہیں بلا پا رہی تھی؟

"اگر بدر میرے پاس نہ ہوتا تو میں کیوں یہ دعویٰ کرتا، کزن؟ چچ چچ..." افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ پھر آواز دھیمی کی۔

"میں نے تمہیں زارا کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا کہ بدر میرے پاس ہے۔ اس نے نہیں بتایا؟"

"کون زارا؟" اس نے اچنبھے سے اس نوجوان کو دیکھا۔ وہ کس زارا کی بات کر رہا تھا؟ اس کی تو کسی فرینڈ یا رشتے دار کا نام زارا نہ تھا۔

"بدر میرے پاس بالکل محفوظ ہے۔ میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔ بس تھوڑا..." انگلی اور انگوٹھے کے درمیان فاصلہ بنا کے دکھایا۔ "... تھوڑا شر پسند ہوں۔ مجھے پرسکون دنیا اچھی نہیں لگتی۔ میں جان بوجھ کے افراتفری پیدا کرتا ہوں۔ پھر اسے خود ہی توازن میں لے آتا ہوں۔ سائیڈ ہابی۔" ہاتھ نیچے گرایا اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ حیران زیادہ تھی؟ یا بے یقین؟

"عالیان۔ میرا نام عالیان ہے۔ ہو سکتا ہے ہلال نے تمہیں نہ بتایا ہو۔ سویٹ گرل۔ ہم ایک ساتھ قید تھے۔" پھر رک کے تصحیح کی۔ "میں قید نہیں تھا۔ میری قید اس وقت ختم ہو گئی تھی جب میں نے تگینہ بیگم کو اپنی ماں تسلیم کر لیا تھا۔ حالانکہ میری بائیولوجیکل مدر..." اس کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہاری آنٹی کبیرہ تھیں۔"

پسِ منظر میں کوئی گولہ پھٹا۔ چیخوں کی آوازیں گونجیں۔

"اور رہی ہلال تو...... چچ چچ ..... وہ اپنے بھائی کی طرح ضدی نکلی۔ اگر وہ تگینہ بیگم کی سن لیتی تو اس کی زندگی بھی میری طرح آسان ہوتی۔"

عالیان کو شور کے باعث اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اثر جس کے زیر ہو کے وہ چند لمحے پہلے بولنے سے معذور ہو چکی تھی، وہ دھیرے دھیرے زائل ہونے لگا۔ اب وہاں صرف حیرت تھی۔ اچنبھا تھا۔ (یہ تھا سرکار؟ اس شخص

نے اس کا بچہ اغوا کیا تھا؟)

"اگر میرا تعارف ہضم ہو گیا ہو تو ہم کام کی بات کریں؟"

"میرا بیٹا تمہارے پاس ہے؟" وہ اب غصے میں نہیں تھی۔ وہ جیسے الجھن سے سوال پوچھ رہی تھی۔

"کہا نا وہ میرے پاس ہے۔ تم ٹھیک تھیں، مالا۔ ایک نیا سرکار اپنا وجود رکھتا ہے۔ میں نے اپنی ماں کی (میراث) کو آگے بڑھایا ہے۔ تم ٹھیک تھیں اور تمہارے خواب بھی... جن میں تم مجھے دیکھتی آئی ہو۔"

وہ اگلا سانس نہ لے سکی۔

"تمہیں کیسے...؟"

"میں سرکار ہوں اور سرکار بننے کے لیے جو قیمت چکانی پڑتی ہے، اس کے بدلے میں مجھے بہت سی آنکھیں ملی ہیں جو میرے دوستوں اور دشمنوں کا پیچھا کرتی ہیں۔"

"بدر سے کیا دشمنی تھی تمہاری؟" وہ ابھی تک آنکھوں میں شک اور الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس کا قصور یہ ہے کہ وہ زیادہ سلطان کا بیٹا ہے اور زیادہ میرا دشمن ہے۔ لیکن..." عالیان نے ٹوپی کے نیچے سے بال کھجائے۔ "آئی ایم رئیلی سوری۔ اس ساری مشکل کے لیے جو میری وجہ سے تمہیں اٹھانی پڑی۔"

"سوری؟" اس نے پلکیں جھپکائیں۔ کیا وہ اپنے ہوش میں تھا؟ یا کسی ڈرگ کے زیر اثر تھا؟

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ وہ آخری تکلیف ہے، جو تمہیں میری طرف سے ملی ہے۔ کیونکہ میں تمہیں بدر واپس کر دوں گا اگر..."

مالا کا سانس رک گیا۔

"اگر کیا؟" وہ اس کی آنکھوں سے نگاہیں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

"اگر تم وہ کرو جو میں چاہتا ہوں۔" عالیان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اور اس لمحے کشمالہ مبین کو احساس ہوا کہ اگر وہ اسے گلاطہ کی چھت سے کود جانے کو کہے تو وہ بنا سوچے سمجھے یہ کر دے گی۔ اگر وہ اس سے اس کی ساری عمر کی کمائی سے دوہری رقم بھی مانگ لے تو وہ خود کو گروی رکھوا کے رقم ادا کر دے گی۔ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

"کیا چاہتے ہو؟ کیا کروں میں؟"

عالیان نے جواب نہیں دیا۔ اپنا سفید ہاتھ جیب میں ڈالا اور جب وہ باہر آیا تو اس میں ایک موبائل تھا۔ اسکرین اپنی طرف کیے وہ اب ایک نمبر ملا رہا تھا۔ شاید ویڈیو کال کیونکہ رابطہ ملنے کی ٹون سنائی دی۔ وہ موبائل کی پشت دیکھ سکتی تھی۔ اور مدھم سی آواز بھی سن سکتی تھی۔

"کیوں کال کر رہے ہو مجھے؟ اگر مجھے بلیک میل کر کے..." ایک ناگوار سی نسوانی آواز گونجی۔

"دس کب کے بج گئے، زارا۔ تمہاری مہلت ختم ہو گئی۔ دیکھو میں کس کے ساتھ ہوں۔" کہتے ہوئے عالیان نے رخ موڑا، یوں کہ اب وہ کشمالہ کے ساتھ کھڑا تھا اور موبائل سیلفی کے انداز میں اٹھا رکھا تھا۔

اسکرین پہ زارینہ فرید کا بگڑا بگڑا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غصے میں کچھ کہہ رہی تھی۔

اس کی نگاہ مالا پہ پڑی۔

یکدم اس کا چہرہ منجمد ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اسکرین سیاہ ہو گئی۔

عالیان نے ہنس کے سر جھٹکا اور موبائل جیب میں ڈالا۔ پھر اس کی طرف پلٹا۔

اب وہ اس کے بہت قریب تھا۔ وہ اس کے آفٹر شیو کی خوشبو بھی سونگھ سکتی تھی۔

"میں بدر کو تمہارے حوالے کر دوں گا اگر تم ایک سچ بولنے پہ تیار ہو جاؤ۔"

"کیسا سچ؟" اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ زارا؟ یہ والی زارا کیسے....؟

"تمہیں ماہر کو وہ بتانا ہو گا جو میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔"

اردگرد پھیلے سیاح اور گولے بارود سے لیس منظرنامہ سب جیسے غائب ہوگیا تھا۔ بس وہ تھی اور ساتھ سرگوشی میں کہتا ہڈی والا نوجوان۔

"زارینہ فرید میری کلائنٹ ہے اور اس نے اپنے باپ پہ جادو کروا کے اس کو ٹیومر کا شکار کیا ہے۔"

کشمالہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے گئی۔ ایسے جیسے کسی دیوانے کا چہرہ دیکھتے ہیں۔

"ٹیکنیکلی اس نے مجھے ماہر پہ جادو کرنے کا کہا تھا تاکہ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ مگر میں ماہر کے ریڈار پہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے بجائے مالک فرید پہ عمل شروع کر دیا جس سے ان کا ٹیومر ری کیورنگ ہو کے واپس آ گیا۔ اور ریسٹ از ہسٹری۔" وہ اسی انداز میں مسکرایا۔

وہ ابھی تک جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کوئی کیسے اس طرح مسکرا کے یہ سب کہہ سکتا ہے؟

"کیا مطلب...؟ زارا کیوں...؟"

اس دراز قد سنہری بالوں والے نوجوان کے الفاظ اس سے ٹکرا کے واپس پلٹ رہے تھے۔

"کیا تمہیں سمجھ میں نہیں آیا؟" عالیان نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی۔

"زارا کی ماہر سے منگنی میرے جادو کا نتیجہ ہے۔ مالک فرید کی بیماری بھی میرے جادو کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے لیے زارا نے مجھے ایک خطیر رقم ادا کی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم نے ابھی اسے ویڈیو کال پہ دیکھا ہے۔ کیا وہ بھی جھوٹ تھا؟"

مالا نے کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ تھا فضا میں۔ الفاظ حلق تک پھنس گئے۔

"اور یہ وہ سچ ہے جو تم جا کے ماہر فرید کو بتاؤ گی۔ جس دن تم ماہر کو یہ سچ بتا دو گی اس رات بدر تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔ گھر یعنی ماہر کے اپارٹمنٹ میں جہاں تم رہ رہی ہو۔ فیصلہ تمہارا ہے۔"

وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر پیشانی تک دو انگلیاں لے جا کر سلام کیا اور پلٹ گیا۔

وہ اسی طرح وہاں کھڑی رہی۔ کتنی ہی دیر۔ ساکت۔ جامد۔ پھر بدقت قریب بنے زینے پر بیٹھی۔ گہرے سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی کیونکہ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

یہ کیسا احساس تھا جس نے اسے جکڑ لیا تھا؟ اس نے سیکیورٹی کو کیوں کال نہیں کی؟ اس نے پولیس کیوں نہیں بلوائی؟ وہ اپنا فون تک نہیں نکال سکی۔

اس کا سارا خون سمٹ کے چہرے پہ آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا اس نے بدر کو اغوا کیا ہے۔ اتنے مہینوں کی تکلیف۔ کسی بچے کی جلی ہوئی لاش، بدر کو کسی کوریئر کے ہاتھوں استنبول پہنچانا۔ سب اس کا کام تھا۔ اُف۔ اس نے اس کا منہ کیوں نہیں نوچ لیا؟

وہ سحر اب ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بے اختیار زینے اترنے لگی۔ اسے اس کے پیچھے بھاگنا تھا۔

سیاحوں کا سمندر اس طرف آ رہا تھا۔ اسکول کا گروپ ٹور۔ وہ بہت سے لوگوں سے ٹکرائی۔ بہت سے سوری کہے۔ لیکن جب تک وہ ایگزٹ تک پہنچی وہ نوجوان کہیں نہیں تھا۔

زینوں سے اوپر.... جنگ اسی زور و شور سے جاری تھی۔

☆☆☆

وہ واپس آفس نہیں گئی۔ اس نے ماہر کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ بادل بھی نہیں برسے۔ دونوں ہی تیار نہیں تھے۔ اوپر سے بیربل کی کال آ گئی۔ وہ پہلی دفعہ اس سے فیور مانگ رہا تھا۔ وہ ہنی مون پہ تھا اور چاہتا تھا کہ مالا بیکری جا کے آج کے اکاؤنٹس دیکھ لے اور پیسوں کا حساب کتاب کر لے کیونکہ کل بیکری کے پاس ایک کیٹرنگ آرڈر تھا۔ عام حالات میں وہ بیربل کو ضرور جتاتی کہ وہ فارغ نہیں ہے لیکن اس وقت یہ غنیمت تھا۔ وہ ماہر کا سامنا کرنے سے بچ جائے گی۔

ابھی اسے اس سب کو جذب کرنا تھا جو عالیان

نے اسے بتایا تھا۔

"یعنی عالیان کے بارے میں میری ساری تھیوریز غلط ثابت ہوئیں۔" ماہی نے سنتے ہی مایوسی کا اظہار کیا تھا۔

وہ اس وقت بیکری کے کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پہ بیٹھی تھی اور کانوں میں ہینڈز فری لگے تھے۔ سامنے اسکرین پہ بیکری کا پورٹل کھلا تھا۔

"ویسے کیا وہ واقعی عالیان تھا؟ وہ لڑکا جس کے بارے میں بچپن سے ہم سنتے آئے ہیں کہ .... اففففف .... کبیرہ تائی سے اِن ٹچ ہوگا وہ کیا؟"

"تمہیں اس کی پڑی ہے۔ تم وہ نہیں سن رہیں جو میں بتا رہی ہوں۔ بدر.... ماہی.... بدر اس کے پاس ہے۔" وہ غرائی۔ سارا غصہ اور فرسٹریشن اب ماہی پہ نکلتی تھی۔

گزرتے ہوئے اسٹاف نے گھور کے اسے دیکھا۔ وہاں کسی کو بھی اس کی یہ داخلت پسند نہیں آئی تھی۔ وہ جب سے آ کے بیٹھی تھی وہ لوگ اس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ عجیب قوم تھی یہ۔ زبان نہیں سمجھتے تھے یا نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے تھے۔ اور حد درجے کے سست۔

"ہاں مگر... " ماہی دھیمی ہوئی۔ "اس نے کیوں کیا بدر کو اغوا؟"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ دیکھو ماہی، میرا بدر زندہ ہے۔ سب کے بچے نہیں مر جاتے۔ دیکھو میں درست تھی۔ لیکن .... اس نے گہری سانس لے کر سب کچھ اندر دبا دیا۔

"پتہ نہیں۔ زیاد سے دشمنی شاید۔"

"اور وہ صرف اس لیے بدر کو چھوڑ دے گا اگر تم ماہر اور زارا کی منگنی تڑوا دو؟"

"منگنی تڑوانے کا نہیں کہا۔ صرف بتانے کا کہا ہے۔"

"اس بتانے کا انجام یہی ہوگا نا۔" دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ لب کاٹتی اسکرین کو دیکھے گئی۔

"تمہیں ماہر کو بتا دینا چاہیے۔"

"ایسے کیسے بتا دوں؟ کیا معلوم وہ جھوٹ بول رہا ہو۔"

"پھر زارا نے اس کی ویڈیو کال کیوں اٹھائی؟ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"میں ان دونوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔"

"یعنی تم ان دونوں کے درمیان آ سکتی ہو؟" ماہی چونکی۔ پھر اس کی آواز میں تشویش در آئی۔ "مالا، تمہارے اور ماہر کے درمیان کیا چل رہا ہے؟"

"پہلے غلط فہمیاں تھیں۔ اب وہ نہیں رہیں۔ باقی وہ میری مدد کر رہا ہے اور کچھ نہیں۔"

اس کے دوٹوک انداز پہ ماہی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

"اب تم کیا کرو گی؟"

"وہی سوچ رہی ہوں۔" باہر سے بادلوں کے زور سے گرجنے کی آواز آئی تو اس نے چہرہ اٹھایا۔ بیکری پہ رش آج معمول سے بہت کم تھا۔ اکا دکا لوگ آتے اور چلے جاتے۔ گلاس والز کے باہر مغرب پھیل چکی تھی اور آسمان بادلوں سے سیاہ تھا۔ مگر نہ جانے انہیں کس چیز نے روک رکھا تھا۔

اور نہ جانے اسے کس چیز نے روک رکھا تھا۔

اس نے کئی دفعہ موبائل اٹھایا اور ماہر کے نمبر پہ انگوٹھا رکھا۔ پھر اسے نیچے کر دیا۔ وہ اسے کیا بتائے؟ کتنا بتائے؟

نو فلٹر، نو ججمنٹ کا دعویٰ کرنا آسان تھا۔ پورا کرنا بہت مشکل۔

"کیا عجیب حساب کتاب ہے۔" وہ اب اپنی جھنجھلاہٹ پورٹل پہ نکال رہی تھی۔ ٹھک ٹھک کیز دباتی۔ ماتھے پہ بل لیے۔ موبائل چہرے کے قریب کیے وہ بیربل کو میسج بھی ریکارڈ کر کے بھیج رہی تھی۔

اس دوران دروازہ بہت دفعہ کھلا اور بند ہوا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ لیکن اس دفعہ اس نے دروازہ کھلنے سے پہلے ایک دم چہرہ اٹھایا۔ جانتی تھی

آگئے ہی تھے...

وہ چوکھٹ پہ نمودار ہوا۔ مالا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ در آئی۔ انگلیاں کی بورڈ سے ہٹائیں اور پیچھے کو ہوئی۔ جیسے کندھوں کا تناؤ ایک دم سے ختم ہو گیا ہو۔

"کیا شہر میں کوئی دوسری کافی شاپ نہیں ملی؟" وہ مسکرا کے کھڑی ہوئی۔

"اس وقت تک ساری اچھی کافی شاپس بند ہو چکی ہوتی ہیں۔" وہ ٹائی ڈھیلی کرتا مسکراتے ہوئے کاؤنٹر کے قریب چلا آیا۔

باریستا تیزی سے آگے بڑھی لیکن مالا نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

"ڈارک روسٹ۔ میڈیم۔ ون ملک۔ نو شوگر؟" اسے اس کا کافی آرڈر یاد تھا۔ کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ وہ کینیڈا کے اس مال کی کافی شاپ میں کیپ پہنے کھڑی تھی اور وہ اس کے سامنے کھڑا کافی کا آرڈر دے رہا تھا۔

"اس وقت صرف ڈی کیف۔ لیکن اچھی بنانا۔" ابرو اٹھا کے تنبیہہ کی۔

وہ کافی مشین کی طرف جاتے جاتے چونکی۔ پہلے وہ شام میں ڈی کیف نہیں لیتا تھا۔ صرف وقت بدلا تھا یا کافی پینے والا بھی؟

"سنا ہے آج تم انسپائریشن کے لیے سٹی ٹور پہ نکلی تھیں۔ کچھ انسپائر کیا؟"

بھاپ اُڑاتا کپ کاؤنٹر پر رکھا تو وہ جو اونچے بار اسٹول پر بیٹھا تھا، کپ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولا۔ مالا نے چونک کے اسے دیکھا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" ساتھ ہی تھوک نگلا۔

"شبنم نے۔" ماہر نے کافی کی بھوری سطح کو دیکھا اور پھر اسے۔ "براؤن کیوں؟"

وہ مسکرا دی۔

"پرپل کیوں؟"

"ایک ڈیل کرتے ہیں۔" گھونٹ بھر کے کپ نیچے رکھا۔ "اگر میں تمہیں بتادوں کہ میرا

برگنڈی کلر کیوں ہے تو کیا تم بتاؤ گی کہ براؤن کیوں؟"

"اب دیر ہو چکی ہے۔ میں شبنم سے پوچھ چکی ہوں۔ یہ تمہاری ڈیٹ آف برتھ ہے۔"

ماہر نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"میں کیا کروں جو تم بتاؤ گی؟"

"ایک سوال۔" اس نے انگشت شہادت اٹھا کے دکھائی۔ "ایک سوال کا جواب دو گے؟"

"شیور۔"

ماہر نے مسکراہٹ دبائے ایک اور گھونٹ بھرا۔ پھر دائیں طرف دیکھا جہاں اسٹاف ٹھکا ٹھک کھڑکیاں بند کر رہا تھا۔

وہ کچھ کہنے لگا، پھر رک کے اسے دیکھا۔

"تم یہاں بیٹھنا چاہتی ہو یا...؟"

"نہیں۔ ان کو کلوزنگ کرنے دیں۔" ایک تیز نگاہ باریستا لڑکی پہ ڈالی جو کھٹا کھٹ درازوں میں چیزیں درست کر کے انہیں بند کر رہی تھی۔ اور جھک کے اپنا بیگ اور ایک کھڑکتا ہوا شاپنگ بیگ اٹھالیا۔

"مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنی تھی۔ اس کے بعد میں گھر جاؤں گی۔"

ماہر نے ایک گھونٹ میں کافی ختم کی۔ کپ کاؤنٹر پر رکھا۔ باریستا کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ کپ اٹھایا۔ کاؤنٹر پہ گرا ایک قطرہ پونچھا۔ مسکرا کے ماہر کو شب بخیر کہا۔ واپس مالا کو دیکھا اور مسکراہٹ سمٹ گئی۔ ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈال کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی مگر آسمان ابھی تک ضبط کیے ہوئے تھا۔ کہیں کہیں بجلی چمکتی اور سارے کو روشن کر دیتی۔ پھر اندھیرا چھا جاتا۔ خشک اندھیرا۔

"اپنا سوال پوچھو۔" وہ سڑک کنارے چل رہے تھے جب ماہر نے اسے یاد دلایا۔ اس کی خاموشی پہ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ شاپنگ بیگ سے کچھ نکال رہی تھی۔ ہاتھ باہر آیا تو ایک نیلی گرم ٹوپی

تھی جس کے اوپری سرے پہ اون کی گیند تھی۔

"یہ ٹوپی تمہیں بیس پچیس سال پہلے لینی چاہیے تھی۔" وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہا تھا جو ٹوپی کو زبردستی کھینچ کے سر پر فٹ کر رہی تھی۔ اور بالآخر وہ فٹ آ گئی۔

"یہ اپنے لیے نہیں لی۔ بدر کے لیے لی ہے۔"

ماہر کی مسکراہٹ تھم گئی۔ نگاہ شاپنگ بیگ پہ ڈالی۔ اس میں سے چند سویٹرز اور ایک جیکٹ جھلک رہی تھی۔ بچے کے سائز کے۔ وہ واپس سائیڈ واک پہ چلنے لگی تو ماہر نے دیکھا ٹوپی کے پیچھے ٹیگ بھی لٹک رہا تھا جسے مالا نے نہیں دیکھا تھا۔

"تم اس کے لیے شاپنگ کرتی رہتی ہو؟"

"آج کی ہے۔ کیونکہ..." مالا نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "آج مجھے میوزیم میں عالیان ملا۔ سرکار عالیان۔"

پھر چہرہ موڑ کے ماہر کو دیکھا جو بیچ سائیڈ واک کے رک گیا تھا اور اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"کیا مطلب؟"

کشمالہ مبین نے گہری سانس لی۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایک طرف سے ٹریفک تیزی سے گزر رہا تھا۔ پانچ کارز، دو بائیکس اور ایک واٹر ٹرک کے گزرنے تک وہ تمام قصہ سنا چکی تھی۔

سوائے اس آخری بات کے۔

"نہیں۔ میں سمجھا نہیں۔ اس لڑکے نے اعتراف کیا کہ وہ سرکار ہے اور تمہارا بیٹا اس کے پاس ہے؟"

"ہاں۔" اس نے شانے جھٹکے۔ "میں کہتی تھی نا۔ سرکار وجود رکھتا ہے۔"

"نہیں مگر.... کیوں؟ وہ کیا چاہتا تھا؟"

اس نے تھوک نگلا۔ "پتا نہیں۔"

"اس نے کوئی مطالبہ کیا ہوگا۔ کوئی تاوان کوئی شرط؟"

"نہیں۔" اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"پھر وہ تم سے ملنے کیوں آیا؟ صرف اپنی شکل دکھانے؟" وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

"اس نے.... اس نے بس یہی بتایا کہ بدر کا قصور زیاد کا بیٹا ہونا ہے۔ اس لیے اس نے اسے اغوا کیا۔ اور..." پھر سے تھوک نگلا۔ "وہ اسے واپس کر دے گا۔"

"کب؟"

"اس نے اور کچھ نہیں بتایا۔ بس ایسی ہی عجیب سی باتیں کر کے وہ چلا گیا۔ میں اتنی شاکڈ تھی، پا اس نے کچھ کیا تھا میرے ساتھ کہ میں اسے روک نہیں سکی۔"

لیکن ماہر نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"نہیں۔ وہ صرف یہ بتانے نہیں آیا تھا۔ اس کا کوئی مقصد ہوگا۔" پھر رک کے اسے دیکھا۔ یوں کہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ رکھی تھیں۔ "آر یو شیور اس نے اور کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں۔" اس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

ماہر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے بہت بھاری تھے۔ اسے اپنا چہرہ بالکل مطمئن رکھنا تھا، البتہ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

"او کے۔ تمام۔ اس کا مقصد سامنے آ جائے گا۔"

وہ اب خاموشی سے چلنے لگا۔ کن اکھیوں سے وہ اس کی ٹوپی کے پیچھے لٹکتا ٹیگ دیکھ سکتا تھا۔ ایک دفعہ کچھ کہنے لگا لیکن وہ سڑک عبور کر رہی تھی۔ سامنے شور لائن تھی اور اس کے پار بوسفورس کا سیاہ پانی جو عمارتوں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔

"شاید وہ زیاد کا ساتھی ہو۔" وہ دونوں پانی کے کنارے رکھے اونچے پتھروں پر بیٹھ گئے، وہ استنبول کی اسکائی لائن کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ساسی ہوتا تو زیاد کے بیٹے کو کیوں اغوا کرتا؟" وہ اسی تیزی سے بولی۔ پھر گہری سانس لی اور آواز دھیمی کی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ زیاد بدل گیا ہے یا ایک دم سے اچھا ہو گیا ہے۔ نہیں۔ لیکن ایک دفعہ... تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔ تم ہر دفعہ درست ہوتے ہو گے۔ لیکن اس دفعہ میں بھی غلط نہیں ہوں۔ سرکار ہے۔ اور بدر اسی کے پاس ہے۔"

ماہر نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"شاید وہ تم سے دوبارہ ملنے کی کوشش کرے۔"

اس کے ذہن کی جمع تفریق جیسے پوری نہیں پڑ رہی تھی۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔ مسنگ تھا۔

"تم نے کہا تھا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟"

وہ چونکا۔ پھر اسے دیکھا جو ساتھ پتھر پہ بیٹھی تھی اور اس کی سبز آنکھوں میں دور روشن عمارتوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

"پوچھو۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

مالا چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"تم بدر کا نام کیوں نہیں لیتے؟"

ماہر کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ چہرہ واپس پانی کی طرف پھیر لیا۔

"کیا اس لیے کہ وہ زیاد کا بیٹا ہے؟"

پانی پہ دور سے ایک فیری تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے عرشے سے میوزک اور شور کی آوازیں تھیں۔ غبارے بھی لگے تھے۔ جیسے کوئی پارٹی عروج پہ تھی۔

"تمہیں میرا کافی آرڈر یاد تھا۔"

بہت دیر بعد وہ بولا۔ وہ خاموشی سے سنہری چادر میں ڈوبے پانی کو دیکھے گئی۔

"مگر آج میری کافی بناتے ہوئے تم وہ نہیں تھیں جیسی وین کوور میں ہوتی تھیں۔ وہ لڑکی تلخ تھی۔ خوف زدہ۔ غصے میں۔ تم بدل گئی ہو بلکہ .... تم اس مالا جیسی بن چکی ہو جس سے میں پہلی دفعہ ملا تھا۔ اوشن میں جاب انٹرویو کے وقت۔

"کرائسس سے پہلے کی مالا۔" وہ مسکرائی۔ وہ اس کی پرسکون زندگی کو بدلنے والے دن سے پچھلی صبح کی بات کر رہا تھا۔

"وہ مالا ٹھنڈے مزاج کی تھی۔ مسکرانے والی اور مہربان۔ اس کے اندر امن تھا جو میرے اندر نہیں تھا۔ شاید میں اسی امن کو تلاش کر رہا تھا۔ کرائسس ہمیں بدل دیتا ہے لیکن اگر ہم اس کو ہرا دیں تو اپنے اصل کی طرف واپس پلٹ جاتے ہیں۔"

"تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟"

"میں بھی ویسا نہیں تھا جیسا شمس نے مجھے بنا دیا۔"

"شمس؟"

"میرے باپ کا باڈی گارڈ جس نے میری ماں پہ (کرب سے آنکھیں بند کیں) سحر عشق کیا تھا۔ وہ نگینہ بیگم کا کلائنٹ تھا۔"

"اوہ۔"

"اس نے میرے باپ پہ سحر مرض کیا تھا جس سے ان کو ٹیومر ہو گیا۔ یا شاید ٹیومر ان کی قسمت میں تھا۔ جادوگر یونہی گناہ گار ہوا۔"

"اور تمہاری ماں نے ان کی ڈیتھ کے بعد..."

"نہیں۔ ڈیتھ سے پہلے۔ جب وہ بیمار تھے۔ تب ماں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اور شمس سے شادی کر لی۔"

اس کا منہ کھل گیا۔ پھر سنبھل کے جلدی سے بولی۔

"آئی.... آئی ایم سوری۔"

"ہیر بل نے سمجھوتہ کر لیا۔ میں نہیں کر سکا۔"

"آئی ایم سو سوری، ماہر۔" وہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اپنے جوتوں کو۔ اس کی ماں نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

آہ کی راہ

''زینت پھوپھو نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا پل میں جیسے ذرے ذرے کی تلاشی لے لی ہو۔

''بے شرمی کی بو باس پتا نہیں کہاں سے ملے گی تو بھائی کو بھی اب پتا چلے گا کہ بے حیائی ہوتی کیا



ہے؟"

"بیس بائیس سال میں ہی ساری سمجھ لگ گئی اسے تو۔" انہوں نے ناک سکوڑی سر پر سفید چکن کا دوپٹا سیٹ کیا اور ایک خاص ادا سے چلنے لگیں، سالوں پہلے جلتے قدموں اس گھر کی دہلیز پار کی تھی، اندر دھواں اتنا بھر چکا تھا کہ لگتا تھا کہ اندر سب گل سڑ گیا ہو گیا۔

ایک بھائی کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔ وہ اندر سے، مر گئیں مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ مر کر بھی، جینا تو پڑتا ہے اندر سے سانس راکھ ہو کر ہی سہی نکل تو رہی تھی ناں اپنا گلا خود کون گھونٹ سکتا ہے۔

زینت نے بھی اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ ریاض احمد کے بجائے غیاث احمد کے ساتھ رخصت ہو گئیں ان کے سونے آنگن کو آباد کیا۔ خود چاہے اندر سے برباد ہو گئیں، نہ بھائی کی شکل دیکھنے کو دل کرتا نہ باپ کی محبت کی چاہ رہی، جب محبت نہ ملے تو بندہ حال سے بے حال ہو جاتا ہے۔

ریاض احمد ان کے پھوپھی زاد تھے۔ پھوپھی راضی بھی تھیں مگر جب خود زینت نے ریاض کا نام اپنے منہ سے لیا۔ تب اسرار بھائی ہتھے سے اٹھ گئے۔

ان دنوں وہ ضد کے بے حد پکے ہوا کرتے تھے۔ انہیں ضد سی ہو گئی، اس ضد میں بے انتہا نفرت بھی شامل ہو گئی تھی۔ سگے پھوپھی زاد نے نجانے کب گھر میں نقب لگائی کہ انہیں معلوم ہی نہ ہوا، زینت کہہ بھی نہ سکیں کہ محبت کرنا گناہ تو نہیں اور ریاض تو ان سے شادی کے خواہش مند ہیں مگر شاید ان کا اس وقت بولنا مقدر میں لکھا ہوا نہیں تھا۔ وہ رو رو کر مر بھی جاتیں تب بھی ان کے باپ اور بھائی کے فیصلے اٹل ہوا کرتے تھے اندر کی خاموشی آج سینہ چیر کر باہر آنا چاہتی تھی۔

"مجھے محبت نہ ملی تو زمانے بھر کی خوشیاں بھی میرے سامنے کچھ نہیں۔" ایسی آگ لگانا چاہتی تھیں جو کبھی بجھ ہی نہ سکے اللہ کرے، اس آگ میں سارا زمانہ جل جائے۔ جو آتش کدہ سالوں پہلے جلا تھا آج بھی وہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

پچاس سال کی حدوں کو تیزی سے عبور کرتے ان کے سر کی سفیدی، آج بھی ریاض احمد کو بھولی نہیں تھی۔

ان دونوں نے ریاض احمد کی بڑی بہن کے ولیمے میں پہلی بار، ایک دوسرے کو دیکھا تھا ریاض احمد دل ہار بیٹھے مگر زینت تو جان سے گئیں۔ بھائی اسرار اتنے ظالم ہو گئے تھے کہ بہن کو مرتے ہوئے محسوس ہی نہ کر سکے مگر آج محسوس کرنے کا دن آ گیا تھا۔

اسرار احمد سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے پاس ہی شکیلہ بھابی نجانے کیا سینے میں مصروف نظر آ رہی تھیں، ان کے سر کے بال سارے ہی چاندی ہو گئے تھے، شکیلہ بھابی بہت کم بولتی تھیں پاس ان کی مسکین سی بھتیجی جواب ہو بہو تھی۔ وہ بھی افسردہ سی اپنا بچہ سلا رہی تھی۔

زینت نے اندر کی نفرت نگاہ میں بھر کر اسرار احمد کو دیکھا تھا۔

"نہ تو تم سوئی رہتی تھیں سارا دن کہ بیٹی کی خبر ہی نہ لی بھی۔"

زینت نے بھابی کو لتاڑنا شروع کیا تھا مگر وہ تو پہلے ہی نچڑی ہوئی تھیں وہ کچھ نہیں بولیں بس نگاہ جھکا لی۔ ایسے جیسے خود کو چھپا لیا ہو مگر زینت کی نگاہ سے چھپنا ناممکن تھا ایسے جیسے کسی بھوکے گدھ سے مردار کو چھپا لینا۔

"غضب خدا کا میرے مرحوم باپ کی عزت مٹی میں ملا دی بدبخت نے۔ کیسی ماں ہو تم۔"

ان کے وار جاری تھے گھر میں عجیب سی سوگواری طاری تھی ایسے جیسے فوتگی والا گھر ہو۔ جھاڑو برتن بھی ویسے کے ویسے پڑے ہوئے تھے اسرار احمد کے چھوٹے سے پوتے نے جھاڑو تنکا تنکا بکھیر رکھی تھی سب کے چہرے زرد دکھائی دے رہے تھے۔

"بیٹھ جاؤ زینت! میں تھا ہی بدنصیب، میں مر کیوں نہیں جاتا۔" اسرار احمد بہن کو دیکھ کر بری طرح ٹوٹ گئے تھے۔ "کتنی محبت دی میں نے اس کے بھائی نے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اس نے میرے سر

میں خاک ڈال دی اللہ مجھ پر مٹی ڈال دے۔ مجھے ڈھانپ لے بس زینت، میں برباد ہوگیا ہوں۔

اسرار کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ناں کب سے یہ سب چل رہا تھا تم لوگوں کو کیسے پتا چلا، ارے ہے تو چھوٹی سی تھی یہ سب کر کب سے رہی تھی۔"

ان کے اندر کی نفرت ان کا سوال ہلکا سا لطف لینا چاہتا تھا۔

"ناں میری سویرا کو دیکھو۔ اسی کی عمر کی ہے۔ سارا گھر سمیٹ رکھا ہے اس نے، مجھے پروا نہیں ہوتی کسی آئے گئے کی۔ چائے پانی خود ہی پوچھ پکا لیتی ہے۔ بھئی ساری بات تربیت کی ہے اولادوں پر دھیان دینے کی ہے۔ اولاد کو نوالہ سونے کا کھلاؤ نگاہ شیر کی رکھو ایویں تو سیانے نہیں کہہ گئے مگر اس طرح کی باتوں پر آج دھیان دیتا کون ہے۔

مائیں بھی لگی رہتی ہیں سارا دن ڈرامے دیکھنے میں میری مانو تو کیبل کا کنکشن ختم کروا دو۔ یہ موئے آج کل کے ڈرامے بھاگنے بھگانے کے ہی تو راستے دکھا رہے ہیں اور کر کیا رہے ہیں کوئی اچھی بات نہیں ہوتی ان میں اور میری سویرا تو بھئی ڈرامے دیکھتی ہی نہیں ہے باپ بھائیوں سے ڈرتی ہی بہت ہے۔"

وہ سویرا کی تعریف کر رہی تھیں۔ شکیلہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔

بہت کہا تھا اسرار سے کہ شور نہ مچائیں مگر انہوں نے ان کی ایک نہ سنی اور بات زینت تک پہنچ گئی۔ شکیلہ بے چارگی کی تصویر بنی بیٹھی رہ گئیں۔ کیسا امتحان ہے اللہ۔"

"اٹھ کر کوئی ہاتھ پاؤں ہلا لو میرے بیمار بھائی کو کوئی چائے پانی پوچھ لو کیسا ہلدی سا رنگ ہو رہا ہے اس کا۔ عزت تو رہی نہ چلو۔ جینے کا آسرا ہی رہنے دو کہ سانسیں بھی چھیننی ہیں تم نے۔"

شکیلہ آہستہ سے اٹھیں اور وہاں سے چلی گئیں، دور کیڑی شکیلہ بظاہر کپ دھونے چائے بنانے میں مگن تھیں مگر ان کی نگاہیں زینت پر لگی ہوئی تھیں ان کے لہجے میں سستی اور دکھ کہیں نہیں تھا صرف اور صرف فتح تھی، ایسی فتح جو صرف اپنے بھائی کے آنسوؤں سے ہی ملی تھی۔

شکیلہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے تھے۔ وہ بدنصیب نجانے کس کمرے میں گٹھڑی بنی ہوئی ہوگی۔ نہ چائے نہ پانی اپنی اولاد کی تکلیف دنیا کی سب سے بڑی اذیت ہے۔ شکیلہ اس لمحے میں کرب سے گزر رہی تھیں ان کا دل حقیقت میں خون ہو گیا تھا۔ چائے کے دو کپ نند اور شوہر کے آگے رکھے تو پھر اس کا خیال آ گیا تھا۔ پاؤں جیسے چلنے سے انکاری ہو گئے تھے قدم گھسیٹ کر چائے کپ میں ڈالی اور ساتھ پاپے چھپا کر بیٹی کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

اسرار احمد اور زینب باتوں میں لگے ہوئے تھے وہ بھی سمجھی تھیں، مگر ایسا نہیں تھا ان دونوں کا دھیان اس پر تھا اور خاص طور پر زینت کا۔

"تمہارے اسی لاڈ پیار نے اس کم بخت کو بگاڑا

ہے سالوں کی بنی عزت پر حرف آیا ہے، ہماری اور تمہیں ذرا خیال نہیں چائے پلائی جا رہی ہے۔"

زینت کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر گیا تھا وہیں بیٹھ کر رونے لگیں ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے مگر زینت پر ذرا اثر نہیں ہوا تھا۔

"آج باتیں کر رہی تھی اس سے کل کو کوئی نیا گل کھلائے گی۔ ہوش کرو بھابی بیٹی ذات ہے ذرا سختی کرو تاکہ سنبھل جائے۔"

انداز ان کا سمجھاتا ہوا تھا مگر اصل میں وہ زیادہ سے زیادہ اذیت دینا چاہتی تھیں، اپنے ماں جائے کو اس زخم کو اتنا ادھیڑ دینا چاہتی تھیں کہ اس ناسور کو کوئی مرہم نہ ملے۔ "میں اس نامراد کو ختم کر دوں گا اسے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اسرار احمد ناتوانی کے باوجود لاڈلی بیٹی کا گلا گھونٹنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ان کی آنکھوں کی سرخی اور سوجن ان کے غم کا پتا دیتی تھیں، انہیں صوفی سے یہ امید نہ تھی مگر صوفی انسان تھی، غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں صوفی کوئی فرشتہ نہیں تھی۔

اسرار احمد کا غم سے نڈھال وجود صوفی تک پہنچ نہ سکا تھا، اپنی اولاد سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔

زینت مستقل ان کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں، شکیلہ کو معلوم تھا کہ وہ کیا چاہ رہی ہیں بے وجہ بھاوج سے کی گئی ہر نفرت کا بھرپور انتقام بھتیجی سے لینا چاہتی تھیں مگر اس وقت بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

شکیلہ کا دل ہر رشتہ سے اٹھا ہوا تھا۔

وہ آخر کہاں جائیں ایک سگا بھائی تھا، پچھلے سال وہ بھی طویل علالت کے بعد چل بسا تھا اسی کی بیٹی ان کی بہو تھی۔ "اے اللہ ہمارا پہلا اور آخری سہارا آپ ہیں اے اللہ میری مدد فرمایئے۔" شکیلہ کا دل اسے پکار رہا تھا جسے پکارو تو وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا سب سے قریب اول آخر وہی تو ہے۔ اس نے دیکھا کہ اسرار لیٹ گئے اور زینت بدمزہ سی بیٹھی ہیں۔

"اچھا سن شکیلہ، میں تو جا رہی ہوں پر ایک بات کہے دیتی ہوں بغیر کسی لاگ لپٹ کے، صوفی آئندہ

[illegible]

معصوم سویرا کو بھی اپنے جیسا ہی نہ کر لے دیکھ ناراض نہ ہونا بس خیال رکھنا میرے گھر نہ آئے۔"

زینت نے جاتے جاتے ایک اور تیر چلایا اور آرام سے دہلیز پار کر گئیں۔

☆☆☆

"جو کہہ دیا ہے بس وہی ہوگا۔"

"دو بچوں کا باپ ہے وہ اسرار، کیا کہہ رہے ہیں کچھ تو خیال کریں وہ ہماری بیٹی ہے بھلے اس نے غلطی کی ہو وہ تو نادان ہے ہم کیوں کم عقل بنیں۔"

شکیلہ نے، سمجھانے کی ساری کوششیں کر لیں مگر زینت جاتے جاتے جو چنگاری چھوڑ کر گئی تھیں اب پورے گھر میں پھیل گئی تھی یہ زینت ہی کا مشورہ تھا کہ "صوفی کو فوراً بیاہ دو۔"

"مگر کس سے۔"

"عاشق سے دو بچوں کے باپ سے۔" اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو زہر دے کر مار دیا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس نے کرنٹ لگا کر اس کی جان لی تھی۔ اس خون خوار بھیڑیئے کے سامنے صوفی معصوم جان، مگر اسرار زینت کے کہے کو حرف آخر سمجھے تھے زینت کو اپنا ہمدرد سمجھ رہے تھے۔

"اب عزت بچانے کا یہی رستہ ہے۔"

دوسروں کے مشوروں کے محتاج اسرار فوراً سے پہلے نکاح چاہتے تھے۔ شکیلہ کی آنکھوں میں وہ عاشق گھوم رہا تھا، دیکھیں کبھی کون نکلتا ہے مگر اسرار نگلنا چاہتے تھے صوفی کو سزا دینے میں جلدی کر رہے تھے۔

شکیلہ نے جب دیکھا کہ بچاؤ کے سارے راستے بند ہیں اسرار خود گھر جا کر، عاشق کو ہاتھ جوڑ کر بیٹی کا رشتہ دے کر آ گئے ہیں اور بیٹی کے باپ کی عمر کا پکا عاشق نکاح کے لیے گیٹ تک آ پہنچا ہے، مولوی صاحب گواہان بھی پہنچ گئے ہیں۔

راشد اس وقت گھر پر ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ کر لیتیں، وہ اسلام آباد گیا ہوا تھا اب اور کوئی راستہ نہیں تھا صوفی کی حالت بہت خراب تھی ایک ذرا سی لغزش

تو ایسے بھگتنا پڑسکتا تھا۔ ایسا سوچا بھی نہ تھا جب امی نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ چادر اوڑھے تیار تھی۔

"تم ابھی کے ابھی نکل جاؤ اور اپنی دوست عانیہ کے گھر چلی جانا۔ پھر میں گھنٹہ بھر میں آ کر لے جاتی ہوں۔"

صوفی سرپٹ دوڑ رہی تھی دو گلی چھوڑ کر عانیہ کا گھر تھا، بدقسمتی سے عانیہ لوگ اپنی خالہ کے گھر گئے ہوئے تھے۔ محلے میں ابھی اس کی حرکت کو بہت کم لوگ جانتے تھے کسی کی بھی اس پر نظر نہ تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ "کہاں بھاگوں اگر ابا آ گئے تو آج میں گئی جان سے" اس کا دل تڑپا۔

اس نے زینت کا گیٹ کھلا دیکھا تو جلدی سے پھلانگ گئی، سامنے ہی زینت چائے پی رہی تھیں سویرا بھاگ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

"ہائے صوفی، تم اس وقت خیر ہے۔"

سویرا سے اس کی کافی دوستی بھی تھی عمروں میں کوئی سال بھر کا ہی فرق تھا۔

"بس قسمت لے آئی تمہارے دروازے پر ایک غلطی تھی بس وہی گلے پڑ گئی میرے۔"

اس کا دل اپنے آپ سے بھی روٹھ سا گیا تھا۔

صوفی کی آواز آج کانپ رہی تھی ساری زندہ دلی آج بے دلی میں بدل گئی تھی۔

"صوفی، تم تو بوڑھوں کی طرح باتیں کرنے لگیں کیا ہو گیا ہے خیر ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا تم اندر آؤ۔"

اتنے میں زینت کی نظر، چادر میں چھپے اس وجود پڑی تو اچانک ایسے اٹھیں جیسے آگ لگ گئی ہو۔

"تم کیا کر رہی ہو اس کے پاس۔" انہوں نے بیٹی کا بازو پکڑ کر پرے دھکا دے دیا تھا۔

"پھوپھو، وہ میں۔"

"اب کیا گل کھلا کر آئی ہو، تمہیں باپ کے سر میں خاک ڈالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا نکل جاؤ میرے گھر سے جو باپ کی نہ ہوئی، ہماری کہاں سے ہو گی ہمارا رشتہ ہے تم سے تمہارے باپ کی وجہ سے جب وہ ہی نہ رہا تو تم یہاں کس وجہ سے آئی ہو نکلو یہاں سے۔"

پھوپھو اسے تقریباً گھسیٹ کر وہاں سے لے گئیں اور گیٹ کو تالا لگا دیا۔

"باہر بہت اندھیرا ہے اور مجھے امی نے۔" صوفی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر غور کیا تو وہ کیچڑ میں اپنی چادر کے اوپر کھڑی تھی۔ چادر کیچڑ زدہ سی ہو گئی۔ "یا اللہ میں نے تو اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔"

"آپ ذلیل نہ کریں مجھے بچا لیں۔" صوفی کا رواں رواں رو رہا تھا۔

آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا واپس جانے کی صورت میں برباد ہو جاتی۔ ماں کا اسے بچا لینے کا منصوبہ نا کام ہو جاتا گیٹ کے اندر کی لائٹیں بھی آف ہو گئی تھیں، کوئی آواز نہیں تھی اس کے مقدر کی طرح پوری گلی سو گئی تھی۔

دور سے کسی کے تیز تیز آنے کی آہٹ تھی وہ پورے جی جان سے ڈر گئی تھی، رات کا اندھیرا اور اب یہ نجانے کون ہے۔

امی تیزی سے اس تک پہنچیں، دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر رونے لگیں عانیہ کا گھر بند تھا تو کہیں وہ زینت!۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی منظر صاف تھا۔ شکیلہ کے دکھ کا اندازہ ایک ماں ہی کر سکتی تھی اور زینت بھی ماں تھیں مگر وہ اللہ کو بھول گئی تھیں۔

دونوں اندھیری گلی میں چلتے چلتے گھر پہنچیں تو اسرار اندھیرا کیے سوئے ہوئے تھے ان کا سو جانا ہی اچھا تھا، مولوی صاحب گیٹ سے ہی — چلے گئے تھے کہ لڑکی کی مرضی نہیں ہے ان کا روز کا کام تھا انہیں پتا چل گیا تھا، شکیلہ کی بے بسی انہوں نے پہچان لی تھی۔ اسرار احمد ایک بار پھر بے عزت ہونے کا سوگ منا کر لیٹ گئے تھے۔

رات کا بھیانک پہر اور ایک راز ایک اور زخم اپنے گہرے سینے میں سمیٹ کر آہستہ آہستہ بیت رہا تھا۔

صوفی کی چادر مٹی میں اٹی وہ اپنوں کے لگے دھکے کی وجہ اندر سے ٹوٹ گئی تھی کوئی ایسا بھی کرتا ہے کہ دل تمام عمر بھول نہیں سکتا۔

صاف تھا امی اور بھابی سبزی والے سے بحث کر رہی تھیں جب اس کی نظر اسلم پر پڑی جو کٹی پتنگیں اکٹھی کر رہا تھا، وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور نجانے کیوں اسے بھی ہنسی آ گئی اس نے ایک بڑی پتنگ اٹھا کر اسے دینے کا اشارہ کیا، اس نے بھی لے لینے کا اشارہ کر دیا۔

جونہی وہ اسلم کو پتنگ اسے تھمانے والی تھی فوراً ہی امی آ گئیں اور پھر اسلم کی امی نے بھی دیکھ لیا تھا، نہ اسے کوئی بہانہ سوجھا اور نہ اسلم کو اس نے غائب ہونے کا اشارہ کیا، دل جو صاف تھے پر اس کی پوتی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اسرار نے بھی دیکھ لیا تھا۔

اب دیکھا جائے کسی نے کچھ بھی ہو اس کے چہرے پر اتنی سیاہی بکھر گئی تھی کہ اپنی پہچان بھی نہ رہی ایک ہی مسکراہٹ کے بعد وہ باکردار سے بدکردار ہو گئی۔

امی نے زندگی میں پہلی بار اسے گردن سے پکڑ کر تھپڑ مارا تھا اس تھپڑ کا اثر روح تک جا پہنچا تھا۔ وہ حیران سی کھڑی تھی، پریشان اس وقت ہوئی جب غضب ناک ہو کر اسرار اس کی طرف بڑھے جب زینت پھوپھو آئیں اور بات اتنی بڑھی کہ اسے یہاں اتنے اندھیرے تک لے آئی تھی۔

☆☆☆

صبح معمول ہی کی طرح کی تھی، سب آہستہ آہستہ معمول پہ آ رہا تھا اس کی عام سی شکل اتنی کمزور اور نقش اتنے مدھم ہو گئے تھے کہ خود اپنا آپ پہچاننا مشکل تھا ایسے جیسے کوئی مٹی پر نقش بنا کر بری طرح بگاڑ دے۔ آئینے میں اس وقت صوفیہ اسرار نہیں تھی کوئی پراسرار سا وجود کھڑا تھا ٹوٹا بکھرا۔ نحیف و نزار، دھنسی آنکھوں والی۔

بھابی نے ایک پراٹھا اسے دیا تھا جسے حلق سے اتارنا بہت مشکل لگ رہا تھا، اس کی بھوک مر گئی تھی۔

اندر جا کر الماری میں رکھا قرآن پاک کھول لیا وہ فرصت میں بھی ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھا کرتی تھی آج عجیب سی فرصت تھی۔ دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ دل کے ہر مرض کا علاج اسی کتاب

اس کے بعد کوئی منزل نہیں منزلوں کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

وہ بھی عام سا ہی دن تھا اسرار احمد صوفی سے اتنے ناراض تھے کہ اس کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ان سے دور دور رہ کر بھی کھٹک رہی تھی گیا تھا جو عاشق جیسے دیو سے بیاہ کر لیتی اور دفع ہو جاتی، ان کی زندگی سے مگر اسرار احمد کے خیال میں ان کے نصیب اتنے اچھے کہاں کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔

یہ اسرار احمد کا جذباتی فیصلہ تھا اور جذبات کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ ٹھنڈے دماغ سے ہی پر اثر فیصلے کیے جا سکتے ہیں مگر اسرار اس لمحے کے ہی اسرار میں کھوئے ہوئے تھے کہ ان کی بیٹی نے آخر ایسا کیوں کیا۔ زینت کے لہجے میں اپنی بیٹی کے لیے جو غرور تھا وہ انہیں توڑ گیا تھا۔ زینت کی بھی تو بیٹی ہے۔

☆☆☆

زینت کو ذرا بھی اپنی اس دن والی حرکت پر پشیمانی نہیں تھی ان کا گھر تھا، وہ جو مرضی آئے کریں ان کی بیٹی کے پاس کون بیٹھے گا اور کون انہیں ملنے آئے گا اس کا فیصلہ وہ خود کریں گی۔

"سویرا بیٹا، آ کے دودھ ابال لو۔"

سویرا نے موبائل تکیے کے نیچے رکھا اور سعادت مندی سے آ کے کھڑی ہو گئی۔

میری بیٹی جو ہوئی" انہوں نے فخر سے سوچا اور پودوں کی طرف دیکھنے لگیں۔ آج کی صبح بہت خوش گوار تھی بھتیجی کو گھر سے نکالنے کی عجیب سی سرشاری۔

"اور ایک کپ چائے لے آؤ۔ میرے لیے۔" ایسے ہی چائے کی طلب ہونے لگی تھی۔

"لے آئی ہوں امی! آپ کو صوفی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ معصوم ہے وہ۔ کیوں کیا آپ نے ایسے، اپنی بھتیجیوں کو کون ایسے گھر سے نکالتا ہے بہت مجبوری میں وہ آئی تھی۔"

سویرا نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے زینت سے کہا تھا باریک لوہے کی جالی کے پیچھے وہ اس لمحے میں

زندہ تھیں جب انہیں ریاض احمد سے جدا کیا گیا تھا عمر کا وہ حصہ آج بھی زندہ تھا ان کے دل میں۔

''تم نہیں جانتیں اس سانپ کی اولاد کو جیسی ماں ویسی بیٹی تم ان معاملوں میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے اور وہ معصوم ہے تمہاری نظر میں، پتا بھی ہے کیا گل کھلایا ہے اس نے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اس نے کسی کو۔''

سویرا جلدی جلدی کام نبٹا رہی تھی سلیب صاف کرنے کے بعد، اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ کچھ باتیں زندگی میں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انسان پر ان کا اختیار نہیں ہوتا۔

☆☆☆

صوفی نماز کی بے حد پابند تھی، اب ذکر اذکار کی بھی سخت پابند ہوگئی تھی صبح اٹھ کر نماز پڑھنے کے بعد قرآن کریم پڑھنے لگتی، یہ بھی اوپر والے کا کرم تھا جس نے اسے مایوسی سے نکالا اور سمجھایا۔ عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے یہ کسی انسان کا اختیار نہیں ہے ایسا سوچنا بے کار ہے کہ کوئی انسان بے عزت کر سکتا ہے رسوا کر سکتا ہے بس ایک غلطی کے بعد دوسری ایسی غلطی نہ کریں اور اگر کرلیں تو اللہ سے رجوع کرلیں وہ معاف کرنے کے لیے ہر لمحہ موجود ہے بندوں سے امید لگائیں۔

''کاش اس رات میں پھوپھو کے گھر کا دروازہ بجانے کے بجائے اللہ سے مدد مانگ لیتی بندوں سے مانگی مدد اور امیدوں کا انجام ایسے ہی ہوتا ہے۔'' وہ سوچ کر پرسکون ہوگئی۔

☆☆☆

''شام ذکیہ (ہمسائی) کی بیٹی کی خوشی ہے قرآن پاک حفظ کیا ہے سب کو مدعو کیا ہے اور صوفی، تم بھی چلنا ہمارے ساتھ۔ تھوڑا ماحول تو بدلے ہر وقت بیٹھ بیٹھ کے دل اوب جاتا ہے بندے کا۔''

صوفی نے لان کا نیا سوٹ اور سنہرے بندے پہنے اور اسکن کلر کی نئی چادر لے کے تیار ہوگئی۔

''کتنی پیاری ہے ہماری صوفی۔''

امی نے بھابی سے کہا اور دونوں مسکرانے لگیں۔

''اللہ اسے ہر بد نظر سے بچا کر رکھے۔'' امی کے دل سے ابھرا۔

☆☆☆

جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں تو صوفی کا جوڑ بھی مل گیا تھا اور اس نے پورے دل سے قبول بھی کیا تھا۔ صوفی کی متوقع ساس نے اس کے لیے بہت قیمتی جوڑے بھجوائے تھے۔

''صوفی بھابی! یہ جوڑا منگنی پر پہنئے گا۔'' درخشاں اس کی بڑی نند بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔

''جی یہی پہن لوں گی آپی۔'' اس نے بھی بڑے پیار سے جواب دیا تھا۔ اسرار احمد نے بھی صوفی کا ماتھا چوم لیا تھا۔ یہ دیکھ کر امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے، کوئی باپ اپنی بیٹی سے نفرت کیسے کرسکتا ہے انہوں نے زینت پھوپھو کو دیکھ کر سوچا تھا۔

''ہماری صوفی جو بھی پہنے گی اس میں ہی پری لگے گی۔'' درخشاں نے ایک پیاری سی پک لے کر علی سفینہ کو بھیج دی تھی، جسے شدت سے صوفی کا انتظار تھا سامنے کے صوفے پر بیٹھی زینت پھوپھو حقارت سے ایک ایک منظر دیکھ رہی تھیں، انہیں کوئی بھی ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔

جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر سب کو بتائیں صوفی کے بارے میں اور ساری محفل زلزلے کی نذر ہو جائے۔ کچھ لوگوں کو تباہیاں دیکھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔

اسی گھر کے دوسرے کونے میں اکیلی کھڑی سویرا اپنے فون پر بے انتہا مصروف تھی۔

''جتنی بھی بات کرلو اتنا ہی کم ہے جتنا بھی کہہ سن لو ہمیشہ کم ہی لگتا ہے۔''

اس کی مسکراہٹیں جان دار تھیں اور وہ بہت اعتماد سے بات کہہ رہی تھی۔

''رکو میں امی سے پوچھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باغیچے کی اوٹ سے نکل آئی تھی۔

زینت اپنے اندر نفرت کے طوفان کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔

''امی! وکی کہہ رہے ہیں کہ واپسی پر کھانا ہم ملک دے ڈیرے پہ کھائیں وکی کے ساتھ۔''

''اچھا کہہ دو کہ آجائیں گے۔''

''ایک تو بھولی بھالی اور اوپر سے وکی بھی دیوانہ ہے میری بچی کا۔'' ان کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ سی پھیل گئی تھی کھاتا پیتا بچہ ہے۔

سویرا اب شرمائی لجائی وہاں سے چلی گئی تھی۔

زینت پھوپھو نے بھی تربیت پر سب سے زیادہ زور دیا تھا اور نتیجہ سامنے تھا اپنی ہی بیٹی کے غلط کاموں میں ساتھ دے رہی تھیں۔

سارے میں سویرا کے فیشن اور اس کے بدلے رنگ ڈھنگ کی خبریں پھیل چکی تھیں بس نہیں سمجھا تو وکی کے عشق میں پاگل، سویرا نے اور نہ اس ناعاقبت اندیش ماں نے جس نے کسی کی مجبور بیٹی کو رات کے وقت گھر سے باہر دھکا دے کر اپنے تئیں بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

اس ایک لمحے رک کر سوچا ہی نہیں کہ غلطی کوئی بھی کر سکتا ہے غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں، انہیں اچھالنا سمجھ داری نہیں، کوئی ہے جو بہت طاقت ور ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے جو چاہتا ہے ہونے دیتا ہے۔

زینت پھوپھو نے اپنی سویرا کا مستقبل بنانے کے لیے بھرپور محنت کی تھی، اپنی بیٹی کا دل رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور یہ محنت آہستہ آہستہ رنگ لا رہی تھی سویرا اور وکی کے درمیان فاصلے سمٹتے سمٹتے بالآخر ختم ہو گئے تھے اور فاصلہ ختم ہونے کی ویڈیو ہر کسی کے موبائل میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

زینت پھوپھو کے میاں عتیق پھوپھا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ اتنا سناٹا اسرار کے ہاں — نہیں تھا، جتنا سناٹا آج زینت پھوپھو کے اندر پھیل گیا تھا۔

''سویرا تو نے یہ کیا کر دیا؟'' نوچے ہوئے

پھول کی طرح کی سویرا کی زبان گنگ ہوئی تھی۔ دوپٹہ نہ زینت کے سر پر تھا نہ سویرا کے، دنیا کتنی چھوٹی ہو گئی تھی ہر کوئی ان کے بارے میں بات کر رہا تھا باتیں کرنے سے کون کسی کو روک سکتا ہے، ایسے جیسے زینت پھوپھو نہ رکی تھیں۔

نمک پاشی کے لیے اسرار بھائی کی فیملی نہیں آئی تھی۔ جہاں زینت پھوپھو نے پوری شدت سے آگ لگانے کی کوشش کی تھی، آگ تو لگانے والے کو ہی سب سے پہلے لپیٹ میں لیتی ہے باقیوں کی باری نصیب کی ہے۔

اس شدید ترین بدنامی کے بعد خدیجہ خالہ کے بیٹے کی منگنی میں سب جمع تھے۔ زینت پھوپھو بھی جھکے سر کے ساتھ آئی تھیں۔ جب مغرب کی اذان ہوئی تب صوفی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی، اس بھری محفل میں چند ایک بوڑھی خواتین کے علاوہ لڑکیوں میں صرف صوفی ہی نماز کے لیے گئی تھی اتنے میں زینت پھوپھو بھی سویرا کی خبر لینے اٹھیں اب اسے بھٹک جانے کا ڈر نہیں رہا تھا صرف لوگوں کی زبانوں کا ڈر لگا ہوا تھا۔

''نجانے کہاں منہ چھپا کے بیٹھی ہو گی میری بچی!'' آنکھوں سے آنسو اس دن کے بعد سے خشک ہی نہ ہوتے تھے یہ دنیا تو ہے ہی ظالم اور ظالموں سے کوئی کیا امید رکھے۔

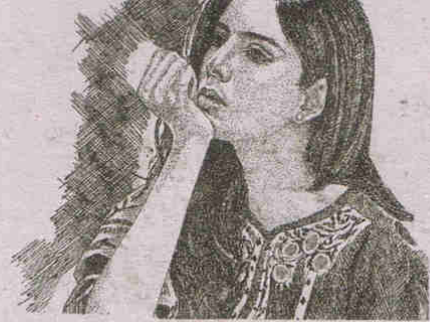
''دیکھا صوفی کو۔ ایسی ہوتی ہیں بیٹیاں سر سے دوپٹہ نہیں اترا اس کے پوری ڈھولک میں، نہ ناچ نہ گانا۔ اللہ ایسی بیٹی ہر کسی کو دے۔''

عالیہ چچی کی سچی تعریف جہاں صوفی کا دل بڑھا گئی تھی وہیں زینت کا دل دہلا گئی تھی کیونکہ وہ سویرا کے سائے سے بھی اپنی بیٹیوں کو دور رہنے کا کہہ رہی تھیں۔

زینت پھوپھو نے ''آہ کی راہ'' خود نکالی تھی۔ اب آہیں بھرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

کانٹوں کی فصل تیار تھی جو بڑے غرور سے بوئے تھے۔

☆☆



اس چہرے کی چاہت کی اور ان آنکھوں سے پیار کیا
جانے کون مسیحا تھا وہ جس نے ہمیں بیمار کیا

جس چہرے کی چاہت کی اور جن آنکھوں سے پیار کیا
ان آنکھوں نے اک دن مجھ کو حیرت سے دوچار کیا

اس نے ہماری ایک نہ مانی، اپنے من کی بات سنی
ہم نے جس کی قسمیں کھائیں، ہونے کا اقرار کیا

جانتا ہے وہ دل کو دہر کیسے لگائے رکھنا ہے
جس نے دل میں راہ بنائی اور اسے ہموار کیا

اپنا اپنا ظرف ہے بھائی، اپنی اپنی بات میاں
ہم نے اس کو راہ دکھائی، اس نے ہمیں دیوار کیا

تین تکونیں، تین تماشے، بیچ میں چار تماشائی
تھا وہ کھیل ہی جس کو دل نے عبث آزاد کیا

ملاحوں کے گیت میں شامل میری بھی آواز رہی
ایک سنہری شام کو میں نے جب وہ دریا پار کیا

کون زمانی، کون مکانی، کون ہے کامی لافانی
کون تھا جس نے گھڑی بنائی، وقت کو یوں دشوار کیا

ایک اچھی سی شام میں کامی اک اچھی شہزادی نے
آنکھوں میں کچھ دیپ جلائے اور دل کو گلزار کیا

سید کامی شاہ

پرانی بات

محبت کی کہانی میں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کوئی کردار قصے کو اچانک درمیاں سے چھوڑ کر
رستہ بدل کر
ممکنہ انجام سے پہلے کہانی کا سرا ہی موڑ دیتا ہے
تو پھر امید کے موسم میں ناامید ہوتے کی
صلیبوں پر لٹکتا وہ دوسرا کردار
قصے میں کئی صفحات خالی چھوڑ دیتا ہے
اگرچہ بعد میں بھی کہانی چلتی رہتی ہے
مگر اس کی عبارت سننے والوں کو بعید از فہم
لگتی ہے
سمجھ میں آئے بھی کیسے
کہانی میں جہاں صفحات خالی رہ گئے
شاید
وہاں پر وصل کا اک باب آنا تھا
کسی کو منتظر رہنا، کسی کو لوٹ آنا تھا

ناہید قمر

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیے جلانے لگے

کچھ نہ پا کر بھی مطمئن ہیں ہم
عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے

یہی رستہ ہے اب، یہی منزل
اب یہیں دل کسی بہانے لگے

خود فریبی سی خود فریبی ہے
پاس کے ڈھول بھی سہانے لگے

اب تو ہوتا ہے ہر قدم پہ گماں
ہم یہ کیسا قدم اٹھانے لگے

اس بدلتے ہوئے زمانے میں
تیرے قصے بھی کچھ پرانے لگے

رُخ بدلنے لگا فسانے کا
لوگ محفل سے اُٹھ کے جانے لگے

ایک پل میں وہاں سے ہم اُٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو
تیر پر اُڑ کے بھی نشانے لگے

ہم تک آئے نہ آئے موسمِ گُل
کچھ پرندے تو چہچہانے لگے

شام کا وقت ہو گیا باقیؔ
بستیوں سے شرار آنے لگے

باقیؔ صدیقی

تمہیں ایک بات کہنی تھی
اجازت ہو تو کہہ دوں میں
یہ بھیگا بھیگا سا موسم
یہ تتلی پھول اور شبنم
چمکتے چاند کی باتیں

یہ بوندیں اور برساتیں
یہ کالی رات کا آنچل
ہوا میں ناچتے بادل
دھڑکتے موسموں کا دل
مہکتی خوشبوؤں کا دل
یہ سب جتنے نظارے ہیں
کہو کس کے اشارے ہیں

سبھی باتیں سُنیں تم نے
میں تب جا کر کہیں سمجھا
کہ تم نے کچھ نہیں سمجھا
میں قصہ مختصر کر کے
ذرا نیچی نظر کر کے
یہ کہتا ہوں ابھی تم سے
محبت ہو گئی تم سے

زبیر علی تابش

شگفتہ شاہ

رنگا رنگ پھول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے مشکیزوں کا منہ باندھ دیا کریں اور برتنوں کو ڈھانک دیا کریں۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اسلام نے اپنی تعلیمات میں حفظان صحت کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ حدیث مبارک ہے جس میں کھانے پینے کی چیزوں کو نقصان دہ اشیا سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈھانک کر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

2۔ پانی میں مضر صحت اشیاء، گرد و غبار وغیرہ بہت جلد مل جاتی ہیں۔ جب پانی کی مقدار کم ہو جیسے کہ گھر کے برتنوں میں ہوتی ہے تو تھوڑی سی آلودگی پانی کو نا قابل استعمال بنا سکتی ہے۔ پانی کے مشکیزے کا منہ باندھ کر رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ اس طرح پانی آلودگی سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے خراب ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

3۔ برتن خواہ پانی کے ہوں یا کھانے کے ان پر ڈھکن وغیرہ ضرور رکھنا چاہیے تا کہ ان میں گرد و غبار یا کیڑے مکوڑے داخل نہ ہو سکیں کیونکہ بعض حشرات خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر رات کے وقت چھوٹے موٹے حشرات اپنے بلوں سے باہر نکلتے ہیں، وہ کھانے پینے کی چیزوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے رات کو برتن ڈھانکنے کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

جواب

سقراط کہتا ہے کہ میں جب چھوٹا تھا تو صبح کو بہت دیر سے اٹھتا تھا، والدہ کو میری اس روش سے سخت نفرت تھی، کیوں کہ وہ مجھے ایک بہت بڑا تاجر دیکھنا چاہتی تھیں۔ ایک دن مجھے ایک استاد صاحب کے پاس لے گئیں تا کہ وہ مجھے سویرے اٹھنے کے فوائد بتائیں۔ اس استاد نے ایک کہانی کے ذریعے مجھے سمجھایا۔

"دو پرندے تھے۔ ایک سویرے اٹھ کر کیڑے مکوڑے تلاش کر کے پیٹ بھرتا تھا اور دوسرا دیر سے اٹھتا جس کے لیے کوئی کیڑا مکوڑا زمین پر رینگتا ہوا نہ ہوتا کہ وہ کھا سکے۔"

یہ کہانی سنا کر استاد نے سقراط سے پوچھا۔

"اس کہانی سے آپ نے کیا سمجھا؟"

سقراط نے جواب دیا۔ "جو کیڑے جلدی اٹھتے ہیں وہ جلدی کھائے جاتے ہیں۔"

جواب

بستر پر جاتے وقت 81 سالہ بڑی بی نے چوراسی سالہ میاں سے کہا۔

"سنو ابھی میری نظر کھڑکی سے باہر گئی تو مجھے لگا کہ گیراج کی بتی جل رہی ہے۔ کیا تم اٹھ کے اسے بند کر آؤ گے؟"

بڑے میاں بڑی مشکل سے بستر سے نکلے، دروازہ کھول کر باہر نکلے تو دیکھا کہ پانچ چھ نقب زن گیراج کے دروازے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں۔

بڑے میاں نے وہیں سے پولیس اسٹیشن فون کیا۔

"دیکھو...... میرا پتا لکھو۔ ہم صرف دو بوڑھے میاں بیوی گھر پر ہیں اور پانچ چھ چور میرے گیراج پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ جلدی کسی پولیس ٹیم کو بھیجو......"

"ہم نے آپ کا پتا لکھ لیا ہے۔ بے فکر رہیں۔ ابھی کوئی ٹیم فارغ نہیں۔ جیسے ہی کسی ٹیم سے رابطہ ہوتا ہے، میں فوراً بھیجتا ہوں۔"

بڑے میاں خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ نقب زن ابھی تک گیراج کے تالوں سے الجھے ہوئے تھے۔ دو منٹ بعد انہوں نے پھر پولیس اسٹیشن فون کیا۔

"سنو...... اب کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان پانچوں کو گولی ماردی ہے۔"

پولیس اسٹیشن میں کھلبلی مچ گئی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر پولیس ٹیم ایک ہیلی کاپٹر، ایک پیرامیڈیکس، تین ڈاکٹرز اور دو ایمبولنس کے ساتھ گلی میں نمودار ہوئی۔ جلد ہی ان مجرموں پر قابو پالیا گیا۔ بعدازاں ٹیم کا انچارج ٹہلتا ہوا بڑے میاں کے پاس آیا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے انہیں گولی مار دی ہے؟"

"اور آپ لوگوں نے بھی تو کہا تھا کہ کوئی ٹیم فارغ نہیں ہے۔"

دو مرتبہ دفن

ملیریا سے دم توڑنے کے بعد مارگوری کو جلد قبر میں دفن کر دیا گیا کہ اس کی لاش سے وبا پھیلنے سے روکا جاسکے۔

اس کے شوہر نے مارگوری کو شادی پہ ایک قیمتی انگوٹھی تحفتاً دی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کا خاوند اس کے جسم پر سوجن ہو جانے کی بنا پر اتارنے میں ناکام رہا۔ مارگوری کی قبر قیمتی انگوٹھی کی وجہ سے چوروں کا ہدف بن گئی۔ مارگوری کی تدفین کے بعد اسی شام اس کی قبر پر چور پہنچ گئے۔ قبر کی کھدائی شروع کر دی۔ جتن کے باوجود وہ اس لاش کی انگلی سے انگوٹھی نہ نکال سکے۔ انہوں نے انگلی کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے انگلی کاٹی تو خون کی ایک دھار نکلی۔ مردہ لاش میں حرکت ہوئی اور لاش چیخنے لگی۔

مارگوری قبر سے باہر آ کر گھر چلی گئی۔ اس کا شوہر، فیملی ڈاکٹر اور اس کے بچے گھر میں سوگوار بیٹھے تھے۔ مارگوری نے اپنے گھر کے دروازے پہ دستک دی۔ اس کے شوہر نے دستک پہچانتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کی ماں ابھی زندہ ہوتی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ اس کی دستک ہوتی۔"

دروازہ کھولا گیا تو سامنے اس کی بیوی کفن میں ملبوس کھڑی تھی۔ اس کی انگلی سے خون ٹپک رہا تھا مگر وہ زندہ لگ رہی تھی۔ اس کا شوہر یہ دیکھ کر فرش پر گرا۔ اس پہ دل کا دورہ پڑا، وہ موقع پر ہی فوت ہو گیا۔

مارگوری نے دوسری شادی کی۔ اس کے کئی بچے پیدا ہوئے۔ جب اس کی قدرتی موت ہوگئی تو اسے آئرلینڈ شنکیل قبرستان میں دفنایا گیا۔ اس کی قبر پر کندہ ہے۔

"زندگی ایک مرتبہ، موت دو مرتبہ، دفن دو مرتبہ۔"

حکمت عملی

جنوری 1920ء سے دسمبر 1933ء تک امریکہ میں شراب ممنوع تھی۔ اور امریکہ میں شراب تیار کرنا، رکھنا، فروخت کرنا، خریدنا اور پینا سخت غیر قانونی اور قابل تعزیر جرم تھا۔

لیکن امریکیوں کو شراب سے دور رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پاک و ہند کے لوگوں کو چائے سے دور رکھنا۔

چنانچہ...... اس عرصے کے دوران دکاندار اور فروخت کار خشک کیے گئے انگور کی، ڈبہ بند اینٹ کے سائز کی کیوبز رکھا کرتے تھے۔ اور ساتھ یہ ہدایات تحریر ہوتی تھیں کہ......

"اسے ایک لیٹر پانی میں حل کرنے کے بعد اس میں تھوڑا سا خمیر ڈال کے اسے بیس دن کے لیے ہرگز الماری میں مت رکھیں کیونکہ اس طرح یہ شراب بن جائے گا۔"

☆☆

روحیلہ خان

میری بیاض سے

نمرہ اقرا.................کراچی

تو سمجھتا ہے محبت نے مجھے کچھ نہ دیا
دیکھ لے آکے یہ تحفے میں قضا لائی ہے
عمر گزری ہے محبت میں تو احساس ہوا
اس خرابے میں تو رسوائی ہی رسوائی ہے

ارم کمال.................فیصل آباد

کبھی سحر کی خوشی اور کبھی غروب کا دکھ
چلا گیا وہ مرا دن بسر یونہی کر کے
کسی کو بھولنا آسان ہی سہی لیکن
مسعود تم نے یہ دیکھا بھی ہے کبھی کر کے

رضوانہ وقاص.................ہری پور

یوں تو میں ترے دل میں ہوں پر کس کو خبر ہے
تو ڈھونڈنے نکلے تو کہیں اور سے نکلوں

سونیا ربانی.................

چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدورتیں
دیوار سے پرانا کیلنڈر اتار کے

سحر احمد.................کراچی

کوہِ انا کی برف تھی دونوں جمے رہے
جذبوں کی تیز دھوپ میں پگھلا نہ وہ نہ میں

اقصیٰ ناصر.................کراچی

بجھتی یادوں کو ہوا دیتی ہیں
بارشیں اور جلا دیتی ہیں
بوندیں مٹی پہ پڑیں تو تیرے
نقش خوشبو سے بنا دیتی ہیں

شفق آفاق.................کراچی

اتنا برسے تری تصویر بناتے ہوئے نین
بہہ گئے رنگ سبھی اور بنا کچھ بھی نہیں

انعم طلحہ.................کراچی

غم الفت میں جل رہا ہے کوئی
کیوں انگاروں پہ چل رہا ہے کوئی
اب تو لگتا ہے آستیں میں مری
کب سے چپ چاپ پل رہا ہے کوئی

خنسا احمد.................بفرزون

جس کو ہم نے چاہا تھا وہ کہیں نہیں اس منظر میں
جس نے ہم کو پیار کیا وہ سامنے والی مورت ہے

شائستہ نسرین.................اسکیم 33

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

امبر اکرام.................کراچی

اشک بہنے لگ گئے منظر نکھرنے لگ گیا
میں تماشا بن گیا اور ایک کھڑکی کھل گئی

عالیہ وحید.................پشاور

گمان ہونے لگا ہے یہ کس کے ہونے پر
کہیں کہیں جو نہیں ہے کہیں کہیں ہے بہت

عابدہ نفیس.................بحریہ ٹاؤن

اپنی آنکھیں مرے چہرے پہ جمائے رکھنا
ان میں پوشیدہ کئی خواب سجائے رکھنا
دل میں بیتاب فضاؤں کا سماں ہے جاناں
اب یہ طوفان شب و روز اٹھائے رکھنا

یسریٰ قریشی.................ڈیفنس

اپنی خوشبو سے مری روح کو معطر کر دے
غم کی اس رات کو تھوڑا سا منور کر دے
میں صراط رہ ہستی سے گزر جاؤں خدا
تو مرے صبر کو دریا سے سمندر کر دے

گڑیا.................لندن

رشتہ بحال کاش پھر اس کی گلی سے ہو
جی چاہتا ہے عشق دوبارہ اسی سے ہو

خاتون کی ڈائری

حمدہ خان کی ڈائری سے

آپ نے یہ شعر اکثر سنایا پڑھا ہوگا، خصوصاً اس کا مصرع ثانی تو لازماً پڑھ رکھا ہوگا۔

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

امیر مینائی کی یہ لازوال مکمل غزل ملاحظہ فرمائیں......

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چُن چُن کے مارے
نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے

نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذر خزاں کیسے کیسے

ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا
مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے

ترے جاں نثاروں کے تیور وہی ہیں
گلے پر ہیں خنجر رواں کیسے کیسے

خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

امیر اب سخن کی بڑی قدر ہوگی
پھلے پھولیں گے نکتہ داں کیسے کیسے

سحر سہیل کی ڈائری سے

اس نظم میں دسمبر کا آخری سورج ڈوبتے ہوئے نئے سال کی مبارک باد دے رہا ہے۔

ڈوبتے دسمبر کی
شام کے سرہانے پر
چند پھول رکھے ہیں
دلنشین لہجوں کے
دل فگار باتوں کے
دلفریب لمحوں کے
یہ پیام بھیجا ہے
دلنشین چہروں کو
دلفریب لہجوں کو
دل نواز لوگوں کو
زندگی مبارک ہو
جنوری مبارک ہو
آنے والے وقتوں کی
دوستی مبارک ہو!

روحیلہ خان کی ڈائری سے

محبت اور دکھ، شہزاد نیر کی یہ نظم میں جب بھی پڑھتی ہوں ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ محبت ہمیشہ دکھ دیتی ہے۔ قربت ہو یا جدائی، محبت کرنے والے کبھی پورے دل سے خوش نہیں ہو پاتے۔

محبت ڈھونڈنے والی
حقائق سے بھری دنیا میں
سپنے دیکھنے والی حسین لڑکی
حقیقت تلخ ہوتی ہے
تجھے معلوم کیسے ہو
محبت وہ پرندہ ہے

جو اپنا آشیاں ہر بار کانٹوں پر بناتا ہے
محبت وہ کلی ہے
جو کسی جانب نہیں کھلتی
محبت وہ بیاباں ہے جو راہی چاٹ لیتا ہے
وفا آمیز آنکھوں سے
زمانے کے دل بے مہر میں
چاہت کی خوشیاں ڈھونڈنے والی
زمانے کو وفا کا درس دینے میں
کئی صدیاں گزرنا ہیں
ان ہی صدیوں کے قدموں میں محبت درد ہوتی ہے
محبت کیسے سکھ دیتی
خدائے درد الفت نے
محبت اور دکھ
دونوں کو اک پانی میں گوندھا تھا

انعم طلحہ کی ڈائری سے

انوار فیروز کی یہ غزل میری ڈائری میں لکھی ہے جو مجھے بہت پسند ہے کہ زندگی تو بھاگنے دوڑنے کا نام بن گئی ہے اس دوڑ میں ہم نے اپنے دوست، رشتے ناتے کہاں چھوڑ دیے جن کے ساتھ ہم نے کبھی بڑا خوب صورت وقت گزارا تھا پر آج وہ اہم اور اچھے لوگ وقت کی دھول میں کہیں گم ہو گئے۔ یقیناً بہنوں کو میرا یہ انتخاب ضرور پسند آئے گا۔

تجھے سوچے زمانے ہو گئے ہیں
خطا اپنے نشانے ہو گئے ہیں

کہاں کی دوستی اور کیسے ناتے
یہ قصے اب پرانے ہو گئے ہیں

خیالوں میں بھی تو آتا نہیں ہے
تجھے دیکھے زمانے ہو گئے ہیں

کوئی صورت نہیں حیلہ گری کی
پرانے سب بہانے ہو گئے ہیں

ہمیں آتا ہے بچنے کا طریقہ
خطا اس کے نشانے ہو گئے ہیں

شرافت آئینہ تھی کیسے دن تھے
مگر اب وہ فسانے ہو گئے ہیں

عجب انوار حالت ہے ہماری
کہ گھر بھی کارخانے ہو گئے ہیں

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوب صورت غزل آپ سب قارئین کے لیے۔

تیرے رستوں کے دیار میں، تیرے بادلوں کو پتا نہیں
ابھی آگ سرد نہیں ہوئی، ابھی اک الاؤ بجھا نہیں

میری بزم دل تو اجڑ چکی، میرا فرش جاں تو سمٹ چکا
سبھی جا چکے مرے ہم نشیں! مگر ایک شخص گیا نہیں

در و بام سب نے سجا لیے، سبھی روشنی میں نہا لیے
میری انگلیاں بھی جھلس گئیں مگر اک چراغ جلا نہیں

غم زندگی تیری راہ میں، شب آرزو تیری چاہ میں
جو اجڑ گیا وہ بسا نہیں، جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

جو دل و نظر کا سرور تھا میرے پاس رہ کے بھی دور تھا
وہی اک گلاب امید کا، مری شاخ جاں پہ کھلا نہیں

پس کارواں سر رہ گزر، میں شکستہ پا ہوں تو اس لیے
کہ قدم تو سب سے ملا لیے، مرا دل کسی سے ملا نہیں

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

چٹ پٹی کھڑا مسالہ مچھلی

ضروری اشیاء:

مچھلی	ڈیڑھ کلو
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
سفید سرکہ	آدھا کپ

مسالے کے اجزاء:

لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
پیاز	پانچ عدد
ٹماٹر	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
گرم مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	آدھا کپ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچ	پانچ عدد
دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	ایک کپ

ترکیب:

مچھلی پر اجوائن، ہلدی اور سرکہ لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

تیل گرم کر کے پیاز ڈالیں۔ جب گولڈن ہو جائے تو ادرک، لہسن، ہلدی، لال مرچ، نمک اور دھنیا ڈال کر تھوڑا سا پانی ڈالیں۔ مسالے کو اچھی طرح بھون کر ٹماٹر ڈال دیں۔ جب ٹماٹر نرم ہو جائیں تو مچھلی دھو کر ڈالیں۔ چمچہ نہیں چلانا ہے بس دیچی پکڑ کر ہلائیں اور نہایت احتیاط سے چمچے سے پلٹیں۔ جب مچھلی کا پانی خشک ہونے لگے اور تیل نظر آنے لگے تو پا گرم مسالہ اور لیموں کا رس ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ اب کسی سرونگ باؤل میں نکال کر اوپر سے ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر گارنش کر لیں۔ چاہیں تو ہری مرچ اور تھوڑا ہرا دھنیا جب لیموں اور گرم مسالہ ڈالیں اس وقت بھی ڈال دیں۔ نہایت لذیذ مچھلی تیار ہے۔ اس کو نان یا تندوری روٹی کے ساتھ سرو کریں۔

نوٹ: اس میں مسالہ گلا ہوا بالکل گریوی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ کھڑا کھڑا ہوتا ہے۔

گاجر کا حلوہ

ضروری اشیاء:

گاجر	دو کلو
دودھ	ایک کلو
گھی	چوتھائی کپ
ہری الائچی	چھ عدد
چینی	ڈیڑھ کپ
کھویا	ایک کپ
بادام، پستہ	حسب پسند

ترکیب:

گاجر کو چھیل کر کدوش کر لیں اور انہیں ایک کلو دودھ میں پکائیں جب دودھ تقریباً خشک ہو جائے تو اس میں چینی شامل کر کے خشک ہونے تک پکائیں۔

ایک برتن میں گھی گرم کر کے الائچی ڈال دیں اب اس گھی کو حلوے میں ڈال کر اچھی طرح بھون لیں آخر میں کھویا اور میوہ ڈال کر چند منٹ دم پر رکھیں اور چولہے سے تار لیں۔

☆☆

بقیہ خط آپ کے

تسلسل نہیں ٹوٹنے دیتیں "کرائے دار" جیسی عمدہ تحریر سے پورا پورا انصاف کیا۔ آٹھ ماہ پہلے ادارہ اور قارئین بہنوں کے اصرار پر اس ناچیز نے افسانہ ارسال کیا تھا۔ کوشش کیا کریں افسانہ کا فیصلہ جلدی کر دیا کریں فیصلہ ہو تو دیگر موضوعات پہ کچھ لکھ کر ارسال کروں......؟ لمحہ لمحہ بے حد قیمتی ہے۔ لکھنے کے مراحل محض شوقیہ ہیں۔ مستقل ناولز کو تسلی سے فرصت سے پڑھیں گے البتہ "سامنے والی کھڑکی" سے استفادہ کرنے کا وقت نکال ہی لیا۔ ویلڈن فرح بخاری جی!

گوشی جی خواتین کی محفل میں آپ کی آمد ہمیشہ خوشی دیتی ہے۔ اس بار خط کچھ پھیکا لگا خیر یہ کچھ غیر معمولی بات نہیں۔ انسان کے موڈ میں حالات کے حساب سے اتار چڑھاؤ تو آتے رہتے ہیں۔

آپ کا افسانہ اس لیے شائع نہیں ہوا کہ آپ نے اپنی بہنوں کے جو مسائل خطوط میں لکھے ہیں اور جس کا اظہار نا تا جوڑا ہے کے سلسلے میں کیا، کم و بیش وہی مسائل اور حالات افسانے اور ناول میں بھی لکھے ہیں۔ فوری طور پر افسانہ شائع نہیں کر سکتے اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن اس دوران آپ فارغ نہ بیٹھیں کسی اور موضوع پر لکھ کر ارسال کریں بلاشبہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔

فرزانہ انصاری......کراچی

پچھلے دنوں اچانک "پتے" میں شدید درد ہوا۔ 21 نومبر کو طبیعت خراب ہوئی۔ دو چار دن ٹیسٹ میں گزرے اور 26 نومبر کو ایمرجنسی میں آپریشن کر کے "پتا" نکالنا پڑا۔ بہت تکلیف دہ وقت گزرا مگر اب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں بالکل صحت مند ہوں۔

پچھلے ماہ تبصرہ نہیں لکھ سکی مگر ڈائجسٹ میں نے ضرور پڑھا۔ سلسلے وار ناول ہمیشہ کی طرح بہترین رہے۔ "میمونہ صدف" کا ناول "کہانی خود کو دہراتی ہے۔" اچھا لگا۔ "کمزور سائبان۔" نے آنکھیں نم کر دیں۔ کیسے بہن بھائی ہوتے ہیں جو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے

ایک دوسرے کا خیال نہیں کرتے۔ اگر کسی کے معاشی حالات اچھے نہ ہوں تو ان کا خیال رکھنا چاہئے نا، یاں کہ آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اماں کا کردار اچھا لگا۔ "واقعی ماں تو ماں ہوتی ہے۔" "راشدہ رفعت" کا "سویرا اجالا اور روشنی" ہلکی پھلکی تحریر رہی۔ اس کے بعض جملے تو بے ساختہ ہنسا گئے جیسے کہ جب اجالا اپنی دادی سے کہتی ہے۔

"بڑے ابا نے کیا شوشا چھوڑا ہے بڑی اماں۔"

"ہائے کیا ہوا، کیا وائی فائل بند کروا رہے ہیں۔"

اف اللہ بچے اور بڑے تو جو ہیں سو ہیں ہمارے بزرگ بھی کس قدر عادی ہوتے جا رہے ہیں انٹرنیٹ کے، بہر حال مجھے تو یہ تحریر بہت اچھی لگی۔

دسمبر 2024 کا شمارہ خلاف معمول کچھ جلدی مل گیا۔ "کہنی سنی" میں آپ کی بات سے متفق ہیں۔ ہمیں آپس کے اختلافات اور لسانی بنیادوں کو ختم کرنا ہوگا۔ جب تک ہم سب مل جل کر کام نہیں کریں گے یہ سب یونہی چلتا رہے گا۔

میں تو بھئی سب سے پہلے "مالا" پڑھتی ہوں۔ "مالک فرید" کی بگڑتی طبیعت سے زارا پر مالک کی بیماری آشکار ہوئی۔ "عالیان" کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا یہ "کبیرہ تائی" کا بیٹا ہے اور یہ زارا سے کیسے ٹکرا گیا۔ کافی دنوں سے ماہی اور معید کا ذکر نہیں ہے۔ مالا اتنی پریشان ہے ایسے وقت میں اس کے بہن بھائیوں کو ساتھ ہونا چاہیے۔

"پردیس" میں روشن کی رہائی اور پاکستان واپسی نے ایک خوشی دی۔ آپی ہم ابھی امریکہ کو جنت ہی سمجھتے تھے مگر بھئی اپنا ملک ہی جنت ہے۔ اتنی تکالیف تو نہیں ہیں مگر مجھے امریکی قانون "جس کا کوئی نہیں۔ اس کے ساتھ امریکی ریاست ہے۔" بہت اچھا لگا۔ اور حیرت انگیز بات وہاں قانون پر مکمل درآمد ہے۔

"آنگنا پھول کھلیں گے۔" میں ثانیہ کی نتاشا کے ہاتھوں بے عزتی مزہ دے گئی۔ ثانیہ کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے کیسے اس نے ہنستے بستے گھر کو اجاڑا ہے۔ اور یہ عفان اپنے بھتیجے کے ساتھ اس قدر

چی کیوں ہے؟"

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے بیوہ، اور طلاق یافتہ کا جلد سے جلد دوبارہ نکاح کروادیا جائے تو یہ عفان کون ہوتا ہے زارا پر حکم چلانے والا۔

اور اب جناب بات ہوگی "احد" کی پر اسود کو "امت الشکور" میں کیا نظر آیا جو اسے پروپوز ہی کر دیا۔ کیا اسود کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔ صرف نام کی مماثلت سے اس قدر محبت؟ اس سے تو لاکھ درجہ بہتر "مہر تاب" ہے۔

مومنہ کے لیے عامر اور اس کے گھر والوں کے رویہ اتنے شاکڈ کیوں ہیں؟ وہ مل اونر کہاں کسانوں، چوہدریوں کی عزت کریں گے جبکہ ان کی پہنچ اوپر تک ہو۔

"پروفیسر زید" جیسے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟ اتنے بڑے وکیل اور کس قدر سادہ طبیعت اور اثر انگیز گفتگو۔

مومنہ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے اسے ایسا ہی کرنا چاہیے اور "ہمایوں" کا وہ جملہ جو وہ مہر تاب سے کہتا ہے "صحیح کہتی ہو۔ فرق تب نہیں پڑا۔ اب پڑا ہے۔ منگنی اس سرپھری نے توڑ لی ہے۔ اب مجھ پر نظریں رکھ کر بیٹھی ہے۔ اف پتا نہیں کیا ہوگا میرا اپنی ماں کا اکلوتا یعنی اکلوتا بڑا بیٹا اس جادوگرنی کے چنگل میں پھنس گیا تو ہائے نی میں کینوں آکھا۔" بے ساختہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا۔

احتل کے منظر پر آنے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

بہر حال آئندہ قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

پیاری فرزانہ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ آپ کی کہانی زیر غور ہے۔

زارا احمد لغاری ...... دادو ضلع

اس بار خط لکھنے کی وجہ خاصی معقول ہے۔ دل بھی خوش گماں ہو جاتا ہے کبھی مرجھا جاتا ہے۔ خط اس بار بہت مختصر ہے۔ کیونکہ میرا دل ابھی تک دکھا ہوا ہے۔ میرے ہاں قریب قریب بھی کوئی رائٹر نہیں۔ یقیناً یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ بارہ سال کی عمر سے چھوٹی بڑی کہانیاں لکھ کر رکھ دیتی تھی۔ حالانکہ ہمیں اردو لکھنا اور پڑھنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ بس اچانک قلم اٹھاتی اور لکھنے بیٹھ جاتی۔ ان دنوں گمان بھی نہیں تھا ڈائجسٹ نامی کوئی چیز اپنا وجود رکھتی ہے۔ قصہ مختصر میں نے تین سال پہلے آگے پیچھے دو ناول بھیجے تھے۔ "سود اور خسارہ"، "دوسرا" میں طلب تو عطا" کے نام سے خط آپ کو ملے، کہانیوں کا تذکرہ بھی نہ کیا۔ پھر چار افسانے جو کہ لکھنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا جواب بھی نہ ملا۔ اب بڑے مان سے آخری بار سمجھ کر دو افسانے بھجوا رہی ہوں۔

کسی کی صلاحیت کو، رنگ لگانا عجیب معاملہ ہے پر اللہ مالک ہے۔

اکتوبر کا ٹائٹل دل کو بھا گیا آج کل بہت یونیک سے ٹائٹل ہیں جیسے جیسے ناول اختتام پذیر ہے دل ڈوب سا جاتا ہے قارئین بہنیں پلیز، ناول کو تنقید کا نشانہ نہ بنائیں اس کا چارم پہلی قسط والا ہی ہے۔ اور ایک خاص بات "ہم قارئین کو اپنی رائٹر سے خاص انسیت محسوس ہوتی ہے۔ ثمرہ بخاری کا انٹرویو پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ لگتا نہیں یہ شلی جوادی والی ثمرہ بخاری ہے۔

فوزیہ فرخ کا انٹرویو پڑھا کھڑے کھڑے ختم کیا ان شاء اللہ کچھ عرصہ بعد خط لکھوں گی۔ جب نمرہ احمد کا نیا ناول شروع ہوگا۔

پیاری زارا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی تحریریں پڑھی نہ جاسکیں۔ کوشش کریں گے کہ پرچا آنے کے بعد پہلی فرصت میں آپ کو جواب دیں۔

پیاری بہن ہمیں ڈاک کے مسائل کا بخوبی اندازہ ہے۔ اسی لیے تبصرہ تاخیر سے موصول ہو تب بھی شامل کر لیتے ہیں۔ آپ کا اکتوبر 24 کا تبصرہ جنوری 25 کے شمارے میں شامل کر رہے ہیں۔

رضوانہ وقاص ...... کرلاں ہری پور

خواتین اور کرن اتنا لیٹ کیوں آتے ہیں۔ کیا

شعاع والے پتے پر ہی خواتین اور کرن کے لیے خط بھیج سکتی ہوں۔ بتانا ہے۔ اور یہ دونوں بازار میں کس تاریخ تک آ جاتے ہیں۔

اس ماہ ماڈل بہت ہی پیاری لگی۔ جیولری ہلکی پھلکی بہت پسند آئی۔

رات کو میرے شوہر خواتین لائے تو بتایا۔ بیٹے احمد کا ایکسڈنٹ ہوا ہے کھلابٹ تیتے پلی کے پاس۔ اللہ پاک کا شکر ہے میرا احمد بچ گیا۔ پھر صبح سب سے پہلا فون سعد بھائی کا آیا کراچی کام کے سلسلے میں کراچی ہی رہتا ہے۔ احمد سے سب نے بات کی۔

پھر دن کو سب آتے رہے شکر ہے۔ اللہ نے بچا لیا احمد کو۔ گاؤں والے ایک دوسرے سے پیار محبت کرنے والے۔ ذرا سی بات ہو۔ آنا جانا۔ ویسے بھی غم ہو پریشانی ہو۔ سب ایک دوسرے کی طرف جاتے ہیں۔ لیکن اس بات کا بھی سب خیال کرتے ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور ماں جوانی میں ہی بیمار ہو کر چارپائی سے جا لگی۔ ''کہنی ستی'' کہتے ہیں ماضی کو بھلا دو آگے بڑھو لیکن کچھ یادیں، باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جنہیں بھلایا ہی نہیں جاتا جتنی کوشش کی جائے (ہاں ناں)

''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں'' بہت اچھی ہوتی ہیں بہت سی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ خط لکھنے کی وجہ ''علی عباس سے باتیں'' آپ اداکاروں کا انٹرویو لیتے ہیں۔ تو ساتھ میں فیملی کی بھی تصویریں لیا کریں۔ اور تفصیل سے سب باتیں لکھا کریں۔ پھر جی دل پسند مصنفہ نعیمہ ناز سے ملاقات اچھی لگی۔

نعیمہ ناز مجھے بھی آپ کی طرح مصنفہ بننے کا شوق ہے۔ بتائیں کیسے آپ اتنی اچھی کہانیاں لکھ لیتی ہیں۔ میں ہمت نہیں ہارتی کہانی لکھ کر رکھ لیتی ہوں کہ کبھی نہ کبھی تو شائع ہو جائے گی۔ ''ہمارے نام'' میں سب کے خط پڑھتی ہوں۔ سب سے گھر بیٹھے ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ خط میں لکھنے والی دوستیں کیا ایک دوسرے سے مل سکتی ہیں۔ جو اگر نزدیک ہو۔ نعیمہ ناز کا راستہ پڑھا۔ اس دن کے لیے تو بیٹے نہیں مانگنا اللہ جی سے بوجھ لگنے لگ جائیں۔ آسیہ ساجد ''مائے نی میں کنھوں آکھاں'' ہم بیٹیاں اتنی مجبور اور اتنی بے بس کیوں ہوتی ہیں۔

میں سمجھتی ہوں میں ہی اتنی مجبور اور بے بس ہوں۔ لیکن پھر کہانیاں پڑھ کر حوصلہ مل جاتا ہے۔ میں چل پھر نہیں سکتی ناں۔ پہلے امی کے پاس ہی رہتی تھی۔ لیکن اب گرمیوں سے اپنے گھر آ گئی ہوں۔ لیکن امی کے لیے ہر وقت پریشان رہتی ہوں کہ اللہ جی میری امی کو کچھ نہ کرنا۔ میرا کیا ہوگا ابو پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔ اللہ پاک سب آسانی کریں۔ آمین۔

''پھوپھو کی بہو'' اچھا لگا۔ ''اترن'' پڑھا اگر نند بھابھی کے بچے۔ آگے پیچھے کے ہوں تو کپڑے چل جاتے ہیں۔ ہم تو ایک دوسرے کو دے دیتے ہیں۔ جو اس طرح ایک دوسرے کو کپڑے دیں وہ کیا اترن ہوتی ہے۔ امجد اسلام امجد اور انجم رہبر کی دونوں کی غزلیں اچھی لگیں۔ ''رنگا رنگ پھول'' بھی پڑھا۔ ''میری بیاض سے'' خاتون کی ڈائری سب نے اچھا لکھا ہوا تھا۔ آپ کا باورچی خانہ ضرور پڑھتی ہوں اور موسم کے پکوان کام بے شک اب کام نہیں کر سکتی لیکن پڑھتی ضرور ہوں۔ نفسیاتی الجھنوں میں بھی لکھ سکتی ہوں یہ بھی ضرور پڑھتی ہوں۔ بیوٹی بکس پڑھتی ہوں لیکن ٹرائی آج تک کچھ نہیں کیا۔ کیونکہ دل تو چاہتا ہے میں بھی خوب صورت لگوں۔ لیکن پھر ایک ایک چیز کون لا کر دے۔ بندہ کچھ نہ کر سکتا ہو۔ وہ بس پڑھ کر ہی گزارہ کر لے ہاں ناں۔ ٹھیک ہے۔

ج: پیاری رضوانہ! آپ کے لیے بہت ساری دعائیں۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ بہن رضوانہ کی صحت کاملہ کے لیے دعا کریں رضوانہ! آپ ہمت نہ ہاریں۔ ان شاء اللہ، اللہ بہتر کرے گا۔ خط اور تبصرہ بہت اچھا ہے۔ آپ کا فون نمبر مل گیا ہے کسی دن آپ سے بات کریں گے۔

آپ ایک ہی لفافے میں تینوں پرچوں کے لیے خط بھجوا سکتی ہیں۔

صدف ناصر...... گوجرانوالہ

2024ء کا آخری شمارہ ناز نخرے دکھا دکھا کر 9 دسمبر کو ملا ہے۔ ''ٹائٹل'' ہمیشہ کی طرح بے حد شاندار۔ ماڈل خوب صورت۔

''کہنی سنی'' اچھی لگی۔ ''سالگرہ مبارک قائد اعظم محمد علی جناحؒ''

''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں'' پسندیدہ ترین موضوع (فضائل قرآن) پر مشتمل۔ بہت کچھ حاصل ہوا۔

''باندھ سہرا کر شادی'' دلچسپ رہا۔ انشاء جی جیسا برجستہ لکھاڑی، شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ علی عباس سے ملاقات پسند آئی۔ مگر جو خوشی اور سرپرائز نعیمہ ناز سلطان سے ملاقات کر کے ملا۔ وہ تو ناقابل بیان ہے بھئی۔ دو دفعہ پڑھ ڈالا۔ باقی گفتگو کا ابھی سے انتظار ہے۔ شاہین رشید ہمیشہ سلامت رہیں۔ آمین

''ہمارے نام'' دل کی ٹھنڈک جیسا سلسلہ۔ اپنے تبصرے نے ''شکر الحمدللہ'' ادا کروایا۔ ''شعاع'' میں جو پیارے لوگ نہیں تھے وہ ''خواتین'' میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔

راحت جبیں کے ''انگنا'' میں پھول ڈھونڈنے نکلے جلد ہی پھول کھلیں گے (عبید کے والدین کی طرف) مگر صد افسوس! ارم کے ساتھ غلط ہو رہا ہے۔ راحت پلیز! ارم کے ساتھ ایسا نہیں کریں۔

''اجارہ نشین'' کے نشینوں نے بہت ہنسایا۔ اس ماہ آسیہ رئیس نے اپنی مخصوص طرز تحریر سے ہٹ کر دلچسپ پیرائے میں لکھا۔ ''واعد'' کے عجیب و دلچسپ افکار پسند آئے تو ''بینا'' کی نرم دلی نے متاثر کیا۔ آسیہ رئیس پلیز آئندہ بھی ''مزاح'' تحریر فرمائیں۔

فرح بخاری کی ''سامنے والی کھڑکی'' نے بھی خوب انجوائے کروایا۔ شکریہ بھئی، ایک ماہ میں ہی دوسری پر مزاح تحریر۔ قسم سے دل شاد ہوا۔ ''دادا جان'' کے رنگینیوں بھرے گانے پسند آئے۔ اشعل بہت دلچسپ انسان اس کی کزنز میرج واپس اسی پر پڑ گئی۔ قہقہہ نکل گیا۔ البتہ رائیٹر نے کس قدر خوب صورتی اور ذہانت سے ساہ فیملی کو اشعل لوگوں سے ملوایا۔ ویل ڈن! پلیز تمام رائیٹرز سے گزارش ہے ہلکا پھلکا دلچسپ سا لکھا کریں۔

نعیمہ ناز ہمیں افسانوں کی نگری میں بھی مل گئیں۔ اپنی اچھی سی تحریر کے ذریعے اچھا سا ''راستہ'' دکھایا انہوں نے۔

شائلہ ولعباد کی ''اترن'' پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ طاہرہ کی بے بسی اور بے چارگی مزا ہی دے گئی۔

آسیہ ساجد علی کی پہلی ہی تحریر بہت اچھی لگی۔

''مستقل سلسلے'' ہمیشہ کی طرح جگمگاتے ہوئے سے پیارے لگے۔ خاتون کی ڈائری میں خود کو موجود پا کر سرپرائز ہی ملا۔ کیونکہ بھول گئی تھی کہ شرکت فرمائی ہے۔ (ہاہاہا) جزاک اللہ!

فرخندہ سلیم اور سائرہ سلمان کا انتخاب بہت بہت اچھا لگا۔ البتہ کبھی کسی نے سوچا یا محسوس کیا کہ پروین شاکر کی شاعری عرصہ دراز سے ہمارے ڈائجسٹوں میں نہیں آئی۔ ''موسم کے پکوان'' پسند آئے۔ البتہ ''لگن کی بوٹی'' کا نام دیکھ کر ہنوز ''سوچی'' پڑے ہیں کہ یہ نام آخر کس نے اور کیونکر رکھا ہوگا۔ میرا ذاتی سا خیال ہے کہ شاید اس وجہ سے کہ اس ریسپی کو ''لگن'' سے پکایا اور کھایا جائے۔ (ہاہاہا) آپ سب کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

''آپ کا باورچی خانہ'' نبیلہ گلزار کے ساتھ پسند آیا۔ نبیلہ کی ''لیمن کریم کباب'' اچھے تھے پر اس میں کریم تو ڈالی ہی نہیں ''نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'' کی طرف بڑھے۔ الجھنوں کی الجھنیں پسند آئیں مطلب جواب۔ ''بیوٹی بکس'' کے ٹوٹکے اچھے لگے اور آسان بھی۔ کاش کبھی ان پر عمل پیرا بھی ہو سکیں۔

ج: پیاری صدف! آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت مدلل اور دلچسپ ہوتا ہے۔ بہت شکریہ۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

خواتین ڈائجسٹ پہلی تاریخوں میں مل گیا۔ سارا گھول کر پی لیا سرورق والی بچی بالکل گھریلو لگی جیسے کہ بچیاں کسی فنکشن پر ہلکا پھلکا تیار ہوتی ہیں ماڈل والا ٹچ نہیں تھا بہت پسند آئی۔

پیاری باتیں تو ہوتی ہی پیاری ہیں انشاء جی کو پڑھ کر مسکراہٹ لبوں پر نہ آئے ہو ہی نہیں سکتا، علی عباس کو کئی دفعہ پڑھ چکے ہیں اب ازبر ہو گئے ہیں۔ نعیمہ ناز ویری گڈ واقعی ہلکا پھلکا لکھتی ہیں گھریلو قسم کی پیاری کہانیاں ہوتی ہیں نعیمہ ناز کی کہانی رزق زوال تو آج تک دل پر لکھا ہے۔

ہمارے نام اف یہ کیا لکھ دیا کہ آپ شامل نہ ہوں تو محفل سونی لگتی ہے۔ پڑھ کر پھول کر کپا ہو گئے۔ انگنا پھول کھلے ثانیہ، نہلے پہ دہلا ہیں ان کی نوک جھونک مزہ دیتی ہے۔ راستہ ہر گھر میں ایسی ہی بہو بیٹے ہیں، ماں باپ کو بوجھ سمجھنے والے، آسیہ نے اچھا کیا بے قدروں کی خدمت کرنے سے بہتر ہے کہ انسان اور راستہ چن لے۔

پھوپھو کی بہو سے اتنی توقعات ہی کیوں رکھی گئیں۔ اجارہ نشیں اچھی کہانی تھی، گئے تھے مکان خالی کروانے دلہن لے آئے اترن ٹھکرانے والی کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ سامنے والی کھڑکی تو بہت مزے کی کہانی تھی کزنوں سے جتنی چڑ تھی کزن ہی متھے لگی اشعل نام منفرد تھا بہنیں معنی بھی لکھ دیا کریں۔ پردیس شکر ہے روشن زندان سے نکل آئی ممشعل پر ترس آ رہا ہے۔

ج: پیاری زرینہ! ہمیں ہی نہیں، کسی ماہ آپ شامل نہ ہوں تو ہماری قارئین کو بھی آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا، بہت شکریہ۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

ہمیں موسم سرما بہت پسند ہے اور ہمارا اندازہ ہے کہ آپ کو بھی سردیاں پسند ہیں اندازہ درست ہے ناں۔

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا سو دوپٹہ سر پر نا سہی شولڈر پر ہی ہوتا تو مزید اچھا لگتا۔ حسب معمول کہی ان کہی میں محترم مدیرہ کی دانش مندانہ باتوں پر دل سے قائل ہوتے آگے بڑھے۔

انگنا پھول اب واقعی کھلنے والے ہیں، عبید کی آنکھیں جو پوری کھل گئی ہیں ثانیہ کی سازشوں کی کوئی حد نہیں، اب فرخ کی زندگی میں زہر گھول آئی۔ خیر جناب ثانیہ بی بی کے انگنا میں خزاں چھانے ہی والی ہے ویسے ہم بھی لگتا ہے ظالم ہو گئے ہیں۔ بھئی کیا کریں، ظالموں کے برے انجام کی ہی خواہش ہوتی ہے ناں۔

مالا کا سحر مکمل اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہے۔ ہم جوزارا سے بھی ہمدردی محسوس کر رہے تھے تو جناب کیا بات ہے ہماری پیاری رائٹر کی کہ ان کے قلم کی ذرا سی جنبش نے اس ہمدردی کو غصے میں تبدیل کر دیا۔ خواہشوں کے غلام لوگ کسی بھی رشتے میں مخلص نہیں ہو سکتے سوزارا بی بی تو دل سے ہی اتر گئیں۔

پردیس میں روشن نے کچھ ہمت کر ہی لی تھی تو کم از کم اپنے ہمدردوں کے مشورے پر بھی عمل کر لیتی۔ اپنے ہی دیس میں پردیسی والدین کے ظلم کا شکار ہے۔ ویسے اب لگتا ہے اجالا کے حالات اچھے ہو جائیں گے۔ سمیرا حمید چراغ سے کب ملوا رہی ہیں۔

فرزانہ کھرل کی تحریر کا بھی شدت سے انتظار ہے۔ سائرہ رضا بھی بھول ہی گئی ہیں کوئی جائے جا کر بتائے انہیں ہم یاد کرتے ہیں۔ ہاہا

احد ایک بار پھر سے چونکا دینے والے موڑ پر ہے۔ اسود نقلی احتل کے چکر سے نکل گیا اب اصل احتل کے سامنے آنے کا انتظار ہے۔ مومنہ نے بھی بالآخر درست رستے کی جانب قدم بڑھائے یہ گڈ ہو گیا۔ آسیہ رئیس خان ان رائٹرز میں ہیں جو آتے ہی چھا جانے کا ہنر رکھتی ہیں۔ اجارہ نشین ایک اور خوب صورت تحریر دل کو چھو گئی۔ ہیرو ہیروئن دل موہ لینے والے اور دادا ابا کا کردار بڑا زبردست لگا۔

مسکراتے سامنے والی کھڑکی کھولی اور بڑے ہی خوش گوار جھونکوں سے لطف اندوز کروایا۔ نعیمہ ناز کا مختصر افسانہ بہت اچھا لگا گو کہ آخری سطر پر آسیہ کی دلی کیفیت افسردہ کر گئی۔ حنا بشریٰ نے والدین کو ان کے غیر ضروری لاڈ پیار کے نقصانات کا احساس دلایا بھرپور داد ان کے لیے۔ احساس کی تاثیر اور قدر روانی کا سبق دیتی لبنیٰ آصف کی مختصر تحریر پھپھو کی بہو بھی خوب رہی۔ شمائلہ ذوالعباد کا ہلکا پھلکا مزاحیہ افسانہ مسکراہٹیں بکھیرنے کے ساتھ یہ سوچ بھی دے گیا۔ کیا چیزوں کے نام ان کا معیار اور دینے والے کا مقام دیکھ کر طے کیے جانے چاہئیں۔ اترن کو اترن ہی کہیں گے یا تحفہ؟ آسیہ ساجد کا انداز تحریر پختہ اور متاثر کن ہے لگا ہی نہیں کہ پہلی تحریر ہے، کیپ اٹ اپ آسیہ جی۔

نعیمہ ناز سے ملاقات بہت زبردست رہی ان کی تحریروں کی جان ان کے بزرگ کردار، اس پر بامحاورہ وسلیس اردو، سچ میں آسیہ رزاقی بہت یاد آتی ہیں، ہمیں اپنی تمام رائٹرز کے انٹرویو طویل ہی پسند ہیں اس لیے جاری ہے دیکھ کر شکر ادا کیا۔ اپنے پسندیدہ فنکار علی عباس کی باتیں اچھی لگیں۔ "باندھ سہرا کر شادی" لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر گیا۔

نبیلہ گلزار کا باورچی خانہ پسند آیا لیکن مختصر لگا۔

نفسیاتی الجھنیں میں عدنان بھیا نے بہترین مشورے اور مثال سے نوازا۔ اللہ ثمرہ بی بی کو درست فیصلے کی توفیق عطا فرمائے اور بہن عروبہ کے بیٹے کو شفا عطا فرمائے آمین۔

بہنوں کی محفل میں صدف اور فرخندہ سلیم کے تبصرے زبردست، مختصر تبصروں میں فرحانہ مہناز، ام ہادیہ، آسیہ ساجد کے تبصرے اچھے لگے۔ پیاری ریحانہ چودھری بے دھیانی میں آپ کا ذکر رہ جائے تو اور بات ہے لیکن آپ کو اور آپ کے تبصرے کو ہر بار مس کرتے ہیں، اللہ آپ کے بھائی کو شفائے کاملہ عطا فرمائے آمین۔ مجھے تو بلوچ سسٹرز۔ ثمینہ اکرم،

سے غیر حاضر ہیں اور عینا عمر بھی اس بار نہیں ہیں۔ حنا جاوید نے اپنے ابو کے حوالے سے جو بات بتائی اسے پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا، ہم سب کی زندگیوں میں بہت سے اگر بہت سے کاش رہ ہی جاتے ہیں۔ ادارے سے وابستہ ہر فرد کی خوشی اور غم اپنے ہی محسوس ہوتے ہیں واصفہ سہیل کے بہنوئی کی وفات پر دلی افسوس ہوا اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

ج: پیاری ہیدا! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ سردی ہمیں بہت پسند ہے خاص طور پر سرما کی خوب صورت راتیں۔ یہ الگ بات ہے اس کے کہ سردی میں ہمیں کھانسی کا مسئلہ رہتا ہے۔

تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا کرتی ہیں اور ہم ہر ماہ ہی آپ کے تبصرہ کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا ان شاء اللہ۔

اترن غیروں میں ہوتی ہے جس طرح بڑے بھائی کا سوئیٹر اور جیکٹ اچھی حالت میں ہو تو چھوٹی بہن یا بھائی کو پہنا دی جاتی ہے۔ اسی طرح پھوپھی اپنے بھائی کے بچوں کو کپڑے دے دیں تو ہمارے خیال میں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔

ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکاؤنٹ سے
ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030" کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/22000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس اپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

ادارہ

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

شبینہ فیروز ...... اسلام آباد

میری ساس کا دو سال قبل انتقال ہوا ہے وہ میرے ہی ساتھ رہتی تھیں میں نے ان کی خدمت اپنی ماں کی طرح کی۔ میرے شوہر اس بات کے گواہ ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں جواب ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔

مہینہ پہلے میری امی ایک کار حادثے میں زخمی ہو گئی تھیں۔ میرے بھائی کا گھر دوسری منزل پر ہے وہاں لفٹ کی بھی سہولت نہیں ہے۔ میں نے مجبوراً علاج کی غرض سے انہیں اپنے شوہر کی اجازت سے اپنے گھر بلا لیا۔ ان کی ٹانگ پر پلستر چڑھا ہے۔ میری دونوں نندوں کو اس بات کی بڑی تکلیف ہے کہ بھابی نے اپنی امی کو گھر رکھا ہے اور ان کے بھائی سے خدمتیں کروا رہی ہے، جبکہ اللہ گواہ ہے کہ میرے شوہر نے امی کا کوئی بھی کام نہیں کیا، ان کے سارے کام میں کرتی ہوں اور بھائی نے ایک ماسی الگ سے ان کے لیے رکھوائی ہے لیکن دونوں بہنیں جو کراچی میں رہتی ہیں، آئے دن فون کر کر کے مجھے ذہنی اذیت دیتی رہتی ہیں اور شوہر الگ ان کی باتوں سے چڑ جاتے ہیں۔

امی نے مجھ سے کہا ہے کہ تم میری فکر نہ کرو میں بیٹے کے پاس کسی طرح چلی جاؤں گی۔ پر میرا دل روتا ہے کیا میری ماں کا اتنا حق نہیں کہ بیٹی ان کے اس وقت میں ان کی خدمت کرے جبکہ میری ساس کی حالت تو کئی سالوں انتہائی بری رہی تھی پر وہ بہت اچھی خاتون تھیں، ان کی بیٹیاں نہ جانے کس بات کا بدلہ لے رہی ہیں، طعنے ملتے ہیں کہ میری ماں کو تو تم نے کمرے میں اکیلے قید کر رکھا تھا اور اپنی ماں کو عیاشیاں، میں کیا کروں بھی دل کرتا ہے کہ امی کو بھیج دوں پر ان سے زینے کیسے چڑھے جائیں گے میرے شوہر مجھے سمجھاتے ہیں کہ ان کی باتوں پر کان نہ دھرو پر ہم ماں بیٹی اور اب تو بچے بھی چڑچڑے ہو گئے ہیں، گھر کی فضا خراب ہو رہی ہے میں کیا کروں۔

ج: والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹی دونوں کا فرض ہے۔ بیوی چونکہ شوہر کی اجازت کی پابند ہوتی ہے۔ اس لیے عموماً ماں باپ کو رکھنا، ان کی خدمت کرنا بیٹے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال آپ پریشان نہ ہوں نہ ہی نندوں کی باتوں کی پروا کریں آپ کے شوہر آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ کافی ہے۔ آپ اپنی والدہ کو اپنے پاس رکھیں۔ آپ کی والدہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔

ایک دکھی بہن ...... سندھ

س: میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ شادی کے وقت میرے شوہر کا اچھا بھلا کاروبار چل رہا تھا ان کا پان گٹکے کا کام تھا گو مجھے اس پر اعتراض تھا لیکن گھر میں سب بہت اچھا چل رہا تھا۔ میرا پہلا بچہ ہوا تو ساس سسر خوش تھے کہ میرے آنے سے ان کے گھر میں لکشمی آ گئی ہے پھر اچانک کیا ہوا کہ پولیس کا چھاپا پڑا اور میرے شوہر مصیبت میں پڑ گئے۔ پہلے چھپتے پھرے پھر گھر بدلا، حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ میں دل سے ان سب لوگوں کو بددعا دیتی تھی جن کی وجہ سے میرے شوہر کا دھندا خراب ہوا۔ میں کس اذیت میں تھی۔ بتا نہیں سکتی پھر میرے

ساس سسر کے طعنے شروع ہو گئے کہ میں نحوست لے کر آئی ہوں۔ میرے قدم پڑتے ہی ان کے بیٹے کا کاروبار بیٹھ گیا۔

وہ پولیس سے بچ گئے اور کسی دکان پر سیلز مین لگے چند ہزار روپوں میں کیسے گھر کا گزارا ہوتا۔ میں روتی رہتی تھی ہمارے مالک مکان کے بھائی کے ساتھ مسئلہ ہو گیا۔ اس کو منہ کا کینسر ہو گیا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ اتنا جوان اور اسے کیا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے تو جواب دے دیا ہے۔ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ میرے شوہر پان گٹکے کا کام کرتے تھے اور ان کے پیچھے پولیس تھی۔

اس لڑکے کے بارے میں اس کی چھوٹی بہن نے بتایا کہ وہ ماوا اور گٹکا کھاتا تھا بچ پائیں میں رو پڑی جب پتا چلا کہ وہ میرے شوہر والا گٹکا کھاتا تھا۔ جسے بیچ کر ہمارے گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

میرا دل اب اس گھر میں نہیں لگتا جیسے بیزار ہو گیا ہے نہ بچے نہ شوہر اب ساس سسر کے طعنے بھی نہیں لگتے۔ وہ سب جانتے ہیں کہ میرا جی اس جوان کی موت کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ میں کیا کروں، دل سنبھلتا ہی نہیں۔ کیا میں طلاق لے لوں اور بچوں کو لے کر الگ ہو جاؤں نجانے میرے شوہر کے دھندے سے کتنی جانیں اذیت میں ہوں گی۔ اوپر والے سے بہت خوف آتا ہے۔ میرے شوہر مجھے بہت سمجھاتے ہیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں تو وہ یہ دھندا نہیں کریں گے اس پر ساس سسر ناراض بھی ہوتے ہیں پر میں کیا کروں۔ میرے میکے والے بھی غریب ہیں۔ کیا، کیا آپ کے پاس میرے مسئلے کا کوئی حل ہے۔

ج: اچھی بہن! آپ کا مسئلہ کافی گمبھیر ہے آپ کی پریشانی بالکل بجا ہے جس کے دل میں ذرا سی بھی انسانیت اور دردمندی ہو، وہ ان حالات میں کبھی بھی مطمئن اور خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ گھر چھوڑ دیتی ہیں تو ان لوگوں کا کیا بگڑے گا بلکہ الٹا وہ خوش ہو جائیں گے اور اطمینان سے بلا روک ٹوک گٹکے کا کام کرتے رہیں گے۔ دوسری لڑکی بھی مل جائے گی۔ مسئلہ آپ کے لیے ہو گا۔ وہ بچہ بھی آپ سے لے سکتے ہیں پھر آپ کے والدین کی غربت وہ آپ کا خرچ کیسے اٹھائیں گے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ آپ اسی گھر میں رہ کر کوئی ہنر سیکھیں۔ تاکہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ اور تب تک آپ کا بچہ بھی تھوڑا بڑا ہو جائے گا۔

آپ کے شوہر نے وعدہ کیا ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں تو وہ یہ کام چھوڑ دیں گے، آپ کی آمدنی سے انہیں سہارا مل سکتا ہے اور وہ یہ کام چھوڑ سکتے ہیں۔

ش۔ک ...... کوہاٹ

میں نویں جماعت میں پڑھتی ہوں آپ کے ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا بھی ایک مسئلہ ہے پلیز بتائیں میری ایک فرینڈ جو اسکول میں میرے ساتھ پڑھتی ہے مجھ سے ناراض ہو گئی ہے دراصل ہماری کلاس میں ایک نئی لڑکی نے داخلہ لیا ہے وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتی تھی میں نے اس سے چند دن ذرا بات کر لی کہ میری پیاری بچپن کی فرینڈ ناراض ہو گئی۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا دل چاہتا ہے کہ میں مر ہی جاؤں تب اسے میری محبت کا پتا چلے گا۔

ج۔ پیاری گڑیا! ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں۔ ابھی آپ کو بہت سارا پڑھنا ہے۔ بہت سے کام کرنے ہیں۔ دوست روٹھ گئی ہے تو مان جائے گی اگر نہیں مانتی تو یہ ایسی بڑی بات نہیں ہے جسے دل سے لگایا جائے۔ اور جینے مرنے کی باتیں کی جائیں۔ زندگی میں دوست ملتے بچھڑتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی کا حصہ ہے۔ ابھی آپ کو بہت دوست ملیں گے اور وہ دور بھی چلے جائیں گے۔ کیا ہر دوست کے لیے اسی طرح بیٹھ کر پریشان ہوں گی۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

ثمینہ فرقان......پشاور

س: موسم سرما کے لیے کوئی ماسک بتادیں۔ جس سے جلد نم رہے اور فریش نظر آئے۔

ج: سرد موسم میں جلد میلی اور داغ دار نظر آتی ہے اور چہرے پر برا اثر نمایاں ہوتا ہے لہٰذا چہرے کو صاف ستھرا اور دھبوں سے پاک رکھنے کے لیے کھیرے کا ماسک لگائیں۔

تھوڑا سا کھیرا لے کر پیس لیں، اب اس میں دہی ملائیں جتنا کھیرا ہے، اتنا ہی دہی ہونا چاہیے۔ اس آمیزے کو چہرے پر پندرہ منٹ لگائیں پھر ٹشو پیپر سے صاف کر کے نیم گرم پانی سے دھولیں۔

علیزہ......ملتان

س: میرے بال خشک ہیں اگر میں روزانہ شیمپو نہ کروں تو یہ اور بھی خراب ہوجاتے ہیں کچھ بال سفید بھی ہو گئے ہیں۔ کلر لگانے کی وجہ سے بال کمزور اور پتلے ہو گئے ہیں۔

ج: بالوں کی رنگت میں تبدیلی غذائیت کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے سب سے پہلے آپ بالوں کی صحت پر توجہ دیں۔ بے بی شیمپو استعمال کریں۔ بال دھونے سے قبل زیتون کا تیل بالوں میں لگائیں اور زیادہ توجہ بالوں کی جڑوں پر دیں۔ تولیہ کو گرم پانی میں ڈبو کر نچوڑ لیں پھر اسے گیلی حالت میں تیل لگے بالوں پر لپیٹ لیں۔ بیس منٹ تک اسی حالت میں رہیں۔ اس عمل سے بالوں میں تیل جذب ہوگا جب تک آپ کے بالوں کی صحت اچھی نہیں ہوجاتی بال رنگنے سے گریز کریں۔

جہاں آرا متین......کراچی

س: ایلوویرا کو سر اور چہرے پر کیسے استعمال کرسکتے ہیں۔ کیا گھر کے جیل میں بھی افادیت ہوتی ہے۔

ج: گھر میں موجود ایلوویرا کا پودا نہایت کار آمد ہے ایلوویرا کے پتے کو درمیان سے چیر کر چمچے کی مدد سے سارا جیل نکال لیں۔ گودے کو اچھی طرح میش کر کے سر پر مساج کریں آدھے گھنٹے بعد سادے پانی سے دھولیں۔

جلد کی حفاظت کے لیے آپ جیل میں جو کا آٹا ملالیں۔ بہترین باڈی اسکرب تیار ہے تازہ جیل کو دو دن سے زیادہ اسٹور نہ کریں۔

ثمن جہاں......صوابی

س: ہاتھوں کی خوب صورتی کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں لیکن ہاتھ کھردرے ہوجاتے ہیں؟ گھر کے کام بھی مجھے خود ہی کرنے ہوتے ہیں۔

ج: سب سے پہلے تو پانی کے کام کرتے وقت ربر کے دستانے پہنیں، کچن کے کام ختم ہوجائیں تو نکلنے سے پہلے ایک چائے کا چمچہ شہد اور ایک چائے کا چمچہ شکر لے کر ہاتھوں پر مساج کریں۔ اس عمل سے آپ کے ہاتھوں کے مردہ خلیات جھڑ جائیں گے اس کے بعد ہاتھ دھو کر ہینڈ لوشن لگالیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ زیتون کے گرم تیل سے رات کو سونے سے قبل مساج ضرور کریں۔

منیبہ مریم......لیہ

س: سردی کا موسم آتے ہی میری ایڑیاں پھٹنے لگتی ہیں۔ کوئی آسان نسخہ بتائیں۔ میں مہنگی کریم نہیں خرید سکتی۔

ج: ویزلین......ایک چمچہ

گلسرین......دو چمچے

بیکنگ پاؤڈر یا میٹھا سوڈا۔ ایک چمچہ۔

اس کا پیسٹ بنا کر شیشی میں محفوظ کرلیں۔ رات کو سونے سے پہلے پیروں کو اچھی طرح رگڑ کر دھوئیں پھر یہ کریم لگا کر سو جائیں۔ صبح اٹھ کر دھولیں۔ اس کو ہاتھوں پر بھی لگائیں ہاتھوں کا رنگ نکھر آئے گا۔

☆☆